حالی کی نظمیں

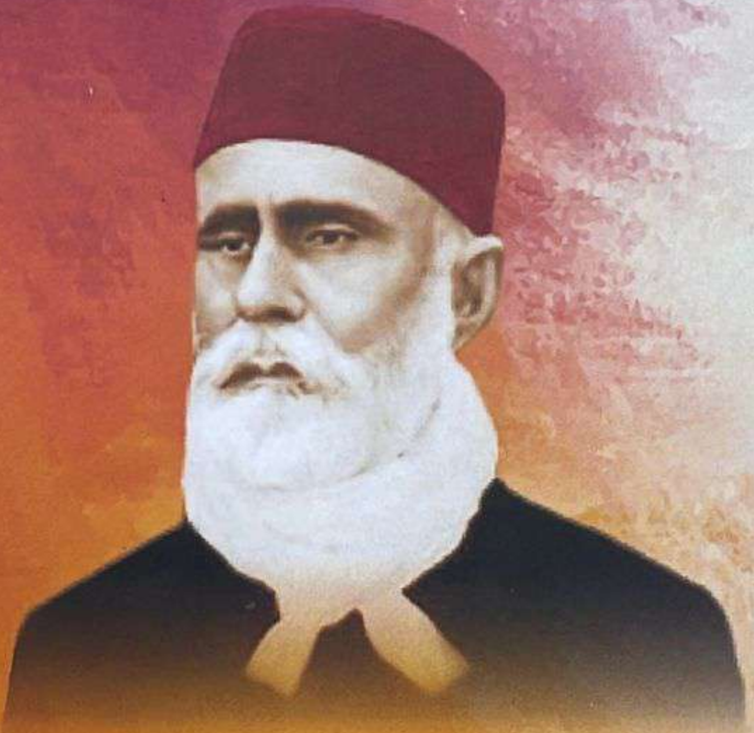

مرتب
سید تقی عابدی

حالی کی نظمیں

مرتب

سید تقی عابدی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2022
تعداد	:	550
قیمت	:	-/160 روپے
سلسلہ مطبوعات	:	2107

Hali Ki Nazmein
Compiled by: Syed Taqi Abdi

ISBN:978-93-91511-01-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای-میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے-کے-آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

افراد و اجتماع کی ترقی آ گہی اور معلومات سے مشروط ہے اور آ گہی کے تمام دروازے کتابوں کے ذریعے ہی کھلتے ہیں۔ کتابیں ہمیں روشنی کی ایک نئی دنیا سے روشناس کراتی ہیں اور ہمارے احساس و اظہار کو تحریک عطا کرتی ہیں۔ مگر صارفی معاشرت نے ہماری ترجیحات بدل دی ہیں۔ کتابوں سے ذہنوں کا رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی وجہ سے متبادل قرأت کی ایک نئی صورت جنم لے رہی ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں کی معنویت کم نہیں ہوئی بلکہ کتابیں ہمیشہ زندہ رہیں گی کیونکہ مطبوعہ کتابوں کے لمس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اسی بکس نے گوکہ قاری کا ایک نیا طبقہ پیدا کیا ہے مگر مطبوعہ کتابوں سے آج بھی دنیا کی بڑی آبادی کا رشتہ قائم ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ حسب سابق جاری و ساری ہے۔

علمی اور تہذیبی ورثے کا تحفظ ہمیشہ سے ایک اہم مسئلہ رہا ہے اور ہمارے ارباب نظر نے اس کے تحفظ کے لیے مختلف صورتیں بھی نکالی ہیں۔ قومی اردو کونسل بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس نے علمی اور تہذیبی وراثت کے تحفظ کے لیے مختلف علوم وفنون کی نہ صرف کتابیں شائع کی ہیں بلکہ 'ای کتاب'' کے ذریعے بھی اس کے تحفظ کی ایک نئی صورت نکالی ہے۔ قومی اردو کونسل نے

جہاں لسانیات، ادبیات، تکنیکی و سائنسی علوم، ریاضیات، شماریات اور دیگر علوم کی فرہنگ و اصطلاحات، کلاسیکی ادب پاروں، نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ قائم رکھا ہے وہیں ''ای کتاب'' اور'' ای لائبریری'' کے ذریعے اہم کتابوں کے تحفظ کی بھی کوشش کی ہے۔ کونسل نے ذولسانی (اردو اور انگریزی) ایپ ''ای کتاب'' تیار کیا ہے جس میں گلوبل لینگویج سپورٹ کے علاوہ انٹریکٹو فہرست کے ذریعے مطلوبہ باب تک رسائی اور الفاظ کے معانی دیکھنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ کونسل سے شائع شدہ اہم کتابیں اس کی ویب سائٹ (ای لائبریری) پر موجود ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کونسل کی اہم مطبوعات سے استفادہ کرسکیں۔ قومی اردو کونسل نے کم قیمت پر اردو زبان و ادب کا سرمایہ شائقین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور کونسل اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہے کہ اس کی کتابیں صرف برصغیر نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ کونسل ترجیحی طور پر ان کتابوں کی اشاعت کرتی ہے جس کے ذریعے ہم حیات و کائنات کے رموز و اسرار، آداب زندگی اور قرینہ اظہار سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔

یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اساتذہ اور طلبا کے علاوہ عام قارئین کے لیے بھی بے حد مفید ثابت ہوگی۔

شیخ عقیل احمد

ڈائرکٹر

فہرست

- عکس مولانا حالی ix
- عکس تحریر مولانا حالی x
- عکس مکتوب سرسید بنام مولانا حالی xi
- مکتوب سرسید احمد خان بنام مولانا حالی xiii
- شجرہ مولانا حالی xiv
- دیباچہ مجموعہ نظم حالی xv
- دیباچہ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی xix
- حالی کی کہانی حالی کی زبانی xxiii
- مولانا حالی کی حیات اور شخصیت xxix

باب اول: اخلاقی درسی اور مناظراتی نظمیں 1

- حالی کی نظمیں 1

i برکھارت 11

ii جواں مردی کا کام 15

	iii ’کلمۃ الحق‘ معروف بہ ’راست گوئی‘	16
	iv دولت اور وقت کا مناظرہ	18
	v مناظرہ رحم وانصاف	20
	vi حب وطن	23
	vii نشاط امید	26
	viii قوم کا متوسط طبقہ	28
	ix متوسط طبقہ (مزدور)	29
	x متوسط طبقہ (علم و ہنر)	29
	xi علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے؟	30
1	جواں مردی	31
2	برکھارت	34
3	نشاطِ امید	41
4	حب وطن	44
5	مناظرۂ رحم انصاف	54
6	تعصب وانصاف	60
7	کلمۃ الحق معروف بہ راست گوئی	69
8	مناظرہ واعظ وشاعر	74
9	پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ	81
10	دولت اور وقت کا مناظرہ	88
11	حقوق اولاد	90
12	ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے	105

باب دوم: حقوق زناں اور ہمدردی نسواں کی نظمیں 109

1 مناجات بیوہ 109

2 چپ کی داد 129

3 شکوہ ہند 136

باب سوم: تعلیمی اور اصلاحی نظمیں 145

1 مدرسۃ العلوم مسلماناں 145

2 ننگ خدمت 148

3 مسلمانوں کی تعلیم 157

4 قوم کا متوسط طبقہ 164

5 جشن قومی 169

6 صدائے گدایان قوم 172

7 حاضرین کانفرنس سے خطاب 172

8 علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے 173

9 شکریہ حضور نظام 174

10 شکریہ والی رام پور 174

11 گدایان قوم 177

12 تحفۃ الاخوان 181

13 فلسفہ ترقی 185

14 انجمن حمایت اسلام لاہور 190

15 ترغیب امداد یتیماں 193

باب چہارم: بچوں کی نظمیں (زمانہ تصنیف 1904 تا 1908) 201
● بچوں کی نظموں پر ایک نظر 201
1 خدا کی شان 215
2 بڑوں کا حکم مانو 216
3 مرغی اور اس کے بچے 217
4 بلی اور چوہا 218
5 شیر کا شکار 218
6 پیشے 219
7 گھڑیاں اور گھنٹے 223
8 دھان بونا 225
9 روٹی کیوں کر میسر آتی ہے 225
10 موچی 229
11 چٹھی رساں 230
12 سپاہی 231
13 ایک چھوٹی بچی کے خصائل 231
14 نیک بنو اور نیکی پھیلاؤ 233

باب پنجم تراجم 237
● زمزمۂ قیصری کا مختصر تعارف 237
1 زمزمہ قیصری 243
2 انگریزی اشعار کا ترجمہ 255
3 ناقدری 255
4 واقعہ ہجرت 255

عکس مولانا حالی

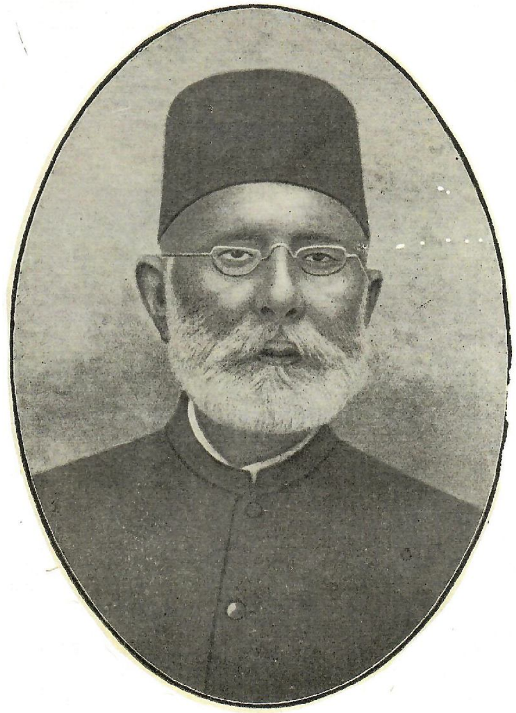

مولانا الطاف حسین حالی

(1837-1914)

عکس تحریر مولانا حالی

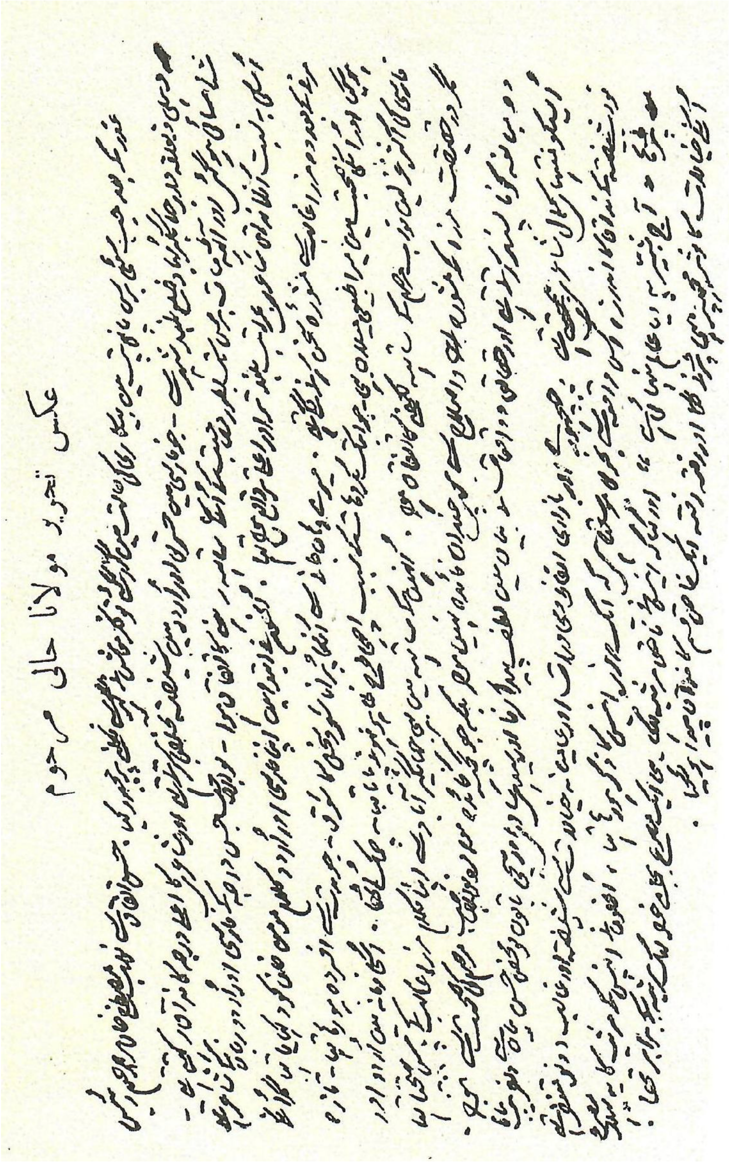

عکس مکتوب سرسید بنام مولانا حالی

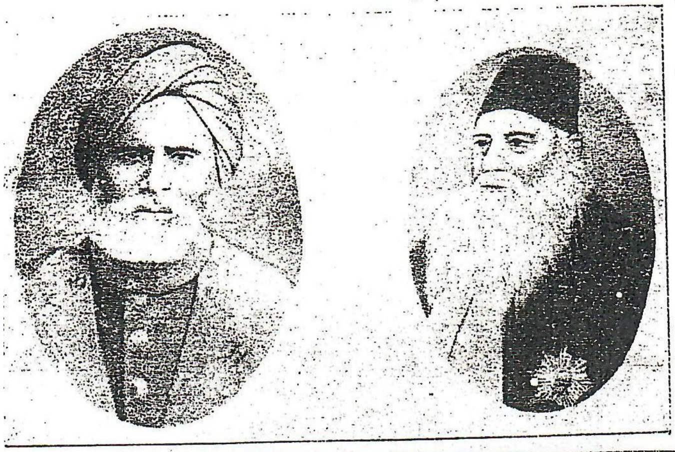

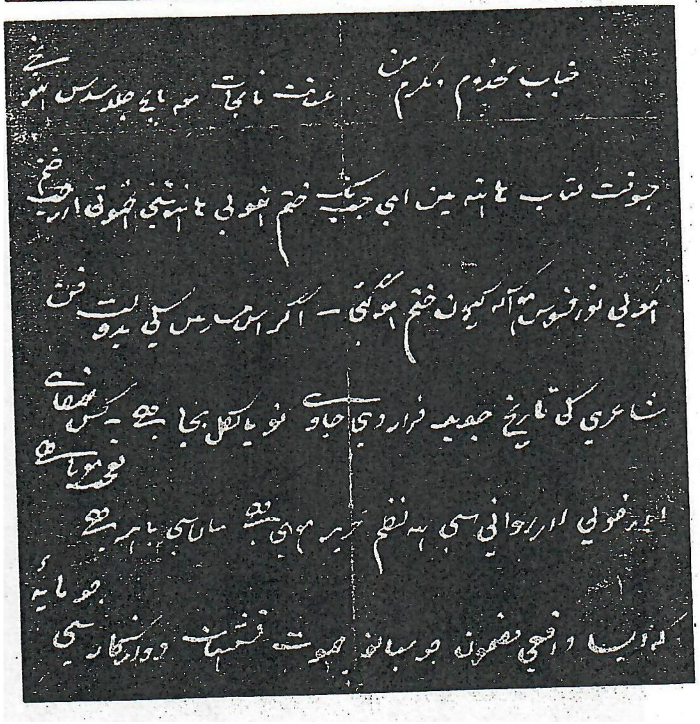

جناب مخدوم مکرم من عنایت نامہ آیا مع ایک جلد مسدس پہنچی

جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہیں چھوٹی اور جب ختم

ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی — اگر اس مسدس کی بدولت فن

شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی

اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے

تعجب ہوتا ہے

کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ تشبیہات دور از کار سے جو مایہ

عکس مکتوب سرسید بنام مولانا حالی

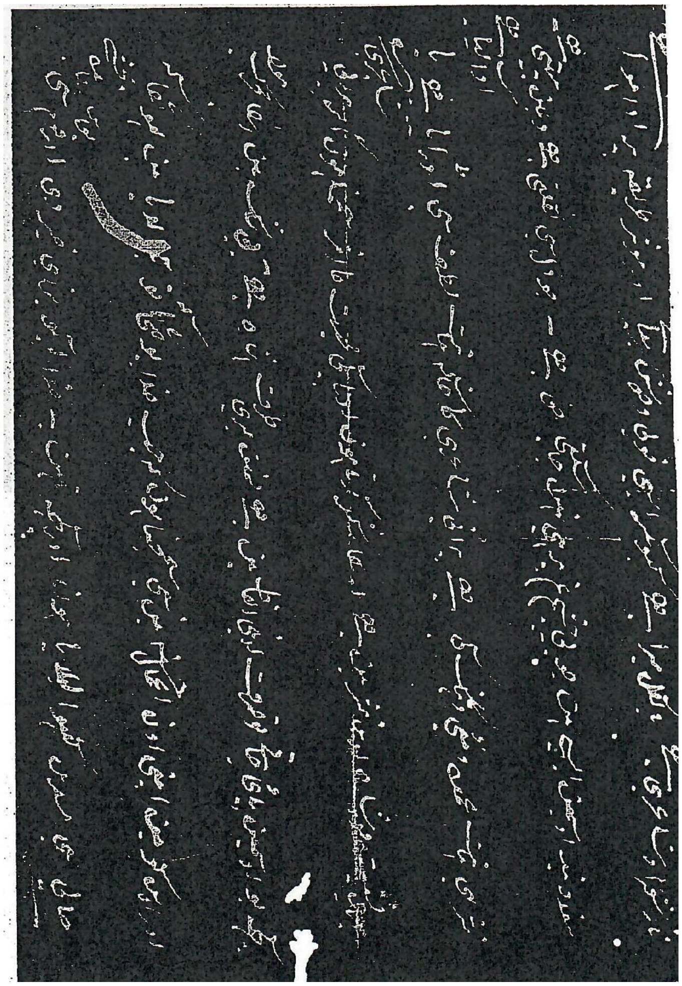

سر سید احمد خان کا خط حالی کے نام

جناب مخدوم و مکرمِ من !

عنایت نامجات بمع پانچ جلد مسدس پہنچے - جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی ، جب تک ختم نہ ہو لی ، ہاتھ سے نہ چھوٹی - اور جب ختم ہو لی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی اگر اس مسدس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے - کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے ، بیان سے باہر ہے - تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ ، جھوٹ ، تشبیہاتِ دور از کار سے ، جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے ، بالکل مبّرا ہے ، کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور مؤثر طریقے پر ادا ہوا ہے - متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشمِ نم پڑھے نہیں جا سکتے - حق ہے ، جو دل سے نکلتی ، دل میں بیٹھتی ہے - (دیباچے کی) نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے - (نظم میں) پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے - میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں - اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس (کتاب) میں پائی جاتی ہے تو صرف اُنھی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے - بے شک میں اس (نظم) کا محرّک ہوا اور اُس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا ؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں ، اور کچھ نہیں - خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے - مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں - آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے - نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے - یہ بھی لکھیے کہ بعدِ تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب تک موجود ہیں . . . '-

آپ کے اس خیال کا کہ (کتاب کا) حقِ تصنیف مدرستہ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرا دی جاوے ، میں دل سے شکر کرتا ہوں - مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو ، جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے ، کسی قید سے مقیّد کیا جاوے - جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں ، قوال درگاہوں میں گاویں ، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں ، اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی - میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشرافِ (دہلی جمع) ہوں اور رنڈیاں نچواؤں ، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں - میں اس کل مسدس کو "تہذیب الاخلاق" میں چھاپوں گا - میرے اُن استفسار کا جواب ، جن پر نشان درج کر دیا ہے ، بہت جلد مرحمت ہو -

والسلام

خاکسار ، آپ کا اجسانمند تابعدار ، سید احمد

شملہ :- پارک ہوٹل ، ۱۰ جون ۱۸۷۹ء

شجرہ مولانا حالی

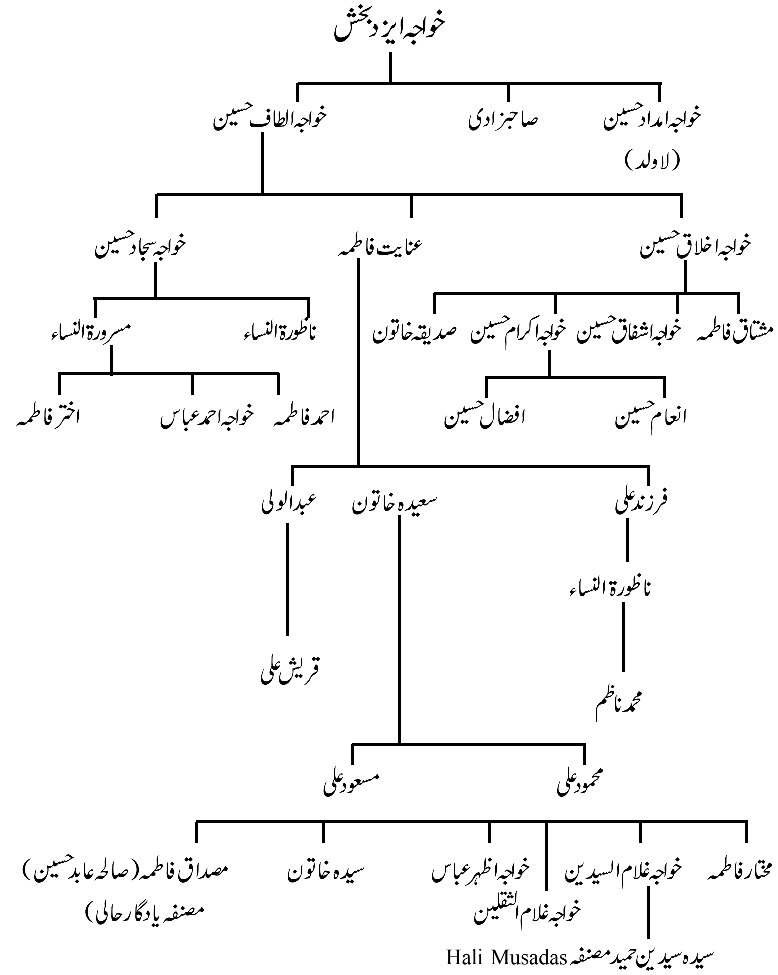

اس شجرے کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے دونوں بیٹوں خواجہ امداد حسین اور خواجہ سجاد حسین کی اولاد نے اردو کو عمدہ ادیب نقاد افسانہ نگار اور ماہرین تعلیم دیے۔ خواجہ اخلاق حسین کے نواسے نواسی خواجہ غلام السیدین مصنف آندھی میں چراغ، صالحہ عابد حسین مصنفہ یادگار حالی، خواجہ غلام السیدین کی بیٹی سیدہ سیدین حمید اور خواجہ سجاد حسین کی بیٹی کے بیٹے خواجہ احمد عباس ہماری ادعا کا ثبوت ہیں۔[1]

دیباچہ مجموعہ نظم حالی

1874 میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو، وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق وواقعات پر رکھی جائے۔ یہ تحریک اگر پندرہ برس پہلے کی جاتی تو شاید اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہ ہوتا، کیونکہ جو لوگ ہندوستان میں اردو نظم پر تھوڑی یا بہت قدرت رکھتے تھے وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے اور مبالغے کو شعر کے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ وہ واقعہ نگاری اور تصویر حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔ انھوں نے مغربی انشا پردازی کا کوئی نمونہ بھی اپنی زبان میں نہیں دیکھا تھا جس پر وہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھنے کے قابل ہوتے۔ لیکن یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت ہوئی جبکہ اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جا رہی تھی۔ لٹریچر میں بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے۔ دیسی اخباروں میں بھی جن میں سے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار خصوصیت کے

ساتھ ذکر کے قابل ہے؛ میں انگریزی آرٹکلوں کے ترجمے ہونے لگے تھے۔ ان اسباب سے مغربی طرزِ تحریر اور مغربی طرزِ بیان آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ 1872 میں سرسید احمد خاں نے پرچہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس کے سبب سے ان مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے، بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔ اردو فارسی انشا پردازی کا قدیم طریقہ ان کی نظر میں نہایت سخیف اور سبک معلوم ہونے لگا اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اگرچہ مغربی شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ اس وقت اُردو زبان میں موجود نہ تھا اور نہ اب تک موجود ہے۔ لیکن وہ جو مشہور ہے کہ 'دیوانہ را ہوئے بس است' جدت پسند طبیعتوں پر جس قدر مغربی انشا پردازی کی لے اب تک کھلی تھی، وہی ان کو لے اڑی۔ بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہن مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا، اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ اگرچہ یہ صحبت مدت تک جمی رہی لیکن راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بہ سبب ناموافقت آب و ہوا کے لاہور سے تبدیل ہوکر دہلی چلا آیا۔ مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغے سے اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عائد ہو۔

چار مثنویاں جو اس مجموعے میں سب سے اوّل درج کی گئی ہیں یعنی برکھا رت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف، اسی مشاعرے کی نظمیں ہیں جو مشاعروں کی ترتیب کے موافق اس کتاب میں داخل کی گئی ہیں۔ ان کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو مشاعرہ مذکور سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ محض بہ تقاضائے وقت و مقتضائے طبیعت یا بہ تحریک بعض اکابر قوم وقتاً بعدَ وقتٍ و حیناً بعدَ حِین ترتیب پاکر ان میں سے چند عام طور پر شائع ہوگئی ہیں، اور چند بالکل شائع نہیں ہوئیں اور کچھ اخباروں وغیرہ کے ذریعے سے بعض احباب پبلک کی نذر کی ہیں۔

میرے اکثر دوست مدت سے متقاضی تھے کہ تمام ہفوات ایک جگہ جمع کر کے نکتہ نواز دوستوں سے داداورنکتہ گیر یاروں سے اپنے کلام کی اصلاح میں امدادلوں۔لیکن جونظمیں عام طور پر شائع ہورہی ہیں جیسے مدو جزر اسلام، مناجات بیوہ، حقوق اولاد، شکوۂ ہند وغیرہ کواس مجموعے میں داخل کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی اور دیوان غزلیات وقطعات ورباعیات وغیرہ میں ابھی کچھ اور بڑھانا باقی ہے، اس لیے ان کو چھوڑ کر باقی اکثر نظمیں جو 1874 سے اب تک لکھی گئی ہیں، سب ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں۔

میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے، معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں ہوسکا اوران صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔اس پر عمارت چننی اوراس کوایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہاراورمبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ام ۔۔۔ بو کہ بعد از ماشود ایں تخم نخل بار دار

مولانا حالی

دیباچہ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی

تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک ہندوستان کے مسلمان بالطبع فارسی زبان میں نظم ونثر لکھنے اور خط و کتابت کرنے کے عادی تھے۔ جس شخص کو ادب سے مناسبت ہوتی تھی وہ اکثر فارسی زبان کی شاعری اور انشا پردازی میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ اس کا سبب کچھ تو اسلاف کے طریقے کی پیروی کا خیال ہوتا تھا جو عموماً فارسی زبان میں تصنیف وتالیف کرتے تھے اور کچھ یہ وجہ تھی کہ اردو جوان کی مادری زبان تھی زیادہ تر بول چال میں اور کسی قدر شعروسخن میں محدود تھی اور ہر شخص کا یہ کام نہ تھا کہ پہلے ہی پہل شارع عام کے خلاف ہر قسم کی تحریروں میں اردو زبان کو استعمال کر سکے۔ بڑے بڑے ذی علم اور لائق اصحاب اردو زبان میں خط و کتابت کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ اردو زبان کے قواعد تک فارسی ہی میں لکھے گئے اور اردو کے شاعروں کا تذکرہ بھی فارسی ہی میں قلم بند کیا گیا۔

ایک اور وجہ اردو زبان کا رواج نہ ہونے کی یہ تھی کہ اہل علم اور لائق اشخاص اردو میں تصنیف وتالیف یا خط و کتابت کرنے کو اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ مذہبی اور علمی کتابیں اکثر عربی زبان میں اور کبھی کبھی فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ زمانے کے انقلاب سے وہ میلان کم ہونا شروع ہوا اور آخر کار یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ دونوں زبانوں میں تصنیف وتالیف

کرنا یا نظم و نثر لکھنا موقوف ہی نہیں ہوا بلکہ بمقابلہ اردو زبان کے محض فضول سمجھا جانے لگا۔ عربی علم ادب تو بہت دن پہلے سے ملک سے رخصت ہو چکا تھا مگر غالب مرحوم اور ان کے معاصرین کے بعد فارسی شاعری اور انشا پردازی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

مذکورہ بالا انقلاب سے تقریباً سولہ سترہ برس پہلے راقم کو فارسی نظم و نثر لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن ایک عرصے تک وہ خیال میلان طبع کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ حسن اتفاق سے 1863 میں میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم و مغفور، رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں، جو کہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، ہو گیا اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ جناب ممدوح کا قیام 1857 کے بعد سے جہانگیر آباد میں رہنے لگا تھا، جہاں مخاطب صحیح کم یاب تھا، اس لیے وہ فکر شعر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ لیکن جب راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب ممدوح کا شوق از سر نو تازہ ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت تک مجھ کو فارسی یا اردو میں فکر شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا، مگر جناب ممدوح کو ادھر متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی۔

فارسی یا اردو کی جس زمین میں وہ غزل لکھتے، مجھے بھی اپنے ساتھ شریک فرماتے۔ انہی دنوں میں تنہائی اور قلت مشاغل کے سبب عربی ادب کی ہوس دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اگرچہ علم ادب کسی استاد سے باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اور نہ کسی ادیب سے صلاح لینے کا موقع ملا تھا، مگر چونکہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی، کبھی کبھی ڈکشنریوں کی مدد سے ادب کی آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا۔ شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ عربی نظم و نثر پر خود رو مبتدیوں کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوئی۔ غرض کہ فارسی اور اردو کے ساتھ عربی نظم و نثر میں بھی حیناً فحیناً خامہ فرسائی کرتا رہا۔ آخر وہ زمانہ آ پہنچا کہ فارسی اور عربی کے مخاطب صحیح ملک میں نایاب ہو گئے اور دونوں زبانیں ہندوستان کی مردہ زبانوں میں شامل ہونے کے قابل ہو گئیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جو نظم یا نثر لکھی جاتی ہے، گو کہ وہ کیسی ہی بے عیب ہو، اہل زبان کی نظر میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، الّا ماشاء اللہ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اہل وطن کے نزدیک قبولیت کا درجہ حاصل کر لے۔ لیکن جب اہل وطن کسی ملکی

انقلاب کے سبب اس غیر زبان سے بے گانہ محض ہو جائیں اور اس کی جگہ ملک میں دوسری زبان قائم ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کی شاعری اور انشا پردازی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جاتا ہے۔

یہی حال آج کل ہندوستان میں فارسی اور عربی لٹریچر کا ہے۔ دونوں زبانوں کی نظم و نثر کے مسودے جو کبھی کبھی کے لکھے ہوئے پڑے تھے، ان کی نسبت متردد تھا کہ ان کو کیا کیا جائے۔ قوم میں کوئی ایسی محفوظ لائبریری نظر نہ آتی تھی جہاں افراد قوم کے ورکس (Works) اچھے یا برے، احتیاط کے ساتھ رکھے جائیں۔ پھر اہل وطن کا ان دونوں زبانوں سے عموماً نا آشنا ہونا اپنے اس قدیم شعر کا مضمون یاد دلاتا ہے۔

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا　　　یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

لیکن مذکورہ بالا مسودات، کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑی کاوش سے لکھے گئے تھے، اور زیادہ تر اس خیال سے کہ قومی خصوصیات کی یادگار تھے، ان کو رائیگاں کھونا گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ تمام پرچے جس قدر بہم پہنچ سکے ادھر اُدھر سے فراہم کیے گئے اور ذیل کی ترتیب کے ساتھ اس مجموعے میں جو 'کلیات نظم' اردو کے آخر میں بطور ضمیمے کے ملحق کیا جائے گا، داخل کر دیے گئے۔ یعنی اول نظم فارسی، اس کے بعد نثر فارسی، پھر نظم عربی، اس کے بعد نثر عربی۔

یہ ضمیمہ اگرچہ کم و بیش فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر مشتمل ہے، مگر عربی کلام اس قدر قلیل ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر اس میں ایک قصیدہ حضرت مولانا ومقتدانا شاہ عبدالغنی النقشبندی المجددی قدس سرہ کی شان میں نہ ہوتا، جو تقریباً 1283 ہجری (1866۔ مرتب) میں مدینہ منورہ بھیجا گیا تھا اور جس کی نسبت جناب ممدوح نے بعض ادبائے مدینہ کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا، تو راقم کو ہرگز یہ جرأت نہ ہوتی کہ اپنا عربی کلام اس ضمیمے میں داخل کرنے کی مبادرت کرتا۔

مولانا حالی

حالی کی کہانی حالی کی زبانی

(جو نواب عماد الملک بہادر مولوی حسین صاحب بلگرامی کی فرمائش سے لکھی گئی)

میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837 میں بمقام قصبہ پانی پت شاہ جہان آباد سے جانب شمال 53 میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے؛ میں واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے؛ آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جن کا سلسلہ نسب 26 واسطوں سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور 18 واسطوں سے شیخ الاسلام تک اور 10 واسطوں سے ملک محمود شاہ انجو لقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا، پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین بلبن اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علما و شعرا و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدر دان تھا اس لیے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور

سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا وصدارت وتشخیص رخ بازار اور تولیت ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کردی۔ پانی پت میں جواب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہداپور کے نام سے مشہور ہیں؛ کی بیٹی تھیں۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناں شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ پھر عربی کا شوق ہوگیا۔ انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے ان سے صرف ونحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر 17 برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت

لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے کہتے تھے۔ دہلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں کے مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دہلی میں شرح مسلم، ملاحسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چارنا چار مجھ کو دہلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر 1855 کا ہے۔ دہلی سے آکر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856 میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1857 میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے (پانی پت میں) بے کاری کی حالت میں گذرے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہوا جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانہ میں میرا دہلی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو

فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دہلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی وتعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے۔ اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خان کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر وسخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ واصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص مذاق پیدا ہو گیا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت

درست کرنے کو مجھے ملتی تھی تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں رہ کر نیل ہالرائیڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی 1874 میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر۔ تیسری رحم وانصاف پر اور چوتھی وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلوعربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی، لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی وتنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چنانچہ میں نے اول مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً 1867 میں ایک کتاب تریاق مسموم ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا، لکھی تھی جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النسا لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار

سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلّی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم ونثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیات سعدی ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں پھر شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم ونثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے یادگار غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی اور اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم حیات جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ میں نے لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب اخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم ونثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے 1898 میں لکھا تھا اور اردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریا کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

1305ھ میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے لیے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امدادِ مصنفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور 1309ھ میں جب کہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا۔ اس وظیفہ میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکّہ حال کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

مولانا حالی

مولانا حالی کی حیات اور شخصیت

نام: خواجہ الطاف حسین
تخلص: حالی۔ (بعض افراد نے لکھا کہ آغاز شاعری میں حالی خستہ تخلص کرتے تھے جو صحیح نہیں)
تاریخ ولادت: بقول حالی "میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837 میں ہوئی۔" (1253 ہجری سال اپریل 1837 سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ حالی اپریل اور دسمبر 1837 کے درمیان پیدا ہوئے۔)

نوٹ: تذکرۂ حالی میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالی کی تاریخ ولادت 1253ھ مطابق 1836 لکھی ہے جو صحیح نہیں۔

مقام ولادت: پانی پت ضلع کرنال
والد: خواجہ ایزد بخش متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انگریز سرکار کے پرمٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے اس وقت حالی صرف نو سال کے تھے۔
والدہ: حالی بچپن ہی سے والدہ کی توجہ تربیت اور محبت سے محروم رہے حالی کی ولادت کے فوری بعد ان کی والدہ کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا چنانچہ ان کی تربیت اور پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔
دادا: خواجہ بوعلی بخش
پردادا: خواجہ محمد بخش

جد: خواجہ ملک علی جو ہرات کے بادشاہ میرک علی کے بیٹے تھے اور غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں ہندوستان آئے۔ بلبن نے ان کے علم وفضل وکمال سے متاثر ہوکر کرنال کے قصبہ پانی پت میں جاگیر عطا کی اور یہ خاندان 1276 ہجری سے پانی پت میں مقیم ہوگیا۔

خاندان

حالی کا شجرہ دادھیال سے بیالیسویں پشت میں حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے اور نانھیال سے چھتیسویں پشت میں حضور اکرمؐ سے جا ملتا ہے اِسی بنا پر صالحہ عابد حسین نے لکھا کہ حالی کی ماں سیدانی تھی۔ حالی لکھتے ہیں میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں؛ بیٹی تھیں۔

بھائی بہن

حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امتہ الحسین اور وجہہ النسا تھیں۔ چونکہ حالی سب سے چھوٹے تھے اور ان کی ماں ذہنی توازن کھو چکی تھیں اس لیے بڑے بھائی اور دونوں بڑی بہنوں نے حالی کی تربیت اور دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی۔ بقول حالی ''میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا۔ میرے والد نے انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا۔''

تعلیم

ا بقول حالی: ''میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انھوں نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔''

صالحہ عابد حسین 'یادگار حالی' میں لکھتی ہیں۔ ''پرانے زمانے کے دستور کے موافق ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللہ ہوئی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جید قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ ان کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چنانچہ انھوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ وہ بچپن سے قرآن شریف اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے کہ بڑے بڑے قاری اور عالم تعریف کرتے تھے۔

ب سید جعفر علی سے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے حالی نے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے دلچسپی ہوگئی۔ یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ حالی کے مزاج میں جو فطری شاعری کی اپج تھی اسے ابھرنے کا موقع بھی ملا۔

ج حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف ونحو پڑھی جو لکھنؤ سے تحصیل علم کے بعد پانی پت میں مقیم تھے۔

د دلّی پہنچ کر جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور مولوی نوازش علی سے کچھ کتابیں صرف ونحو اور منطق کی پڑھیں۔

دلی ہی میں شرح مسلم، ملاحسن اور میبذی پڑھنا شروع کیا۔

ہ دلّی میں ڈیڑھ سال رہ کر پانی پت واپس ہوئے اور مولوی عبدالرحمن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی سے بغیر کسی خاص ترتیب اور نظام کے منطق، فلسفہ کبھی حدیث اور تفسیر پڑھتے رہے۔ حالی لکھتے ہیں: ''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر 17 برس کی تھی۔ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلّی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس وہاں رہ کر عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چارناچار مجھ کو دلّی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ دلّی سے آکر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856 میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1858 میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا تو میں پانی پت واپس چلا آیا اور قریب چار برس کے بیکاری کی حالت میں گزرے۔ یہاں علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔

دلّی کالج سے بے زاری

جس وقت حالی دلّی گئے اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا لیکن اس ڈیڑھ سال کی مدت میں حالی نے کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کالج کے طلبا سے ملاقات کی جن میں محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال ڈپٹی نظیر احمد اور ذکاء اللہ وغیرہ جیسے طالب علم موجود تھے جس کی وجہ سے حالی کا پانی پت کا ماحول اور ان کی محدود سوسائٹی تھی جہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر ہی منحصر سمجھا جاتا تھا۔

انگریزی تعلیم کو صرف سرکاری نوکری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اسی لیے یہ افراد انگریزی مدرسوں کو جاہلوں کے مدرسے یا مچھلے کہتے تھے۔

تلاش علم

صالحہ عابد حسین کہتی ہیں:

’’حالی کی شادی تو ہوگئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا باران کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ دلّی جا کر جو اس اجڑی حالت میں علوم وفنون کا مرکز تھی؛ تحصیل علم کریں۔ دلّی اگرچہ پانی پت سے صرف 55 میل ہی ہے۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے انھیں دلّی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب ان کی بیوی میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی سامان کے پا پیادہ دلّی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی اور بیل گاڑی میں کچھ مسافت طے کی ہو۔ علم کا یہ سچا شیدائی جب دلّی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا۔ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اس زمانے کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔‘‘ 2ے

راقم کی نظر میں سچ بات یہ بھی ہے کہ ہم صرف سکّے کے ایک رخ یعنی علم کی طلب اور اس کے حاصل کرنے کی قربانیوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن سکّے کے دوسرے رخ پر ایک تازہ شادی شدہ دلہن کے احساسات جذبات اور دنیا بھر کے تشویش ناک خیالات کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جائے؟ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ حالی اپنے اس عمل سے شرمندہ تھے جس کا نتیجہ ان کی تخلیقات میں آگے چل کر عورتوں کی کسمپرسی اور حقوق پر بیوہ کی مناجات اور چپ کی داد جیسی نظمیں اور ساری عمر اپنی بیوی کی تعریف اور توقیر رہی ہو۔

شریک حیات

بقول حالی: ''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر 17 برس کی تھی۔''

خواجہ امداد حسین نے ماموں کی بیٹی اسلام النسا سے شادی کر دی۔ صالحہ عابد حسین نے جو خود حالی کے خاندان کی فرد ہیں خاندان کے بزرگوں کے بیانات اور خواجہ غلام السبطین مرحوم کی غیر مطبوعہ ڈائری کے حوالے سے حالی اور ان کی بیوی کے حالات یادگار حالی میں جمع کیے ہیں۔ ہم کچھ مستند واقعات کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ دونوں کے حسن اخلاق پر روشنی پڑتی ہے اور انہی واقعات سے حالی کے معاملات کی صفائی بھی ہو جاتی ہے کیونکہ حالی حقوق نسواں کے حامی تھے اور یہ حمایت گھر سے شروع ہوتی ہے۔

بی اسلام النسا بڑی باسلیقہ، منظّم، ہمدرد، فیاض اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ تقریباً نصف صدی کی مشترک زندگی میں حالی کی اور ان کی کبھی اَن بن نہیں ہوئی۔ انھوں نے کبھی اپنے شوہر کی علمی اور قومی زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں لیکن پھر بڑی جلدی پشیمان بھی ہو جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے حالی کا مزاج اتنا ہی نرم واقع ہوا تھا۔ اس لیے کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

واقعہ

خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حالی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین

کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حالی کی یہ بات سخت ناگوار گزری (واضح رہے کہ حالی سنی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی رواداری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامل ہوتی تھیں) اتفاق سے تانگا الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انھوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر برا بھلا کہا کہ نبیؐ کے نواسے پر تو قیامت کا وقت پڑ رہا ہے، ان کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تانگا الٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گزری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالی نے صرف اتنا کہا:

> ''سیدانی غصے میں ہے اور حق پر۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے، وہ جو کہتی ہیں بجا ہے۔''[3]

خواجہ سجاد حسین کی بیوی، ان کے ماموں کی بیٹی تھیں اور وہ بھی اپنی پھوپی اور باپ کی طرح تیز مزاج تھیں اور ساس بہو میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ حالی اوپر کے کمرے میں بیٹھے لکھتے ہوتے اور یہ ساری باتیں سنتے مگر ایک لفظ نہ بولتے۔ بیوی کا بہت خیال کرتے تھے اور بہو کو بھی بہت چاہتے تھے، اکثر ان ہی جھگڑوں میں شام ہو جاتی تو وہ اپنا کام ختم کر کے اٹھتے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مسکراتے ہوئے شیریں لہجے میں جھک کر کہتے:

> ''بس بی بس... اب تو شام بھی ہوگئی۔ اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا جسے پانی پت میں تغاری کہتے تھے) کے نیچے دبا دو۔ اس وقت تو بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں۔''[4]

کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے اور اپنے اپنے فرائض پوری ذمے داری سے ادا کرتے تھے۔ دونوں کی زندگی کے دھارے الگ الگ تھے لیکن کہیں نہ کہیں آ کر مل بھی جاتے تھے۔

بی اسلام النسا کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں جو چاہیں کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی، جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اٹھا سکتی تھی، نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے بھی بھر دستبردار نہ ہوتی تھیں اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔[5]

شادی بیاہ، نسبت ناتے اور ہر قسم کے اہم کام جو اولاد اور اولاد کی اولاد سے متعلق ہوتے، ان میں حالی کی رائے سے زیادہ ان کی بیوی کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ حالی کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتے اور پھر اس کے بارے میں الٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ ان کے ذاتی خرچ کے لیے زیادہ تر خواجہ سجاد حسین ان کو کچھ روپے بھیج دیتے تھے۔[6]

حالی نجی خطوں میں اکثر اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ان کا کس قدر پاس تھا بیٹوں، بھتیجوں، پوتیوں وغیرہ کو ان کی طرف سے خاص طور پر سلام و پیام، دعا پیار اور ان کی صحت کا حال لکھتے اور ان کو باقاعدہ خط لکھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح ان کا ذکر ضرور آتا ہے۔ ان کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے بدلے میں حالی اور خواجہ سجاد حسین ایک دکان لینا چاہتے تھے۔ مگر یہ تجویز مولانا کی بیوی کو پسند نہ تھی۔ اس بارے میں انھوں نے کئی خطوں میں بیٹے کو لکھا کہ بغیر ان کی مرضی کے دکان نہیں لینی چاہیے۔ ''اگرچہ مناسب تو یہی تھا مگر مستورات کی بغیر مرضی کے تبادلہ نہیں ہوسکتا، خصوصاً تمہاری والدہ اس کے بہت خلاف ہیں۔''[7]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''تمھاری والدہ اب اچھی ہیں اور کمزوری کے باوجود گھر کا سارا کام کاج کیے جاتی ہیں۔''

تمھاری والدہ نے باوجود کمزوری کے سب روزے رکھے اور باوجود اس کے سارا کام اگلے اور پچھلے کو خود کرتی رہیں۔ 1900 میں بی اسلام النسا کا ہیضے سے انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال پر مولانا حالی نے خواجہ سجاد حسین کو جو اطلاعی اور تعزیتی خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی بیوی کی کتنی قدر تھی:

> ''پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا (ہیضے کا) اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہ رَاجِعُون۔ اگرچہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے، اس کا بیان کرنا مشکل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے

گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمھاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضلہٖ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثنا خوان اور شکر گزار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔ انھوں نے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ آخر وقت میں جب تک ان کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد ان کے وِرِدِ زبان رہی۔ جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اس سے زیادہ کون خوش نصیب ہوسکتا ہے۔''[8]

حالی کا ضبط دیکھیے کہ ذکر محض مرحومہ کی خوبیوں کا ہے۔ اپنے رنج وغم کے بارے میں ایک حرف نہیں۔ پھر بھی اس کے ایک ایک لفظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالی کی بی بی کیسی اعلیٰ سیرت کی مالک تھیں اور حالی کے دل میں ان کی کتنی قدر ومنزلت تھی۔ حالی کو بیٹوں کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سخت رنجیدہ ہیں تو کس طرح صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ''تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ کی محبت اور خوبیوں کو بہت مت یاد کیا کرو اور اس دعا کا ورد رکھو۔ ''الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ دے۔'' خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج وغم کا بہترین علاج ہے۔''[9]

اولادیں

حالی کے یہاں چھے بچے پیدا ہوئے۔ تین بچے جن میں اعتقاد حسین اور رقیہ بیگم شامل تھیں بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی زندہ رہے۔

ا خواجہ اخلاق حسین، پیدائش قبل از: 1857۔ وفات: 2 فروری 1924

ب عنایت فاطمہ، پیدائش: 1859۔ وفات: 1915

ج خواجہ سجاد حسین، پیدائش: 1861۔ وفات: جولائی 1946

خواجہ اخلاق حسین کو حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے گود لے لیا تھا اسی لیے حالی ان کو برادر زادہ کہتے تھے۔ خواجہ اخلاق حسین کی چار اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی مشتاق فاطمہ تھیں جن کی شادی خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی۔ اردو ادب کے مایہ ناز ادیب خواجہ غلام السیدین اور معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین ان ہی کی اولاد تھے۔ دو بیٹے خواجہ احقاق حسین، خواجہ اکرام حسین اور چھوٹی بیٹی صدیقۃ النسا اخلاق حسین کی آخری اولاد تھی۔

خواجہ اخلاق حسین کی اولاد نے اردو شعر و ادب کی شمع جلائی رکھی ہے اور اس کی روشنی آج بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ محترمہ سیدہ سیدین اور پروفیسر صغریٰ مہدی کا تعلق اسی خاندان سے ہے حالی کی بیٹی عنایت فاطمہ کی شادی خواجہ عبدالعلی سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے خواجہ فرزند علی اور خواجہ عبدالولی اور ایک بیٹی سعیدہ بیگم تھیں۔

حالی کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی اپنی گھریلو زندگی سے پریشان رہتے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کے داماد خواجہ عبدالعلی کچھ محنتی آدمی نہ تھے وہ ہمیشہ مختلف شہروں میں معمولی جگہ پر ملازم تھے اور اپنی بیوی بچوں سے لا پروا اور بیگانہ تھے اور ان کے خاندان کا سارا بوجھ حالی پر تھا۔ دوسری اہم وجہ حالی کے نواسے عبدالولی کو مرگی کی بیماری تھی جس نے حالی کا سکون چھین لیا تھا۔ حالی کی حالت ان کے ایک خط سے ظاہر ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد عبدالرحیم خاں بیدل کو لکھا تھا۔ ''عبدالولی جس کے علاج کو دہلی گیا تھا اس کے صرع کے دورے تو رک گئے مگر جنون بڑھتا جاتا ہے میرا ناک میں دم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہوگئی ہے۔ یہ یقین ہوگیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے۔''

حالی ذہنی اور مالی طور پر بہت پریشان تھے اور آخری عمر میں کسی سکون کے مقام کی تلاش میں تھے تاکہ اپنی نظم اور نثر کی تحریروں کو ترتیب دے سکیں لیکن انھیں اس کی فرصت نہ تھی۔ حالی نے اپنے نواسے کی بیماری پر ہزاروں روپیہ صرف کیا لیکن افاقہ نہ ہوا نواسے کا مزاج جنون کی کیفیت اختیار کرتا گیا اور بعض اوقات وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ خواجہ عبدالولی نے مولانا سے گستاخی کی اور انھیں شدید دھکا دیا جس سے مولانا گر پڑے۔ خواجہ سجاد حسین اس

وقت موجود تھے ان کا مزاج بڑا حلیم تھا لیکن وہ کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے بھانجے کو ڈانٹا اور ایک طمانچا بھی مارا۔ حالی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور جب تک خواجہ سجاد حسین نے بھانجے کو منا نہیں لیا حالی نے اپنے لائق بیٹے سے بات چیت نہیں کی۔ وہ اس بیماری کے مارے غم زدہ نوجوان کی ذرا سی دل آزاری کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

حالی کے دوسرے نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی کی تصانیف کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ چنانچہ حالی کی تصنیف مولود شریف کی پشت پر خواجہ فرزند علی کی حسب ذیل تحریر ہے:

> ''ایک عرصے سے پانی پت میں ایک مطبع جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا حالی کی زندگی میں ان کے دوست جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم نے ایک مطبع اس نام کا جاری کیا تھا جو چند سال نہایت مفید کام کرنے کے بعد بند ہو گیا۔ اب میں نے اپنے نانا صاحب (مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی) مرحوم و مغفور کی یادگار میں ایک نیا مطبع بنام حالی پریس جاری کیا ہے اس کا مقدم مقصد یہ ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی تمام تصانیف ایک سلسلے کی صورت میں اور ایک تقطیع پر چھپوائی جائیں اور ان کی تصحیح کا پورا اہتمام کیا جائے۔''

حالی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کا شمار اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے تعلیم یافتوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اسکولوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ خواجہ سجاد حسین کی کاوشوں سے بہت سے اہم مسودے حالی کی تصانیف کے محفوظ ہو گئے اور شائع ہو کر عوام کی دسترس میں آئے۔

حالی اور فیملی

حالی صحیح معنی میں کنبہ پرور تھے۔ وہ صرف اپنے بیمار نواسے کی بیماری سے متفکر نہ تھے بلکہ اپنے دوسرے نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں سے بھی پوری طرح پیار و محبت کرتے تھے اور انھیں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی صحت، تعلیم اور جذبات کا خیال رہتا ذیل کے چند واقعات ہماری بات کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

☆ حالی ہمیشہ لڑکوں اور بچوں کے خط کا جواب اسی پابندی سے دیتے جیسے بڑے آدمیوں کے خطوں کا۔ ان کا طرزِ تحریر یوں بھی سادہ، شستہ اور آسان ہے لیکن عورتوں اور بچوں کو جب خط لکھتے تو خاص طور پر وہ لہجہ اور زبان استعمال کرتے تھے جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے تھے کہ بہت خوش خط اور صاف صاف لکھیں تا کہ انھیں پڑھنے میں آسانی ہو۔

خواجہ فرزند علی کو لکھتے ہیں: ''میری جان اب کے لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا اطمینان رہے۔''

☆ خواجہ فرزند علی مولانا کے بڑے نواسے کھیل کود کے بڑے شوقین تھے۔ اسکول کی بندشوں سے گھبراتے اور کتابی تعلیم سے بھاگتے تھے۔ مولانا کو ان کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ ہر طرح اس کی کوشش کرتے تھے کہ ان کا دل لکھنے پڑھنے میں لگے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام سیکڑوں خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ مولانا حالی نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم پائیں آخر اس کی طرف اُن کی توجہ نہ دیکھ کر انھیں ایف۔ اے کے بعد انجینئرنگ میں بھیج دیا تھا جہاں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ خواجہ فرزند علی مرحوم بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ: ''دیکھو مولانا حالی کو مجھ سے کتنی محبت اور میرا کتنا خیال تھا کہ تقریباً ہر خط میں میرا ذکر موجود ہے۔''[10]

☆ مولانا حالی کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین ایک صوفی منش بزرگ تھے اور وہ بھی خاندانی معاملات اور بچوں کی تعلیم وغیرہ کی کچھ زیادہ فکر نہ کرتے تھے۔ اس لیے ان کے دونوں بیٹوں خواجہ احتاق حسین اور خواجہ اکرم حسین کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بھی مولانا حالی ہی پر تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''حقن (احتاق حسین) انگریزی میں تو چل نکلا ہے۔ مگر حساب میں ابھی تک صفر ہے۔ ابھی دھیان اور توجہ لکھنے پڑھنے میں پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن خصلتیں عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اطاعت اور حکم برداری مزاج میں بہت ہے، کاہل نہیں ہے اور روز بروز قریب ہوتا جاتا ہے، گھر جانے کا کبھی نام نہیں لیتا۔ جس بات کو منع کرو پھر نہیں کرتا... اگر اس کے دل میں کچھ شوق اور توجہ پیدا ہو جائے تو اسے علی گڑھ ظہور حسین وارڈ میں داخل کر دیا جائے۔''[11]

☆ رشتے کے ایک پوتے کے فیل ہونے کی خبر سنی تو بہت افسوس ہوا۔ ان کے والد کو خط لکھا جس میں اظہارِ افسوس کے ساتھ ہی کس دل سوزی سے لکھتے ہیں:

''طالب علم کتنا ہی بدشوق ہو مگر فیل ہونے کا رنج وملال سب کو یکساں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کی دلجوئی کرنا چاہیے اور ملامت ونفرین سے احتراز کرنا چاہیے ... کہہ دینا رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت استقلال سے پھر کوشش کرو۔ ان شاءاللہ ضرور کامیاب ہوگے۔''[12]

☆ خواجہ غلام السیدین اُن کی پوتی کے بڑے بیٹے ہیں۔ اس لیے خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔ جب ماں اپنے دادا کے ہاں جاتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔ اوپر دیوان خانے میں مولانا حالی رہتے تھے۔ سیدین مولانا سے بہت مانوس تھے۔ جب وہ نیچے سے اوپر چلے جاتے تو یہ نیچے سے پکارتے 'بابا' اور مولانا آواز سن کر نیچے اترتے، بچے کو پیار کرتے اور پھر اوپر چلے جاتے۔ سیدین پھر پکارتے 'بابا' اور وہ پھر اسی طرح نیچے آتے پیار کرتے اور چلے جاتے۔ بچوں کو تو کسی بات کی تکرار میں مزہ آتا ہے۔ والدہ مرحومہ سنایا کرتی تھیں کہ سیدین جتنی مرتبہ انھیں 'بابا' کہہ کر بلاتا وہ اس ضعیفی کے عالم میں ہر مرتبہ نیچے اتر کر آتے اور اسے پیار کرتے تھے۔[13]

☆ سیدین صاحب کی چھوٹی بہن سیدہ خاتون (مرحومہ) بڑی پیاری، بھولی اور ذہین بچی تھی اور مولانا حالی اس بچی کو بے حد چاہتے تھے۔ انھوں نے سیدہ خاتون پر ایک چالیس بیت کی نظم بھی لکھی ہے۔ جو علاوہ ذاتی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے اُن کے مشاہدے کی باریکی پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے — صورت اچھی، سمجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان — پر ہے اچھے برے کی سب پہچان

اس نظم کو پڑھ کر جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچی سے مولانا کو کس قدر لگاؤ تھا۔ وہاں یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔

جھوٹ موٹ اس کو گر ڈراتے ہیں — بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
پکے پن سے یقین نہیں کرتی — دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی[14]

اور؎

اوپری شکل سے ہے گھبراتی ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

اوپر تلے کے بھائی بہن میں جو مزے دار لاگ ہوتی ہے۔اس کا ذکر دیکھیے؎

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو کیونکہ اوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹی ہے دوڑ کر ماں سے بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

اور کس پیار بھرے انداز میں بچی کی توتلی زبان کی تعریف کرتے ہیں؎

یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زبان جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں
پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب زرگری اپنی بولتی ہے جب

اس پوری نظم کو پڑھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بچوں کی سیدھی سادی پیاری زبان میں اُن سے باتیں کر رہا ہے۔

☆ حالی بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اگرچہ وہ خاندانی رشتہ دار ہو یا ہمسایہ یا بیگانہ یہ فرشتہ صفت انسان کے درجنوں واقعات آج ایک صدی سے زیادہ وقت گزرنے پر بھی دل کو تڑپا دیتے ہیں اور ان کے اخلاق کا کلمہ پڑھوا دیتے ہیں۔

پانی پت میں ایک مرتبہ حالی کسی جگہ سے تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گرا پڑا ہے اور کیچڑ اور گندگی میں لت پت پڑا اچلاّ رہا ہے۔آس پاس بہت سے آدمی جمع کھڑے دیکھ رہے تھے اور رام رام کر رہے تھے مگر کوئی اسے اٹھاتا نہیں۔مولانا نے فوراً اپنا تانگا ٹھہرایا۔پاس گئے بڑی آہستگی سے اسے نالی میں سے نکالا۔اپنے ہاتھ سے اس کے کپڑے اتارے اور اس کے ماں باپ کا پتا پوچھ کر خود وہاں چھوڑ کر آئے۔چلتے ہوئے لوگوں سے کہا:''جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔'' یہ ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہے۔

اخلاق و کردار

یہ سچ ہے کہ حالی کے اخلاق اور کردار کا کلمہ دوست دشمن سب نے پڑھا ہے۔ حالی ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ عملاً میر انیس کے شعر کے مصداق تھے ؎

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی　　　چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

حالی معمولی سے معمولی شخص کی عزت اور شخصیت کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا دشنام دینا، کوسنا، غصہ کرنا، دھتکارنا وغیرہ تو ایک طرف کبھی کسی سے آواز بلند گفتگو نہ کی۔ حالی بچوں میں بچے، بیماریوں میں مسیحا، دردمندوں کے ہمدرد، غریبوں کے مددگار اور حاجت مندوں کے سہارا تھے۔ اگر چہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن ان کا دل کشادہ تھا کیونکہ ان کی فطرت میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کہتے ہیں ؎

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

انگریزی محاورہ ہے:

It is Difficult to be humble when you are greatI.

مگر حالی نے اپنے کردار اور عجز وانکسار سے یہ ثابت کر دیا کہ عظیم شخص وہی ہے جس کے اخلاق اور کردار بلند ہوں۔ چونکہ اردو ادب میں یہ گوہر نایاب خاص طور پر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں میں خال خال ہے اِس لیے ہم چند معتبر اور مستند واقعات جو حالی کی فرشتہ صفت شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

شاعروں کی چشمک اور معرکہ آرائیوں سے اُردو کے قارئین بے خبر نہیں ہیں۔ تعلی شاعر کا پیدائشی حق تو ہے لیکن مشاعروں کی سیاسی تجلی اور بازی گری نے ادبی اور شعری آموزش گاہ کو شعرا کا دنگل بنا دیا ہے اس ماحول میں حالی کی سیرت کو دیکھیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں: خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے دہلی کے ایک مشاعرے کا حال مجھے سنایا تھا، جس میں خواجہ حالی مرحوم اور داغ مرحوم دونوں شریک ہوئے تھے۔ طرح تھی۔ 'خبر کہاں'، 'نظر کہاں'، داغ مرحوم کی غزل مشہور ہے ؎

اس مبتدا کی دیکھیے نکلی خبر کہاں

مشاعرے میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داغ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور انھوں نے اپنی غزل سنائی۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق   رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب   آئے ہو وقتِ صبح ، رہے رات بھر کہاں؟

اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے، غزل تمام مشاعرے پر چھا گئی اور مدح و تحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا، اب داغ مرحوم کے لیے کچھ نہیں رہا۔ خود داغ نے کہا۔ ''اس غزل کے سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گر گئی، جی چاہتا ہے، پرچہ چاک کر دوں۔''

ایک عرصے کے بعد خواجہ صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے غدر کے بعد کے مشاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور خصوصیت کے ساتھ اس مشاعرے کا حال دریافت کیا۔ خواجہ صاحب حالات بیان کرنے لگے اور تفصیلات کی رو میں دور تک نکل گئے۔ لیکن پھر اچانک انھیں احساس ہوا کہ اب مجھے غزل کی مدح و تحسین کے واقعات بیان کرنے پڑیں گے، اس لیے کہتے کہتے یک قلم رک گئے۔ اب میں ہر چند اصرار کر کے پوچھتا ہوں، فرمایئے، اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ''جی ہاں! بس غزل پڑھی گئی اور مشاعرہ ختم ہوگیا۔'' میں نے بار بار پوچھا: آپ کی غزل پر داغ مرحوم نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟ لیکن ''جی ہاں، کیا کہا جائے۔'' کے سوا اور کوئی جواب نہیں ملا ''جی ہاں'' کی ''ہاں'' کو وہ جس طرح تمدید کے ساتھ ادا کرتے تھے، اسے قید کتابت میں لانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں پاتا کہ ''جی ہاں'' کی ''ہآں'' پر ایک لمبی مد کھینچ دوں۔

حالی کے پڑپوتے خواجہ غلام الحسنین اپنے مضمون 'حالی' میں لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے مجھے تینتیس سال تک دہلی اور پانی پت میں مولانا کی خدمت سے فیض یاب ہونے کی عزت حاصل رہی۔ اگر چہ مجھے اس مدت میں بوجہ ملازمت سر رشتۂ تعلیم ساڑھے چار سال تک پانی پت سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا۔ تاہم تعطیلات میں اور رخصت لے کر بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور چونکہ مجھ کو مولانا سے قرابت قریبہ حاصل تھی اس لیے کسی وقت

بھی ان کی خدمت میں کوئی رکاوٹ میرے لیے نہیں تھی، خواہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہوں، یا باہر مردانہ مکان میں۔ اور بعض اوقات گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان وجوہ سے مولانا کی نشست و برخاست، اخلاق و آداب، عادات و خصائل، الختصر ان کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کے متعلق اصلی حالات معلوم کرنے کے بے شمار مواقع جو مجھے حاصل ہوئے کسی کو حاصل نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا کے کلام کا مطالعہ بھی بہت کچھ کیا ہے اور جو کچھ ان کے کلام میں پایا ہے، وہی ان کی عملی زندگی میں دیکھا۔ لہٰذا میرے بیان کا دارومدار سنی سنائی پر نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدات اور ان واقعات پر ہے جن کی تصدیق خود مولانا کے قلم یا زبان سے ہو چکی ہے۔''

مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون میں مولانا حالی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک بڑے شخص کا قول ہے کہ ادیب کا کلام اس کے دماغ کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس معیار پر مولانا حالی کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی سیرت اور ان کی حیات سرتاپا ان کے کلام میں موجود ہے۔ وہ مجسم ہمدردی اور مجسم درد تھے اور یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کا ہر ایک مصرع درد بھرا تڑپتا ہوا جگر پارہ ہے۔ ہماری زبان میں اور بھی ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں عجیب اثر اور درد ہے۔ لیکن ان کا درد ذاتی اور محدود ہے۔ حالی کا درد ساری قوم کا درد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پر درد نغموں نے قوم کے دلوں کو ہلا دیا۔ سوتوں کو جگا دیا اور کاہلوں کو ہوشیار کر دیا۔''[15]

میرے بھائی آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو ہر بات کو نہایت گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا کی وفات پر جو 31 دسمبر 1914 کو واقع ہوئی، اپنے اخبار 'عصر جدید' میں ان کی سیرت کے متعلق نہایت جچی تلی رائے لکھی تھی جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں:

''مولانا یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی ان کی زبان

سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ آپ بلند خیال، بے نفس، محبّ اہل بیت اور صوفی منش سنی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریق نماز کے علاوہ اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقہ کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ ان کے پاس بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ عدل اور میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔ اس کے ساتھ رحم و مروت۔ پانی پت بلکہ اس تمام علاقے کو فخر ہوسکتا ہے کہ ایسا انسان کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی میں ان کی مثال ضرور ملے گی مگر کم۔ آخر زمانے میں جبکہ دماغ بیکار ہوگیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو۔ خدمت گاران کو الگ روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا۔ یہی حالت رشتہ داروں اور اہل شہر کی ہے۔ قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔''[16]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے حالی کی سیرت میں دو خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ایک سادگی دوسرے درد دل یہ دونوں خصوصیتیں ان کے کلام میں بھی ہیں، سیرت میں ہیں۔ دراصل ان کا کلام اور ان کی سیرت ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

نواب عمادالملک کہتے تھے سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے حالی کا مرتبہ بہت بلند تھا اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے۔

حالی ہر چھوٹے اور بڑے سے خلوص اور محبت سے ملتے تھے وہ بڑوں اور چھوٹوں کا ادب کرتے تھے علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں جب عبدالحق اور حمیدالدین حالی سے ملنے گئے تو وہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حمیدالدین نے کہا کہ آپ تعظیم کر کے ہمیں شرمندہ کرتے ہیں تو کہنے لگے: ''آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی تعظیم کروں۔ آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔''

اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ 'مرتبہ' لکھا مولفہ یا مصنفہ کا لفظ نہ لکھا۔ رفتار و گفتار، رہن سہن ملنے ملانے میں اتنی سادگی اور خاکساری تھی کہ ملنے والے کو مشکل سے یقین ہوتا کہ یہ اردو کا عظیم شاعر و ادیب حالی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حالی نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر عمدہ ریویو کیے انھیں سراہا لیکن انہی ہم عصروں نے سوائے سرسید کے حالی کی تصانیف پر خاموشی اختیار کی جس کا حالی نے کبھی نوٹس نہیں لیا بلکہ ان کی حمایت میں کہتے اور لکھتے رہے۔

مولوی ظفر علی خان نے 'دکن ریویو' میں شبلی کی کتاب پر بے جا شوخی سے کام لیا تو حالی نے محبت بھرے جملوں سے نصیحت کرنی شروع کر دی۔ میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہو گی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

1903 میں جب مولوی فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ سے 'اردوئے معلیٰ' جاری کیا تو جدید شاعری کے اس مجدد اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ 'اردوئے معلیٰ' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم

کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں، اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانہ میں گئے اور 'اردوئے معلیٰ' کے دو تین پرچے اٹھا لائے۔ حسرت اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے۔ خود پاس بیٹھ گئے، ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور اردوئے معلیٰ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور ''واہ! خوب لکھا'' کہہ کر داد دیتے تھے حالی بھی ''ہوں ہاں'' سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے، ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے اور کچھ اِس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے ''سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔''

فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ ''نکتہ چینی اصلاح زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔

حالی کے اخلاق اور کردار کے جو دوست اور دشمن مداح تھے وہ ان کی انسانیت تھی۔ افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں انسانیت کے جوہر کی کمی دیکھی گئی ہے۔ حیدرآباد دکن کی علمی اور ثقافتی تہذیب کے نمایاں شخص عماد الملک سید حسین بلگرامی جو سرسید کے قریبی دوست بھی تھے کہتے تھے، سرسید احمد خاں کی جماعت میں کوئی شخص انسانیت کے اعتبار سے حالی کے پایہ کا نہ تھا اور اس خاص بات میں خود سرسید احمد خاں بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے۔

حالی نے خود انسانیت کی تعریف سرسید احمد خاں کے فارسی مرثیے میں کی ہے جو سچ کہیں تو حالی ہی پر صادق آتی ہے۔

چیست انسانی! تپیدن از تپ ھمسایگان
از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن

(انسانیت کیا ہے! ہمسایوں کے رنج اور زحمت سے رنجیدہ رہنا۔ جنت میں بھی نجد کی گرم و زہریلی ہوا کے احساس سے افسردہ اور مرجھائے ہوئے رہنا)

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس
درشبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

(اپنے کو تمام کم ترینوں سے کم تر سمجھنا اور قفس کی تکلیف دہ زندگی کے احساس سے محل میں بھی بے چین رہنا)

آتش قحطی کہ در کنعان بسوزد باغ وکشت
برفراز تخت مصر از تاب آں بریاں شدن

(وہ قحط کی آگ جس سے مصر کے باغ اور کھیت جل چکے اس کی گرمی اور جلن سے تخت شاہی مصر پر بھی بھن جانا)

بی مڑیا کی نگہداشت

حالی ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ غدر میں دلی اجڑی اور کئی شریف خاندانوں کی عورتیں پانی پت کے گردونواح میں عزت و جان بچانے کے لیے زندگی بسر کرنے لگیں۔ ان ستم زدہ بدبخت افراد میں بی مڑیا بھی شامل تھی جنھوں نے حالی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر حالی کے کنبے کے ساتھ گزار دی۔ صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں کہ ایک 80 سالہ بوڑھی بی مڑیا کو خود انھوں نے دیکھا تھا جو غدر میں دس سال کی تھیں، عقد ہو چکا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ شوہر، ماں باپ عزیز و اقارب سب مارے گئے اور اس اکیلی کم سن لڑکی نے حالی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر چھوٹے موٹے کام جیسے سلائی، کشیدے کاری وغیرہ کر کے اپنا

خرچ چلاتی رہیں اور عزت وخودداری سے زندگی گزار دی۔ حالی کے انتقال کے بعد ان کی پوتی مشتاق فاطمہ نے بی مڑیا کی اس طرح خدمت کی جیسے ایک بیٹی اپنی ماں کی خدمت کرتی ہے۔ ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی صرف جذباتی شاعری ہی نہیں کرتے تھے بلکہ عملی طور پر جس قدر بھی ہو سکے عورتوں کے مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے۔

نوکروں سے برتاؤ

حالی کے دو خاص ملازم تھے۔ نانوں خان اور عطاء اللہ۔

حالی ان دونوں ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھار نانوں خان جب سجاد حسین کے ساتھ دوسرے شہر جاتا تو اس کی نگہداری کی تاکید کرتے اور نانوں خان کو خط لکھنے کی تاکید بھی کرتے۔ ایک مرتبہ نانوں خان غلطی سے کروسین تیل گھی سمجھ کر پی گیا۔

حالی نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور نواب لوہارو کے ہاں کی دعوت کو جانا ملتوی کر دیا۔ عطاء اللہ مزاج کا سخت اور بہت اونچا سنتا تھا لیکن وہ بھی حالی کا چہیتا تھا جس کو حالی اپنی جاکٹ رضائی اور کھانے پینے کی اشیا دیتے رہتے تھے۔ حالی کے انتقال کے بعد یہ دونوں ملازمین دن رات ان کے گن گاتے رہتے تھے۔

مولانا روم نے بہت صحیح انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے۔

دل بدست آرد کہ حج اکبر است   از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

مذہب

حالی کی پڑپوتی صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں۔ حالی عقیدتاً حنفی سنی مسلمان تھے اور حالی کی بیوی شیعہ تھی۔ وہ حنفی المذہب سنی تھے لیکن اہل بیت اطہار سے اور جناب علی مرتضیٰؓ سے انھیں بڑے بڑے شیعوں سے زیادہ عقیدت تھی۔ ان کا یہ شعر اس احترام اور عقیدت کا پورا ثبوت دیتا ہے۔

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے   وہ تیری محبت تری عترت کی وِلا ہے

پانی پت میں صرف ان کے خاندان کے شیعہ حضرات ہی نہیں بلکہ شہر بھر کے شیعہ ان کے مذہبی عقیدے کی بھی اسی طرح عزت کرتے تھے جس طرح ان کی ذات کی۔ جب حالی کی

وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا ہی کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔

آنحضرتؐ سے حالی کو وہ گہری عقیدت اور والہانہ عشق تھا جس کا ثبوت ہر اس شعر سے مل سکتا ہے جو انھوں نے ہادی برحقؐ کی شان میں کہا ہے۔ انھوں نے جہاں کہیں اس موضوع پر لکھا ہے قلم توڑ دیا ہے۔ 'مسدس حالی' کے چند نعتیہ بند اردو شاعری کے سارے نعتیہ کلام پر بھاری کہے جا سکتے ہیں ۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
غریبوں کا ملجا ضعیفوں کا ماوٰی یتیموں کا والی غلاموں کا مولٰی

قناعت

قناعت ایک خداداد انسانی قدر ہے جسے انسان اپنے نفس کی پاکیزگی سے نمو دیتا ہے میر انیس نے کہا تھا۔

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے فقیر ہوں پہ نہیں حاجت سوال مجھے
کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

انسان کو جینے کے لیے معاش اور روزگار کی ضرورت ہے۔ زندگی کی گاڑی کا ایندھن یہی روپیہ اور مال ہے جس سے پیٹ کی آگ بجھائی اور بدن کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ حالی کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اوائل زندگی سے آخری عمر تک کبھی حریص وطمع نہیں کیا بلکہ قانع رہے جو کچھ بھی انھیں روزگار نے فراہم کیا۔ انیس کا شعر حالی کی وضع داری اور قناعت پر صادق ہوتا ہے۔

کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

واقعہ

جب حیدر اباد کے نواب سر آسمان جاہ نے حالی کی شعری اور ادبی کاوشوں سے متاثر ہو کر انھیں ماہانہ وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے پوچھا آپ کو گذر بسر کرنے کے لیے کتنا وظیفہ

چاہیے۔ حالی نے جواب دیا۔ مجھے اینگلو عربک اسکول سے جو ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں تو حیدر آباد کے سکہ رائج الوقت کے پچھتر روپے ہوتے ہیں یہی میری زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔

☆ لاہور کے قیام کے دوران ڈاکٹر لٹز کی ارضیات پر کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جو بعد میں گورنمنٹ کالج کے نصاب میں شامل رہی۔ حالی نے اس ترجمہ اور کتاب کو کالج کے لیے بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالی لاہور میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور تھے اور خاندان کی ساری ذمہ داریاں حالی پر تھیں۔

☆ حالی نے اپنی تصنیفات سے مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ سوائے ایک آدھ کتاب کی رجسٹری یا حقوق محفوظ کروائے ہوں گے۔ ان کی تمام تر کتابیں پبلشرز جب چاہتے شائع کر کے فائدہ اٹھا لیتے۔ مسدس حالی کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے لیکن حالی کو کوڑی بھی نہیں ملی شاید اردو ادب میں اس قسم کے استحصال کی دوسری مثال نہ ہو۔

☆ حالی نے اپنی تمام تر زندگی ایک معمولی مکان میں گزار دی۔ آخری عمر میں چھوٹے بیٹے سجاد حسین جو گورنمنٹ کے بڑے عہدے پر فائز تھے ایک قطعہ زمین لے کر نسبتاً آرام دہ گھر بنایا جس کے اوپری حصے میں حالی رہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالی کے ہمدرد عالی شان بنگلوں اور کوٹھیوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وقارالامرا نے حیدر آباد میں اپنے رہنے کے لیے ایک عظیم الشان محل فلک نما بنوایا تھا جس کا ذکر حالی نے اپنی نظم میں بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے حالی کا یہ مکان دیکھا ہے جس کے مالک اس وقت ایک سردار صاحب تھے۔ ہمیں پتا نہیں اس عظیم شخص نے جس گھر میں پچیس برس گزارے ہوں وہ اب کس حالت اور کس کی تحویل میں ہے۔ کیا عمدہ ہوتا اگر اس گھر کو حالی میوزیم میں تبدیل کر کے ان کے نادرات کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جاتا۔ پروفیسر عزیزالدین ڈائرکٹر رام پور رضا لائبریری نے راقم کو بتایا کہ انھوں نے گورنر قدوائی کی مدد سے اس مکان کو حالی میوزیم میں محفوظ کروایا ہے۔

☆ حالی کی مالی حالت خستہ اور کمزور ہونے کی وجہ سے بہت سے کام وہ اپنی زندگی میں نہ کر سکے۔

ا حالی دہلی میں ایک مطبع کھولنا چاہتے تھے تا کہ فارسی عربی اور اردو کی عمدہ نایاب اور کم یاب کتابوں کو عمدہ طریقے پر شائع کر سکیں لیکن پیسہ نہ ہونے سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر رہا۔

ب حالی ایک عمدہ میگزین نکالنا چاہتے تھے لیکن یہ کام بھی مالی مشکلات نے انجام ہونے نہ دیا۔

ج حالی اپنی تصانیف بھی اچھی طرح سے شائع نہ کر پائے۔ حالی کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی پریس قائم کر کے حالی کی کتابوں کو شائع کیا۔

☆ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی کو جو کچھ بھی ملتا تھا وہ اپنے اقربا و رشتہ دار اور غریبوں میں صرف کر دیتے تھے۔ جب کبھی کسی شہر جاتے وہاں سے تحفے سوغات خصوصاً خاندان کی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے ضرور لاتے۔ یادگار حالی میں کئی واقعات ملتے ہیں۔

☆ حالی کے ملازم عطاء اللہ کے واقعات میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تذکرۂ حالی میں لکھا ہے کہ حالی اپنے بنوائے کپڑے عطاء اللہ کو دے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں جب عطاء اللہ نے حالی سے کہا کہ رات کو بڑی سردی لگتی تو حالی نے اپنی نئی بنوائی ہوئی رضائی عطاء اللہ کو دے دی جب اس نے کہا کہ یہ تو آپ نے کل ہی بنوائی ہے کوئی پرانی رضائی دے دیجیے تب حالی نے کہا یہ تم لے لو ہم اور بنوا لیں گے۔

مسافرت

حالی پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ تقریباً زندگی کا ایک چوتھائی حصہ مختلف شہروں میں گزرا۔ زندگی کا پہلا سفر پانی پت سے دلی کا پیدل کیا جو حصول علم کا آغاز تھا اور آخری سفر فرید آباد کا تھا جو ان کی تخلیقات کی جمع آوری کا تکملہ تھا۔

حالی سات سال جہانگیر آباد، چار سال لاہور اور کئی سال دہلی میں متعدد بار مقیم رہے۔ علی گڑھ، حیدر آباد، کراچی، الہ آباد، بھوپال، آگرہ، بمبئی کے علاوہ ایک درجن سے زیادہ مقامات پر جاتے آتے رہے۔ صحت کی کمزوری، سفر کی تکالیف ان کے مقاصد میں حائل نہ ہو سکیں۔

شمس العلما کا خطاب

حالی کو جون 1904 میں شمس العلما کا خطاب دیا گیا۔ حالی کو 1875 میں ان کی تصنیف مجالس النسا پر چار سو روپے کا انعام دیا گیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں تیس سال کا فرق ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تحریر کہ شمس العلما کا خطاب اور انعام حالی کو جون 1904 میں پیش کیا گیا صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ خود ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''کوشش کے باوجود مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حالی کو شمس العلما کا خطاب اور چار سو روپے کا انعام دونوں ایک ساتھ ملے تھے یا الگ الگ۔''[17]

حالی اگرچہ اس خطاب کے بہت پہلے ہی سے حق دار تھے لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے یہ خطاب انھیں عمر کے آخری حصے میں نصیب ہوا۔ حالی کو جب یہ خطاب ملا تو وہ فکر مند اور نگران بھی رہے چنانچہ اپنے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

''خطاب کی تحریک جہاں تک معلوم ہوئی ہے برخوردار تصدق حسین نے معرفت ڈائرکٹر صاحب کے دربار تاجپوشی سے بہت پہلے کی تھی۔ کیونکہ انھوں نے ڈائرکٹر صاحب کو دینے کے لیے میرے پاس سے میری سب کتابیں اس زمانے میں منگوائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ نے ڈائرکٹر صاحب کو میرے حالات سے بخوبی مطلع کر دیا تھا اور اس باب میں بھی تصدق حسین برخوردار نے بہت کچھ تائید کی تھی۔ کیونکہ خطاب کے شائع ہونے کے بعد انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں نے ڈائرکٹر صاحب کو اور آرنلڈ صاحب کو اسی معاملے کے متعلق ولایت چٹھیاں بھیجی ہیں۔... اس سے پہلے سائم صاحب کے زمانے میں ماسٹر پیارے لال صاحب نے میرے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے لیے ضروری تحریک کی تھی۔ مگر اس وقت معلوم نہیں کیوں التوا ہوا۔

اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ آج چوتھا روز ہے کہ

ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کی خدمت میں حسب تحریر برخوردار تصدق حسین کے گیا تھا وہ چونکہ نہایت مہذب اور خلیق ہیں بہت اچھی طرح ملے اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں آج ہی پانی پت جاتا ہوں وہاں تفصیلی ملاقات ہوگی۔ چنانچہ وہ تین روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور کل ان کے ملنے کو جاؤں گا۔ انھوں نے میری کتابوں کے دیکھنے کی بھی خواہش کی ہے وہ بھی ادھر سے ادھر سے مانگ تانگ کر لے جاؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ قلندر صاحب اور کابل باغ وغیرہ عمارت قدیمہ کے دیکھتے وقت مجھے بھی بلایا جاوے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردسر کہاں؟''[18]

پوشاک

حالی کے بیٹے سجاد حسین کہتے ہیں۔ حالی کی پسند نفیس تھی۔ کپڑا خریدتے تو بہت دیکھ بھال کر کے رنگ ڈیزائن اور قسم سب موزوں ہو۔ جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہننا پسند کرتے تھے چونکہ سودیشی کے حامی تھے اس لیے اگر پانی پت کی بنی ہوئی باریک کھدر مل جاتی تو اس کے کپڑے پہن کر خوش ہوتے۔ عام طور سے کرتا پاجامہ اور اچکن پر سردیوں میں چوغہ یا روئی کا دگلہ پہن لیتے گلے میں مفلر اور سر پر گول سی ٹوپی بھی پہن لیتے۔

خوراک

حالی کی خوراک کم اور سادہ تھی۔ ترکاریاں بہت پسند تھیں۔ پھلوں میں آم اور خربوزوں کے عاشق تھے۔ آم کی شناخت تھی اور اچھے آم خریدتے تھے۔ چائے اور بسکٹ ہمیشہ تیار رکھتے۔ پان تمبا کو اور افیون کی گولیاں کھاتے حقے کا استعمال بھی ہر روز کرتے رہتے۔ آخری عمر میں دانتوں کی تکلیف کی وجہ سے پان کھانے میں کمی کر دی تھی۔ خوراک میں انتخاب اور اعتدال تھا جو آخری عمر تک برقرار رہا۔

آغاز شاعری

ہمیں تحقیق اور تلاش کے باوجود یہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ حالی نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور ان کا پہلا شعر یا پہلی غزل کون سی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی فطری شاعر تھے چنانچہ دہلی جانے سے پہلے ہی یہ شاعری کا پودا ان کے دل و دماغ میں نشوونما پانے لگا جس کا ایک سبب پانی پت میں موجود حالی کے استاد سید جعفر علی تھے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے جن سے فارسی لٹریچر کی کتابیں پڑھی تھیں اس وقت حالی کی عمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی۔ اس کی دوسری وجوہات میں حالی کا حافظہ، گیرائی اور مشاہدے کی گہرائی کے علاوہ بچپن ہی سے رنج و مصائب سے دو چار ہونے کے سبب دل و دماغ کا سوز و گداز بھی تھا۔اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ حالی جب پہلی بار ڈیڑھ سال دہلی میں رہے اس وقت ادبی اور شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے غالباً دوسری بار جب 1861 میں ملازمت کی تلاش میں دہلی آئے تو شعر و سخن کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ دہلی میں محمد اکرام خان شیدا کا دیوان خانہ ادبی مرکز بنا ہوا تھا جہاں شعر و سخن کی محفلیں ہوتی تھیں جن میں سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ حالی بھی شریک بزم رہتے۔ حالی اپنی کہانی میں لکھتے ہیں:

> ''جس زمانہ میں میرا دلّی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔''[19]

حالی کی اس تحریر سے یہ پتا چلتا ہے کہ انھوں نے 23,24 برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ غالب کی نصیحت نے حالی کو پابند مشق سخن کر دیا تھا لیکن بعد میں وہ ہمیشہ فکر شعر گوئی میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں وہ دہلی کے ماحول سے متاثر رہ کر عشقیہ شعر کہتے اور عاشقانہ اشعار پسند کرتے تھے۔

پڑھنے کا انداز

حالی کے شعر پڑھنے کا انداز فطری اور پرتاثیر تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور آواز میں دلکشی تھی۔ مولوی عبدالحق نے انھیں کئی جگہ پڑھتے سنا تھا چنانچہ اپنی کتاب 'چند ہم عصر' میں لکھتے ہیں:

> ''آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں ان کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضا سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا انھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا نظم ان کے ہاتھ سے لے لی، اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔''[20]

شیفتہ کی مصاحبت

حالی کی زندگی میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی صحبت غالب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جیسا کہ انھوں نے خود اپنے قلم سے اپنی کہانی میں لکھا ہے:

> ''غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے۔ اس کی

بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر وسخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا۔

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔''[21]

حالی کی تحریر سے شیفتہ سے تعلقات کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی روشنی پڑتی ہے اسی راستے سے حالی کو غالب کی منزل ملی اور غالب نے حالی کی شعری اور فکری دنیا میں وہ تبدیلیاں لائیں جو ایک خستہ شاعر کو خالی سے حالی بنا دیا۔ غالب کا مشہور قطعہ جو حالی کی نصیحت کے جواب میں لکھا گیا اس کا مخاطب مصطفیٰ خان شیفتہ ہی ہے۔

تو ای شیفتہ و حسرتی لقب داری   همی به لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفته بی سبب رنجید   تو گر شفیع نگردی بگو چه کار کنم

دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال   براں سرم کہ دراں عمر این دو کار کنم
یکی ادائے عبادت عمر پیشینہ   دگر بہ پیش گاہی حالی اعتذار کنم

یعنی تو جو شیفتہ اور حسرتی لقب رکھتا ہے میں صرف تیری محبت اور لطف پر بھروسہ رکھتا ہوں حالی مجھ سے خفا اور بغیر کسی وجہ کے رنجیدہ ہے اگر تو سفارش نہ کرے تو کہہ میں کیا کروں۔ اگر دوبارہ مجھے اس دنیا میں پیدا کیا جائے تو میں صرف دو کام کروں گا ایک گذشتہ عمر کی عبادت جو میں نے نہیں کی اور دوسرے حالی سے معذرت خواہی۔

حالی کی ملاقات شیفتہ سے دہلی میں ہوئی تھی اور پھر حالی جہانگیر آباد میں جو شیفتہ کی جاگیر تھی سات آٹھ سال مقیم رہے۔ صالحہ عابد حسین اور مالک رام نے لکھا ہے کہ شیفتہ نے اپنے چھوٹے بیٹے نقش بند خان کی اتالیقی کے لیے حالی کا استخدام کیا جس کی شدت سے تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''مالک رام صاحب نے حالی کے بارے میں شیفتہ کی جو رائے نقل کی ہے مجھے اس کا علم نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مالک رام صاحب کے بیان کی بنیاد حالی سے ان کی عقیدت اور حالی کے خاندان کے لوگوں سے ان کے ذاتی تعلقات ہیں... مالک رام صاحب اور صالحہ عابد حسین کو یہ محسوس ہوا کہ اگر حالی کو شیفتہ کا مصاحب بتایا جائے تو اردو ادب میں حالی کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی حالانکہ حالی یہ نہیں سوچتے تھے۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ وہ شیفتہ کے مصاحب تھے۔ اگر وہ شیفتہ کے چھوٹے بیٹے نقش بند یا ان کے بچوں کے اتالیق ہوتے تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔ شیفتہ کا مصاحب ہونا حالی کے لیے نہیں مالک رام اور صالحہ عابد حسین کے لیے شرم کی بات تھی۔''

راقم کی نظر میں مصاحب ہونا یا اتالیق ہونا شخصیت کے علم و فضل اور عمر کی نسبت سے ہوتا ہے۔ حالی سات آٹھ سال جہانگیر آباد میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ تھے۔ مصاحبت ان دنوں کچھ شام کے گھنٹوں پر مبنی تھی۔ یہ سچ ہے کہ حالی اپنی کہانی میں سات آٹھ جملوں میں شیفتہ کی مصاحبت کی سات آٹھ سالہ مصروفیات کو مکمل اور مستند طور پر بیان نہیں کر سکتے تھے ان دنوں کی

گزارشات کو گھر کے افراد ہی بہتر بتا سکیں گے۔ صالحہ نے اپنے والدین سے جو سنا ہے ہم کو اسے صحیح ماننا پڑے گا جب تک کہ کسی مستند حوالے سے اس کی تردید کی جا سکے۔ حالی بچپن سے ہی تعلیم کے شیدا تھے وہ ایک عمدہ معلم بھی تھے اور انھوں نے ساری عمر تعلیم اور علم کے فراہم کرنے میں صرف کر دی یہ تو شیفتہ کے لیے مایہ افتخار ہے کہ حالی جیسا عمدہ انسان ان کی صحبت میں رہا اور شیفتہ کے بچوں کے لیے باعث فخر کہ حالی ان کے اتالیق رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے حالی کی فکری اور شعری جہتوں کو مہمیز کیا۔ ان کی فکر سے مولویت کم کی اور وسعت نظری سے ہمکنار کیا۔ حالی مالی لحاظ سے آسودہ خیال رہے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد پھر روزگار کی تلاش میں لاہور میں پناہ لی۔ شیفتہ ہی کے ذریعے غالب کے قریب پہنچے اور غالب کی مصاحبت اور استادی کے فیض سے مستفید ہوئے۔ غدر کے زمانے اور اس کے بعد بھی جہانگیر آباد نسبتاً ایک ایسا مقام تھا جہاں حالی اپنے فن اور شخصیت کو سنوار رہے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ حالی یادگارِ شیفتہ لکھ دیتے تاکہ ہمیں ان مسئلوں میں الجھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد

ایک کامیاب شخص آرزوؤں اور جستجوؤں کا پتلا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے   بہت نکلے مرے ارمان مگر پھر بھی کم نکلے

حالی نے اپنی 77 سالہ زندگی میں بہت سے مثبت کام کیے اور بہت سے کام گردش دوراں سے نہ ہو سکے۔ اس تحریر میں ہم ان خوابوں کو جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے بیان کریں گے۔

☆ حالی چاہتے تھے دہلی میں ایک بڑا مطبع جاری کریں جس میں عمدہ مصنفوں کی کتابوں کو شائع کیا جائے، قدما کی عربی اور فارسی تصنیفات جو شائع نہیں ہوئیں نہایت حسن اہتمام کے ساتھ چھپوایا جائے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی اجرا کریں جس میں ہندوستانیوں کو یورپ کی ترقیات کی طرف مائل کریں۔ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کیونکہ اس عمدہ کام کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی جو حالی کے پاس نہ تھا۔

☆ اردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کر کے ایک کتاب لکھنے کا خیال پورا نہ ہو سکا۔

☆ عمدہ ناول اور شاہکار ڈرامے جو دوسری زبانوں میں ہیں، ان کو اردو میں ترجمہ کرنا اور کروانا چاہتے تھے جو نہ کر سکے۔

☆ مولانا حالی نے ایک آل نامہ لکھنا شروع کیا تھا جو مزاح کا ایک عجیب وغریب اور دلچسپ نمونہ تھا۔ اس میں ہر مذہب اور فرقے کے تعصب، تنگ نظری، حماقت، جہالت، خودغرضی وغیرہ پر چوٹ کی گئی ہے۔ مکتوبات حالی میں ہمیں اس کے چند لفظ ملے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لفظ	معنی
المذہب	اعلان جنگ
الدین	تقلید آبا و اجداد
العلم	قسمے از جہل مرکب
الامتحان	آزمائش لیاقت ممتحنان
الیونیورسٹی	کارخانہ کلرک سازی
المسلمانانِ ہند	چوں مارگزیدہ از ریسماں ترسندگان
الرئیس	آں کہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر	آں کہ تہیدست و قرضدار باشد
المولوی	آں کہ مسلماناں را از دائرۂ اسلام خارج می کردہ باشد
الواعظ	آں کہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند
الشکار	بہانۂ آدم کشی

افسوس ہے کہ مکمل نہ ہو سکا ورنہ اپنے طرز کی لاجواب طنزیہ چیز ہوتا۔

☆ حالی عورتوں کی تعلیم وتربیت پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے پانی پت میں اپنے خاندان اور ہمسائے کی لڑکیوں کے لیے ایک مکتب کھولا لیکن بہت جلد استانی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ مکتب بند ہو گیا۔

☆ حالی باقاعدہ طور پر ایک ہائی اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ چنانچہ 1901 میں جب ملکہ وکٹوریا کا انتقال ہوا تو ان کی یادبود میں ایک ادارہ قائم کیا گیا جس میں حالی نے ایک اسکول قائم کرنے کی تجویز کو منظور کروا کر چندہ جمع کرنے کا کام شروع کیا لیکن بدقسمتی سے تین ہزار روپے جمع کر سکے۔

چنانچہ یہ رقم ایک ہائی اسکول کے لیے بہت کم تھی اس لیے اس رقم سے حالی نے ملکہ وکٹوریالائبریری قائم کی جو 1947 کے فسادات میں ختم ہوگئی۔ حالی اسکول کا خواب حالی کے چھوٹے بیٹے سجاد حسین نے پورا کیا اور حالی اسکول قائم ہوا اور اس اسکول نے ترقی بھی کی لیکن افسوس کہ یہ اسکول بھی 1947 کے بلوے میں ختم ہو گیا۔

☆ حالی کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ خود کوئی ڈرامہ لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے مجبور تھے۔

حالی کی نایاب کتب

حالی کی تمام تر تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ خود حالی نے انھیں مرتب اور شائع کیا۔ حالی کے بعد حالی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور حالی کے نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی پریس سے سلسلہ وار ایک ہی تقطیع کی صورت میں کتابیں شائع کیں لیکن ان تمام کاموں کے باوجود حالی کی بعض کتابیں نہیں ملتیں جن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

☆ پادری عماد الدین کی کتاب 'تاریخ محمدیؐ' اسلام اور پیغمبر اسلام پر شدید اعتراضات کیے گئے تھے حالی نے اس کے جواب میں ایک اور کتاب 1870 میں شائع کی تھی جس کا عنوان 'تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے' تھا۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔

☆ 1871 میں اصول فارسی کا ایک حصہ مکمل کیا مگر اس کا بھی سراغ نہیں ملتا۔

☆ 1872 میں شواہد الالہام رسالہ لکھا اس میں نبوت اور الہام کو موثر انداز میں پیش کیا گیا تھا جواب موجود نہیں۔

☆ حکیم ناصر خسرو کا سفرنامہ جو فارسی میں تھا اس کو حالی نے مرتب کیا اور اس ڈیڑھ سو صفحات کے سفرنامہ میں تقریباً چالیس صفحات مفصل فارسی میں زندگی نامہ بھی پیش کیا۔

ناصر خسرو علوی جو گیارہویں صدی عیسوی کے شاعر تھے جنھوں نے سات سال تک ایشیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر کے سفرنامے میں اپنے مشاہدات، حالات اور تجربات مفصل طور پر فارسی میں لکھے تھے اس کا مخطوطہ نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کے کتب خانے میں تھا۔ حالی نے اس میں ناصر خسرو کے حالات فارسی میں جمع کر کے 1882 میں شائع کیا۔ یہ سفرنامہ بھی اب نایاب ہے۔

بیماریاں

حالی جوانی سے کئی امراض سے دو چار تھے اس کی وجوہات ان کی صحت کی دیکھ بھال سے غفلت، ورزش وغیرہ سے دوری اور پان تمباکو اور حقے کا استعمال تھا۔ چونکہ طبیعت میں اعتدال تھا اس لیے ان تمام مسائل کے باوجود اپنے زمانے اور مقام کے لحاظ سے اچھی عمر بسر کی۔

☆ جوانی میں اسہال نے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اسی زمانے سے انھیں بواسیر کی بھی شکایت تھی۔

☆ نزلہ، کھانسی، دمہ اور سانس کی تنگی شاید تمباکو اور حقے کے استعمال کے باعث برونکائیٹس کے سبب ہو۔ حالی کے داہنے بازو میں درد و سوزش کی وجہ سے پلاسٹر وغیرہ بھی لگایا گیا تھا۔

☆ سوزش سینہ اور درد معدہ قلب کی وجہ سے ہوسکتا تھا۔

☆ دانتوں کی تکلیف، مسوڑوں میں سوجن وغیرہ دانتوں کی حفاظت سے غفلت اور پان وغیرہ کے باعث تھی۔

☆ کم خونی بے وجہ فصد کھولنے کے باعث تھی۔

☆ سانس کی تنگی قلب کی نارسائی، کم خونی اور دمے کے باعث تھی۔

☆ نیند کا کم ہونا دماغی Stress یا کم قوتی کا سبب ہوسکتی ہے۔

☆ حالی کی بینائی میں کمی رعشہ بھی اعصاب کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ کم بینائی موتیا اترنے یا Catract کے باعث تھی۔ چنانچہ انھوں نے دو مرحلوں میں پٹیالہ اور لکھنؤ کے سرجنوں سے عمل جراحی کروا کر عینک کے استعمال سے کسی حد تک اپنی بینائی کو برقرار رکھا جس کے سبب وہ اپنی تصنیف و تالیف کے علاوہ روزمرہ کے کام مکتوب نگاری وغیرہ خود انجام دیتے تھے۔

حالی نے اپنے خطوں میں اپنی صحت سے غفلت اور بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔ حالی کی طبیعت میں جو کسی کام کرنے کی سچی لگن تھی وہ انھیں ان تمام مشکلات اور بیماریوں کے باوجود اس کام کو بدرجۂ احسن انجام دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔

مرض الموت

مولانا اسماعیل پانی پتی، خواجہ عبدالحمید اور صالحہ عابد حسین کی تحریروں سے حالی کے آخری زمانے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ آخری وقت حالی اپنے اطراف اور ماحول سے

واقف تھے۔کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی جو بعد میں بے بسی میں تبدیل ہو جاتی کیونکہ جواب نہیں دے سکتے تھے۔بعض اوقات ایک دو لفظ کہہ لیتے۔ یہ تمام علامتیں شدید دماغی Deppression اور Dementia کی ہو سکتی ہیں جو روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں اور آخر کار 31 دسمبر 1914 رات کے 1 بجے حالی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

تجہیز و تکفین

انتقال کے بارہ گھنٹے بعد یعنی یکم جنوری 2 بجے دن حالی کو حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کی درگاہ میں مدفون کر دیا گیا۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:''جب حالی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔حالی کے لوح مزار پر علامہ اقبال کا فارسی شعر کندہ ہے۔

طوافِ مرقد حالی سزد ارباب معنی را　　نوائے او بجان ہا فگند شوری کہ من دارم

یعنی حالی کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیونکہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔

راقم نے اس پورے قطعہ کو جو اقبال نے حالی کی سوسالہ سالگرہ کے موقع پر پانی پت میں پڑھا تھا ایک جداگانہ مضمون میں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ حالی سے اقبال کی عقیدت ظاہر ہو جائے۔ اقبال نے حالی کی موت کے مضمون کو بھی بانگِ درا کا جز قرار دیا ان کی نظم حالی و شبلی میں لکھتے ہیں۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گل ستاں　　حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

ملک بھر میں حالی کے انتقال پر جلسے، مجالس منعقد کیے گئے۔ کئی نامور اشخاص نے منظوم اور نثری خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض عمدہ قطعہ، تاریخ وفات بطور نمونہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حامد حسن قادری نے ہجری اور عیسوی میں وفات کی تاریخیں نکالیں۔

<u>تاریخ از کلام پاک</u>

1333 ہجری

<u>فبشرہ بمغفرۃ</u>

1914 عیسوی

حالی کی فاتحہ خوانی چہلم 21 فروری 1915 کو پانی پت میں شاندار پیمانے پر منائی گئی جس میں ملک بھر کے مشاہیر شریک ہوئے اور یہ طے پایا کہ حالی کی یاد میں ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

منظوم کلام

جدول اشعار حالی

شمارہ	عنوان	تعداد	زبان	ہیئت	تعداد شعر
1	قطعات اردو	67	اردو	قطعہ	470
2	قطعات اردو	161	اردو	رباعی	322
3	غزلیات اردو	123	اردو	غزل	1261
4	قصائد اردو	8	اردو	قصیدہ	326
5	منظومات سپاس مدح دعائیہ اردو	19	اردو	قطعہ	320
6	شخصی مراثی اردو	7	اردو	متفرق ہیئت	381
7	نظمیں اردو	33	اردو	قطعہ/مثنوی/متفرق	3295
8	بچوں کی نظمیں اردو	14	اردو	متفرق ہیئت	367
9	مسدس مع ضمیمہ اردو	1	اردو	مسدس	1374
10	قطعات تاریخ اردو	8	اردو	قطعہ	38
11	تراجم اردو	4	اردو	متفرقی ہیئت	263
12	متفرقات اردو		اردو	متفرقی ہیئت	103
13	اشعار فارسی		فارسی	متفرقی ہیئت	687
14	اشعار عربی		عربی	متفرقی ہیئت	115

تعداد کل اردو اشعار: 8518

تعداد کل فارسی اشعار: 687

تعداد کل عربی اشعار: 115

تعداد کل اشعار مطبوعہ: 9320

سید تقی عابدی

حواشی

i شجرہ

1 * آندھی میں چراغ: خواجہ غلام السیدین

* 'یادگارحالی: صالحہ عابد حسین، مطبوعہ فروری 1975، کوہ نور پرنٹنگ پریس

* Hali Musaddas By Syeda Saiyadain, Published Harper Collin, India

ii مولانا حالی کی حیات اور شخصیت

2 یادگارحالی: صالحہ عابد حسین، کوہ نور پرنٹنگ پریس، فروری 1975، ص 29

3 ایضاً، ص 56

4 ایضاً، ص 56

5 ایضاً، ص 55

6 ایضاً، ص 57

7 ایضاً، ص 57

8 ایضاً، ص 58

9 ایضاً، ص 58

10 ایضاً، ص 106

11 ایضاً

12 ایضاً

13 ایضاً، ص 109

14 ایضاً، ص 110

15 چند ہم عصر: مولوی عبدالحق، 1991

16 کلیات حالی، بک کارنر، جہلم، ص 112

17 الطاف حسین حالی: مضمون 'الطاف حسین حالی کے سوانح'، خلیق انجم، فریز پرنٹنگ پریس، 2002، ص 93

18 ایضاً، ص 92

19 کلیات حالی، مضمون 'حالی کی کہانی حالی کی زبانی'، بک کارنر جہلم، 2015، ص 56

20 چند ہمعصر: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی 1991، ص 117

21 الطاف حسین حالی، مضمون 'حالی کے سوانح': خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، 2002، ص 75

باب اول

اخلاقی درسی اور مناظراتی نظمیں

حالی کی نظمیں

اردو کے ادیبوں، مورخوں، شاعروں، محققوں اور ناقدوں کا یہ بھی عجیب مزاج اور طریقہ کار ہے کہ بغیر صحیح تحقیق اور ادبی چھان بین کے ہر مثبت اور منفی مسئلہ کو کسی ممدوح یا مطعون کے نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں جو عموماً کسی معروف و مشہور شخص کی تحریر یا تقریر کا حصہ ہوتا ہے۔ تحقیق اور تنقید کا ایک اہم عمل حق دار کو اس کا حق دینا بھی ہے۔ حالی کی شاعری اور نظریہ شاعری کی تبدیلی اور شعری اور نثری انقلاب جس کی عمدہ مثالیں ان کی نظمیں بالخصوص مسدس مدو جزر اسلام اور مقدمہ شعر و شاعری کے ہمراہ سوانح نگاری کے نمونے حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ہیں وہ سب صرف اور صرف سرسید کی علی گڑھ ادبی تحریک کا نتیجہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسدس حالی سرسید کی تحریک پر تصنیف ہوئی جس کا ذکر خود حالی نے کیا لیکن اس طرح کی نظم لکھنے کی مشق اور ایسی پر خلوص جذباتی سچی پر جوش نظم جس میں سماجی اخلاقی اقتصادی اور تہذیبی حقیقتوں کا سلیس اور واضح ذکر ہوتا کہ عامی سے عالم تک اس سے فائدہ اٹھا سکیں صرف سرسید کی ایک ملاقات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک طرف حالی کے دل کے الاؤ میں یہ خیالات پک رہے تھے تو دوسری طرف انجمن پنجاب کی تحریک کے منعقدہ مشاعرے میں اس کی مشق جاری تھی۔ دلی کی بضاعت لٹنے کے بعد اردو شعر و ادب کا جو قافلہ لاہور پہنچ کر شمع اردو کی لو

کو اونچا کیا اس کے سرخیل محمد حسین آزاد تھے ان کے ساتھ قافلے میں آہستہ آہستہ شامل ہونے والوں میں مولوی کریم الدین، سید احمد دہلوی، پنڈت من پھول پیارے لال آشوب، الطاف حسین حالی اور درگاہ پرشاد نادر شامل تھے۔ لاہور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹز نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی اور محمد حسین آزاد نے اسے ایک فعال تحریک میں تبدیل کیا جس کا مقصد سیاسی نہیں بلکہ خالص ادبی سماجی، اخلاقی اور اقتصادی تھا تا کہ برصغیر کے لوگوں کی اصلاح ہو سکے۔ آزاد کے ذہن میں 1867 سے ہی اردو شعر و ادب کی پاک سازی کا رجحان تھا چنانچہ غزل کے بے رمق عشقیہ شعروں پر سر دھننے کے بجائے نیچر کے موضوعات کو مشاعروں کا مضمون بنایا گیا۔ پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

> ''مولانا آزاد کو 1874 سے بہت برس پہلے اردو کی تجدید اور اصلاح کا خیال پیدا ہوا تھا۔ تاریخی ثبوت ہمیں 1867 تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ اگست 1867 کے ایک جلسے میں آپ نے 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات' پر ایک مفصل تقریر فرمائی۔'' شاید یہی جدید فکر نے برصغیر کے شعرا کو متحرک کیا جس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانے میں اسماعیل میرٹھی نے انگریزی کی چار نظموں کے منظوم ترجمے کیے جو کامیاب رہے۔
>
> سرسید 1869 میں انگلینڈ گئے اور پھر آنے کے بعد سائنٹفک سوسائٹی، مدرسہ دارالعلوم اور تہذیب الاخلاق رسالے کا اجرا کیا جس میں وہ آزاد کی جدید نیچر کی شاعری کا ذکر کر کے اس پیغام کو اپنی تحریک کا حصہ بناتے ہیں۔ سرسید نے علی گڑھ گزٹ میں لکھا: ''اہل پنجاب کی کوششوں سے ہماری شاعری سے عیوب دور ہو رہے ہیں سال گزشتہ کا وہ پہلا مشاعرہ ہماری زبان کی تاریخ میں یادگار رہے گا جب لاہور میں فطری شاعری کی قلم لگائی تھی۔''[1]

محمد حسین آزاد کی ایما پر ڈاکٹر ہال رائیڈ کی کوششوں سے 1874 اور 1875 میں دس مشاعرے سکھشا سبھا ہال لاہور میں منعقد کیے گئے۔ ان مشاعروں میں جن موضوعات پر نظمیں پڑھی گئیں ان میں برسات، زمستان، امید، حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت، تہذیب اور اخلاق شامل تھے۔ ان مشاعروں میں پندرہ بیس شاعر شرکت کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد ہر

مشاعرے کی روح رواں تھے۔ حالی نے صرف چار مشاعروں میں شرکت کی جو 1874 مئی، اگست، ستمبر اور نومبر کو برسات، امید، حب وطن اور انصاف کے موضوعات پر برگزار ہوئے۔ مشاعرے میں جو شعرا شریک ہوئے ان میں سوائے حالی اور آزاد کے کوئی بڑا اور نامور شاعر نہ تھا۔ ان مشاعروں سے متاثر ہوکر انگریز حکام نے نظم کو نصاب میں شامل کیا۔ محمد حسین آزاد کے خیالات 'آفتاب پنجاب' کے ذریعے اردو شعرا کو متاثر کرنے لگے اُدھر تہذیب الاخلاق نے نئی نسل کو ہموار کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے سچ کہا ہے:

> ''لاہور کے مشاعروں نے حالی کا ادبی مزاج بدلنے میں اتنا اہم کردار ادا کیا کہ وہ بالآخر 'مسدس مد و جزر اسلام' جیسی مربوط، اور اثر انگیز طویل نظم لکھنے پر قادر ہو گئے۔ حالی مشاعرہ انجمن کے کامیاب اور مقبول شعرا میں سے تھے۔ تاہم ان کی شاعری کا جدید انداز دلی کو مراجعت کے بعد نسبتاً زیادہ کھل کر سامنے آیا اور انھوں نے مستقبل کے ادبی منظر کو متاثر کیا۔ چنانچہ نظم جدید کو مقبول بنانے کا سہرا ان کے سر بھی بندھتا ہے۔ بلاشبہ حالی اس اعزاز کے پورے حق دار ہیں تاہم انجمن پنجاب کی تحریک میں اوّلیت اور فوقیت کا جو بلند مقام آزاد کو حاصل ہے وہ صرف انھیں کو سجتا ہے تحریک انجمن پنجاب اپنے عہد کی ایک فعال سماجی اور ادبی تحریک تھی۔ مشاعرہ انجمن نے اردو نظم میں انقلاب بپا کرنے اور شاعری کو فطرت اور صداقت کے قریب تر لانے میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔''[2]

حالی معترف ہیں کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم قدامت پرست اساتذہ کی نگرانی میں حاصل کی۔ جب آزاد لاہور میں اردو شاعری میں انقلاب لانے کے لیے انجمن پنجاب کی تحریک کو فروغ دے رہے تھے تو حالی عیسائی مبلغ پادری عماد الدین کے ساتھ مناظروں میں الجھے ہوئے تھے اور 'ہدایت المسلمین' کے جواب میں 'تریاق مسموم' لکھ رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے ان کے خیالات کو منقلب کرنا شروع کر دیا تھا اور انھیں بے جا مبالغہ آرائی سے نفرت ہو گئی تھی تاہم جدید تصورات سے ان کا اولین سابقہ لاہور میں ہوا اور انجمن پنجاب

نے مشاعرہ جاری کیا تو حالی نے نہ صرف اس میں شرکت کی بلکہ چار مثنویاں بھی لکھیں اور پیروی مغرب کی طرف مائل ہو گئے۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالی اب آؤ پیروی مغرب کریں بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

چنانچہ اسی لیے حالی نے جب آزاد کی آب حیات پر اعتراضات ہونے لگے تو آب حیات کی تائید اور آزاد کے خیالات کی حامی بھری۔ حالی آزاد کی بہت عزت کرتے تھے۔ شبلی بھی آزاد کے رطب اللسان تھے۔ مولوی عبدالحق کا 'ہم عصر' میں آزاد کو حالی کا حاسد بتانا اور حالی کی تعریف نہ کرنے کا الزام دھرنا سوت کا رنگ نہیں بلکہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتا ہے۔ جب تک آزاد ذہنی اعتبار سے تندرست رہے ہر اردو خدمت گزار کے مدح خواں رہے۔

حالی نہ صرف آزاد کی آب حیات کے دل دادہ تھے بلکہ ان کی دیگر تصانیف کے عاشق تھے اور جدید خیالات کے مقلد۔ ایک تخلیقی ذہن کے ساتھ ایک سلجھا ہوا تنقیدی رویہ بھی رکھتے تھے۔ اردو نظم نگاری کے بانی نہ حالی تھے اور نہ آزاد اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں موضوعات پر کئی نظمیں ملتی ہیں اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی نظموں میں جان ڈالی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آزاد نے سب سے پہلے نظم مُعَرّیٰ اپنے دیوان میں شامل کی جس میں ردیف اور قوافی کو ترک کیا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری سے 20 سال پہلے آزاد نے جو نیچرل شاعری پر لیکچر دیا اس کے اقتباسات کو مقدمہ کے متن سے ملا کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ نقوش حالی کے ذہن میں پختہ تجربوں کی طرح محفوظ تھے۔ آزاد کہتے ہیں:

> ''اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فر فر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت، کسی شے سے خوف یا خطر یا کسی شے پر قہر یا غضب،

غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا۔ بے شک مبالغے کا زور، تشبیہ اور استعارے کا نمک، زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر پیدا کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک......۔''

''......ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں، لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور بے چاری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر کھڑی ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔''[3]

''نئے انداز کے خلعت وزیور جو آج کے مناسب حال ہیں انگریزی صندوقوں میں بند پڑے ہیں۔''

اردو موضوعاتی نظم کا بانی کوئی بھی ہو ہمیں اس سے سروکار نہیں مگر ہم اتنا جانتے ہیں جس شاعر نے سب سے پہلے نظم جدید کو مقبول اور معروف کیا وہ صرف الطاف حسین حالی تھے۔ حالی کا کمال یہ بھی تھا کہ وہ مغربی طرز کی شاعری کرتے ہوئے بھی مشرقی مثبت قدروں کے محافظ تھے۔ انجمن پنجاب کے مناظموں میں آزاد اور حالی کے علاوہ اشرف بیگ اشرف، الٰہی بخش رفیق، انور حسین ہما، محمد مقرب علی، قادر بخش، ولی دہلوی، علاء الدین محمد اور دیگر مقامی شعرا شرکت کرتے تھے۔ اگرچہ آزاد کی نظمیں طولانی اور زبان واسلوب سے استادانہ رنگ رکھتی تھیں لیکن حالی کی نظمیں جو مثنوی کی ہیئت میں سادگی اور سلاست سے بھری رہتیں گلدستہ شعر کا گل سرسبد قرار پاتیں۔ چنانچہ لاہور کی ان نظموں کی شہرت برصغیر میں ہونے لگی۔ سرسید نے جو آگے چل کر حالی سے مسدس لکھوایا وہ انہی نظموں کی کشش اور قدرت سے مرعوب ہو کر کہا تھا۔ سرسید حالی کی ان نظموں پر جو مثنویوں کی ہیئت میں پیش ہوئی تھیں ریویو کرتے ہوئے تہذیب الاخلاق 1992 ہجری میں لکھتے ہیں:

''مولوی خواجہ الطاف حسین...... کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی 'مناظرہ رحم و انصاف' جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے درحقیقت ہمارے علم و ادب کا ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔''[4]

ہم اس تحریر میں کچھ منتخب نظموں پر مختصر اور اجمالی تبصرہ کریں گے۔

ان نظموں کو ہم نے باب ہشتم کی اخلاقی درسی اور مناظراتی نظموں باب نہم کی حقوق زنان اور ہمدردی نسواں کی نظموں باب دہم کی قومی اور ملی نظموں اور باب یازدہم کی تعلیمی اور اصلاحی نظموں سے انتخاب کیا ہے۔

چپ کی داد تصنیف: 1905 ہیئت: ترکیب بند تعداد شعر: 47

یہ نظم رسالہ خاتون میں دسمبر 1905، مخزن میں فروری 1906 کو شائع ہوئی۔ حالی نے حیدرآباد دکن کے جلسہ عام میں اسے جون 1906 میں پڑھا۔

یہ نظم مناجات بیوہ کے تقریباً بیس سال بعد لکھی گئی۔ اس نظم میں حالی نے عورتوں کی عظمت اور سماج اور مذہب میں ان کا مقام دکھایا ہے۔ ان کی وجہ سے اولاد کی پرورش اور انسانی قدروں کی نمود بتائی ہے پھر ان پر جو مظالم ہوئے جو حق تلفی ہر دور میں ہوئی اس کی طرف بڑے درد بھرے لہجہ میں گزارش کی۔ آخر میں ملکہ بھوپال سلطان جہاں بیگم کی مدد اور سرپرستی سے کئی مقامات پر خواتین کے حق میں مثبت کاموں کی نشان دہی کی۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہی قوموں کی عزت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

دنیا کی تاریخ اور خاص طور پر عرب اور برصغیر میں عورتوں پر جو ظلم ہوئے یعنی لڑکی کی

پیدائش کو ذلت جان کر اسے زندہ دفن کیا گیا۔ بیوہ عورت کی زندگی کو ایک گناہ اور جرم سمجھ کر اسے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ جلایا گیا۔ بہت کم سنی میں بلوغ سے بھی پہلے شادی کے رشتے میں قید کر دیا گیا اور اگر وہ بیوہ ہو جائے تو اسے دوسری شادی کا حق نہیں دیا گیا۔ عورت ذات کے لیے تعلیم اور ہنر بے کار تصور کیے گئے چنانچہ صرف علم و ہنر مردوں کے لیے مخصوص سمجھا گیا۔ ان تمام عورتوں پر ہوئے مظالم اور ناانصافیوں کو اس نظم میں حالی نے بیان کیا۔

گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی　　حامی تمھارا تھا مگر کوئی نہ جز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ　　اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اس وقت تم، جب بیاہ سے واقف نہ تھیں　　جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمھیں ماں باپ نے اے بے زبانو اس طرح　　جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری اُمید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ　　بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں　　آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات　　ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر

چنانچہ عورتوں کے صبر اور حوصلوں نے مردوں کو متوجہ کیا اور اس طرح ان ناانصافیوں کو دور کرنے کی کوشش ہوئی۔ ستی کی رسم ممنوع قرار دی گئی۔ بچپن کی شادیوں پر پابندی لگائی گئی۔ عورتوں کے حقوق کے لیے قوانین بنائے گئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست شروع ہوا۔ ڈاکٹر شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کی کوششوں سے علی گڑھ میں گرلز اسکول قائم ہوا۔ بھوپال کی ملکہ سلطان جہاں نے لڑکیوں کا ہاسٹل بنوایا۔ عورتوں کی علاحدہ میگزین نکلنی شروع ہوئی۔ حالی نے ان نکات کی طرف اس نظم میں اشارہ کیا ہے۔

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گزر　　زیبا ہے گر کہیے تمھیں فخر بنی نوع بشر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب　　دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب
آخر تمھاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبھ گئی　　سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
اے بے زبانوں کی زبانو بے بسوں کے بازوؤ　　تعلیم نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے

یہ جیت بھی کیا کم ہے خود حق ہے تمھاری پشت پر
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے

مناجات بیوہ تصنیف:1884 ہیئت:مثنوی تعداد شعر:445

اس نظم میں حالی نے برصغیر کی بیوہ کے دکھ درد کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ جذبات نگاری میں گھریلو محاورات سادہ نرم اور شیریں الفاظ سے نظم کو پرتاثیر اور دل نشین بنایا گیا ہے جو پُرنم آنکھوں ہی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ اس نظم کا ترجمہ برصغیر کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ نظم دراصل ہندوستانی زبان میں ہے اسی لیے بابائے اردو عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا اگر آپ اس زبان کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے تو حالی کی مناجات پڑھیے۔ مناجات بیوہ میں کم سن لڑکیوں کی شادیاں اور بیوہ ہونے کے بعد عمر بھر کی مصیبت اور افسردگی کا بیان ہے۔ حالی کی اس نظم کی وجہ سے کم سن لڑکیوں کی شادیاں قانونی طور پر ممنوع قرار دی گئیں۔ اس کے علاوہ بیوہ عورت کی دوسری شادی بھی قانونی طور پر قبول کی گئی۔

دولہا نے جانا نہ دلہن کو — دلہن نے پہچانا نہ سجن کو
شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہی کنواری
ایک کو تو نے شاد کیا ہے — ایک کے دل کو داغ دیا ہے
پھول کہیں کمہلائے ہوئے ہیں — اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں
عورت ذات کا تنہا جینا — ہر دم خون جگر کا پینا
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے — تیرے سوا جو سب کو بھلا دے

اس نظم کی زبان اور تاثیر پر عبدالماجد دریابادی نے سچ کہا کہ ”باتیں اتنی سچی اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہیں۔ اگر حالی نے اس نظم کے علاوہ ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا تو بھی دنیا و عقبیٰ کے لیے بس تھا۔

حالی ایک پر درد اور حساس قلب و جگر کے مالک تھے۔ انھوں نے صرف شاعری میں ان مسائل کو بیان نہیں کیا بلکہ عملاً اس پر عمل کیا۔ حالی اس زمانے میں عورتوں کے حقوق کے پاسبان اور ان کی تعلیم کے حامی تھے جب سرسید، اکبرالہ آبادی اور دوسرے افراد اسے ضروری نہیں سمجھتے تھے انھوں نے پانی پت میں اپنے گھر کے قریب لڑکیوں کا مدرسہ کھولا۔ لکھنا پڑھنا اپنی پوتی

مشتاق فاطمہ کو سکھایا چنانچہ تعلیم نسواں اور حقوق زناں میں حالی برصغیر کے بنیاد گزاروں میں صف اوّل میں نظر آتے ہیں۔

مناجات بیوہ لکھ کر حالی نے ذیل کی سماجی اور ادبی خدمات انجام دیں:

1 برصغیر کے معاشرے میں رائج مضر اور نقصان رساں رسومات کا کھلے الفاظ میں انکشاف ان کی مخالفت اور ان کا علاج۔ اس قومی بیداری کی وجہ سے بچپن کی شادیوں کی روک تھام اور بیوہ کو دوسری شادی کا اختیار حاصل ہوا۔ اسی نظم سے متاثر ہو کر برصغیر کی دوسری زبانوں میں ایسی نظمیں لکھی گئیں جن کا متن مناجات بیوہ سے ملتا جلتا تھا۔

2 مناجات بیوہ میں حالی نے جو ہندوستانی زبان کا نمونہ پیش کیا وہ عوام کا روزمرہ معلوم ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسی نظم کا ذکر کرتے ہوئے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اس نظم کی زبان عام فہم ہندوستانی زبان کا عمدہ نمونہ ہے یعنی جسے اہل زبان عامی اور عالم کے سوا غیر زبان کے افراد جو ہندوستانی سے واقف ہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

3 مناجات بیوہ سے عورتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کمیٹیاں بنیں، مختلف خواتین کے گروہوں نے اپنی اپنی محفلوں میں اسے پڑھا اور پڑھایا۔ اس نظم کی بدولت حقوق زنان کی پاسداری کا احساس شدید ہوا۔

4 اگر اس نظم کا ادبی تنقیدی جائزہ لیں تو ہمیں اس میں کئی موضوعات کا پتا چلتا ہے جنھیں حالی نے نظم کے رشتے میں پرویا ہے۔ یہاں ایک دکھیاری دل کی فریاد جو اپنے بھاگ اور قسمت پر نالاں ہے اور قسمت بنانے والے سے گلہ بھی ہے کیوں کہ گلہ اس سے ہوتا ہے جس سے محبت اور توقع ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے شکوہ میں گلہ خاکم بدہن ہو کر پیش ہوا یہاں ایک ان پڑھ معمولی بیوہ کا لہجہ اس طور ہوا

تو ہے ٹھکانہ مسکینوں کا تو ہے سہارا غمگینوں کا
تو ہے اکیلوں کا رکھوالا تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا
تو ہی دلوں میں آگ لگا دے تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے مارے مارے پھر چمکارے

حالی کی اس نظم میں عبد اور معبود کے رشتے کو دکھایا گیا ہے۔ عشق کا رشتہ جتنا مضبوط ہوگا لہجہ کا انداز اتنا رنگین ہوگا۔ حالی کا محور انسان اور اس کی زندگی ہے اور ایک قابل قبول زندگی جس میں لذت و درد، عشق اور محبت، مروت اور شفقت، جذبہ اور گداز شامل ہو ہر مرد اور عورت کا حق ہے وہ حق کو حق دار تک پہنچانے کے حق میں ہیں۔ مناجات بیوہ میں ہمارے معاشرے کی فضا اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ ہر بات اور جذبے کو بے نقاب اور برہنہ بیان کیا جائے اس نزاکت کو جانتے ہوئے حالی نے اس نظم کو اشاروں، علامتوں، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں سے تیار کیا ہے۔ یہ عمل حالی کی اس نظم کو ان کی مشہور نظم مسدس مدو جزر اسلام پر فوقیت دیتی ہے۔ زندگی کے معمولی اور روزمرہ کے حالات سے بنائی گئی یہ نظم دل کے تاروں کو اس لیے بھی چھیڑ دیتی ہے کہ اس کے نغمے میں حقیقی زندگی کی خواہش کی بربادی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ چند منتخب اشعار دیکھیے

چین سے جاگی اور نہ سوئی — میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی
گھر پر برہا پیا بدیسی — آئیوں برکھا کہیں نہ ایسی
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا — غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
کیسا تھا یہ بیاہ نناواں — یوں ہی پڑا اس کا پرچھاواں
چین سے رہنے دیا نہ جی کو — کر دیا ملیا میٹ خوشی کو
دن بھیانک اور رات ڈرانی — یوں گزری ساری یہ جوانی
آئے دن تیوھار کا آنا — اور سب کا تیوھار منانا
وہ گرمی کی چاندنی راتیں — وہ ارماں بھری برساتیں
رہ گیا دے کر چاند دکھائی — چاند ہوا پر عید نہ آئی
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی — سدا برت میں چلی ہوں بھوکی
رہی اکیلی بھری سبھا میں — پیاسی رہی بھری گنگا میں
سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی — سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی
گر سسرال میں جاتی ہوں میں — نحس قدم کہلاتی ہوں میں

میکے میں جس وقت ہوں آتی　　رو رو کر ہوں سب کو رلاتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی　　بال نہیں برسوں گندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی　　اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی
اڑ گئیں دل کی سب وہ ترنگیں　　چاو رہے باقی نہ امنگیں
یوں نہ بری اس جان پہ بنتی　　ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی

پس اس نظم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اثر کو پر تاثیر کیا اور تمام مسائل رکھتے ہوئے بھی یہ نظم ایک کامیاب تجربہ کی شکل میں ہمارے سامنے عمدہ ترین اردو نظموں میں شامل رہی۔

i　برکھارت

حالی نے 1874 میں ایک 144 اشعار کی مثنوی برکھارت اس جدید مشاعرے میں پڑھی جو ہالرائیڈ کی ایما پر محمد حسین آزاد نے موضوعاتی شاعری کے فروغ کے تحت لاہور میں برگزار کیا تھا۔ حالی کی یہ نظم پسند کی گئی اور اس پر سرسید کے علاوہ اخبار پنجاب نے بڑی تعریف کی جس کو گارساں دتاسی نے اپنے مضمون میں نقل کیا:

> ''جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہے۔ جنھوں نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اٹھے اور کوئی صاحب ذوق اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وطن کی خصوصیتوں کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ اور کسی مثنوی میں اس کی نظیر نہ ملے گی۔ بڑی بات یہ ہے کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی اور نہ حسن وعشق کے چرچے کیے پھر بھی اس کی سادگی اور رنگینی جادو کا کام کر گئی۔''[5]

مشہور ہے کہ اشیا اپنی ضد سے جانی جاتی ہیں۔ ہم روشنی کو اندھیرے سے، غم کو خوشی سے، خشکی کو تری سے گرمی کو سردی سے جانتے اور ان کی اہمیت اور برکت سے آشنا ہوتے ہیں۔ چونکہ جس موضوعی مشاعرے میں حالی نے یہ نظم پڑھی اس کا موضوع برسات تھا اِس لیے شاعر نے برسات کی اہمیت اور اس کی ضرورت بتانے کے لیے خشک سالی اور گرمی کا بیان پہلے کیا کہ زمانہ

مضطرب، جاندار بے چین اور پریشان، نباتات اور جمادات بھی ویران اور سنسان ہو چکے ہیں۔ حالی کے چند مصرعے دیکھیے۔

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور کھول رہا تھا آب دریا
اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سست
پھولوں سے پٹے ہوئے کہسار
دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
کرتے ہیں پپیہے پہیو پہیو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

ہر مذہب کے ماننے والے اپنے اپنے طریقے پر رحمت باری کا شکر ادا کر رہے ہیں۔

مسجد میں ورد اہل تقویٰ — یا رب لنا ولا علینا [6]
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا — کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو گرو گرنتھی — گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے — ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے

حالی کے برسات کے مثبت اور کچھ منفی اثرات کو جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں پر بڑے ہی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ اس نظم میں منظر نگاری، آسان زود فہم تشبیہات، استعارات سے اشعار کو رنگین بنایا گیا ہے۔ یہ نظم بہار کا مرقع معلوم ہوتی ہے، پرندوں کی نغمہ سرائی، پھولوں کی جلوہ نمائی، دریاؤں کی تیز روانی، جھیلوں اور تالابوں کی طوفانی کے ساتھ ساتھ سڑکوں کی ناہمواری گھروں کی نابودی اور بیماریوں کی زیادتی وغیرہ کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ برسات کے سکے کے دونوں رخ دکھائی دیں۔

قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لیے کتاب عرفان

گلشن کو دیا جمال تو نے — کھیتی کو کیا نہال تو نے
طاؤس کو ناچنا بتایا — کوئل کو الاپنا سکھایا
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان — اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
دولت جو زمین میں تھی مخفی — آگے ترے اس نے سب اگل دی
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے — واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

اس نظم کے آخری چند شعر حالی نے اپنے گھر اور وطن کی یاد میں لکھے۔ یہاں یہ بات بھی خارج ازمحل نہیں کہ حالی کو لاہور کی آب و ہوا سازگار نہ تھی وہ ہمیشہ بیمار اور دکھی رہتے تھے چنانچہ اس نظم کے چند مہینوں بعد وہ ہمیشہ کے لیے دہلی چلے گئے۔

پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد — جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی — چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا — طوفاں تھے آندھیوں کے برپا
اٹھتا تھا بگولے پر بگولا — شعلے تھے زمین سے نکلتے

حالی کے ان مصرعوں پر انیس کی گہری چھاپ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مضامین میں انیس کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ مضمون باندھتے وقت اقلیم انیس سے نکلنا دشوار ہے۔ انیس کے مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' میں جو انیس نے آٹھ بندوں میں گرمی کا ذکر کیا ہے اس کے چند مصرعوں سے اوپر بیان کیے گئے حالی کے مصرعوں سے ملا کر دیکھیے۔

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا
آہو جو کالے تھے تو تھے چیتے سیاہ فام
شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گماں

یہی نہیں بلکہ اسی گرمی کے اثر کو حالی نے جو بچوں پر بتایا ہے وہ بھی مرثیے کی دین میں محسوب ہوگا۔

اور صبح سے شام تک برابر　　تھا العطش العطش زباں پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال　　کمہلائے ہوئے تھے پھول سے گال
ہر بار پکارتے تھے ماں کو　　ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

کیا یہ اشعار مرثیہ کے معلوم نہیں ہوتے؟

حالی نے گرمی کی زحمت اور تکلیف بتانے کے بعد برسات کی رحمت اور نعمت کا ذکر کیا ہے۔

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں　　جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا　　اک شور ہے آسماں پہ برپا
باغوں نے کیا ہے غسل صحت　　کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

حقوق اولاد　تصنیف:1888　ہیئت:مثنوی　تعداد شعر:351

یہ مثنوی مکالمے کی صورت میں ایک قصے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے جو باپ اور بیٹے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ یہاں سماج کی خرابیاں، بچوں کی تربیت میں کوتاہیاں جس میں باپ اور بیٹا دونوں ایک حد تک اسی خرابی کے ذمہ دار ہیں بتایا گیا ہے۔

باپ نے لاڈلے بیٹے کو ہر طرح کا آرام اور آسائش دیا۔ پیسوں کی فراوانی، محنت سے دوری کھیل کود کی فراوانی اور آوارہ گردی نے لاڈلے بچے کو نکما کر دیا۔ چنانچہ سونے پر سہاگا ایسے بے کار نوجوان کی بڑی شاندار شادی رچائی۔ باپ نے جو کچھ پیسہ جمع کیا تھا وہ جھوٹی شان نبھانے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے خرچ کر دیا جس کا نتیجہ برا ہوا اور یہ خاندان مالی اور اخلاقی مسائل سے دوچار ہوا۔ شادی کے بعد بھی لڑکا بگڑتا گیا اب اسے کئی بری عادتیں لگ چکی تھیں جبکہ اس کا باپ ضعیف اور غریب ہو چکا تھا۔ بیٹے نے باپ کی پہلے تعریف کی کہ اس کا بے حد خیال رکھا لیکن اس ناز و نعمت نے اسے صحیح زندگی بسر کرنے سے باز رکھا۔ اگر باپ کی اتنی بے وجہ ہمدردیاں نہ ہوتیں تو وہ دنیا میں کام کرنے اور محنت سے روٹی اور روزگار کمانے کے قابل ہو جاتا۔ باپ نے اس اعتراض کو سن کر یہ اقرار کیا کہ بچوں کے ساتھ حد سے زیادہ لاڈلا پن، آسانیاں،

ان کی تربیت میں رکاوٹ بن جاتی ہیں لیکن پھر بیٹے کو دوبارہ نصیحت کی کہ اب بھی وہ جوان ہے وقت باقی ہے محنت اور سچی لگن سے دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ ساری نظم سیدھی سادی بیانیہ نظم ہے اس میں محاسن زبان، صنائع بدائع نہیں ہیں بلکہ تمام بول چال میں مکالمے کی زبان ہے جیسے کوئی بات کر رہا ہے۔ سیدھے سادے مطالب نصیحتوں اور شکایتوں کے انداز میں بیان ہوئے ہیں اور نظم کے آخر میں اس طرح سے نتیجہ گیری کی گئی ہے۔

راہ پر چاہو تو آ سکتے ہو تم　　ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم
ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب　　کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب
پہلے اپنا سوچ لو انجام تم　　دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم
ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے مگر　　اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور

ii جواں مردی کا کام

حالی کی قدیم ترین نظموں میں ایک مثنوی 1872 کی تصنیف 'جواں مردی کا کام' ہے جو 70 اشعار پر مشتمل ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور کچھ خیالات کے اضافے سے منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی کی زبان سادہ سلیس اور بیانیہ ہے۔ نظم کا متن واقعہ نگاری اور مکالمہ بندی سے بنا عام فہم طرز بیان میں ہے تا کہ بچے جوان بوڑھے عامی اور عالم سب اسے سمجھیں اور انسانی قدریں سیکھیں۔

نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بوڑھے باپ جس کے تین بیٹے تھے اپنی جائیداد اور ثروت کو تینوں میں تقسیم کر کے جواہرات کو الگ ایک صندوق میں رکھ کر تینوں بیٹوں سے کہا کہ اس جواہرات کا مالک وہ ہوگا جس نے سب سے اچھا کام انجام دیا ہو چنانچہ بڑے بیٹے نے بیان کیا کہ ایک شخص نے بغیر کسی گواہ یا رسید کے اس کے پاس بڑی رقم امانت رکھوائی تھی جس کو وہ آسانی سے ہڑپ کر سکتا تھا لیکن اس نے امانت میں خیانت نہیں کی اور وہ رقم اس شخص کے مانگنے پر واپس کر دی اور اس مال دار شخص سے وہ انعام بھی قبول نہیں کیا جو اسے پیش کیا گیا تھا اس پر بوڑھے باپ نے کہا۔

اک برائی سے بچے تم تو کیا　　　اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا
اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز　　　شرم کی جا ہے تری عمر دراز

منجھلے بیٹے نے کہا کہ اس نے ایک ڈوبتے لڑکے کو بچایا اور اس کی ماں سے ملا دیا۔ بوڑھے باپ نے کہا۔

آدمیت کا کیا تم نے کام　　　جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے　　　نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے

چھوٹے بیٹے نے کہا کہ اس نے ایک مدہوش شخص کو موت سے بچایا جو اس کا جانی دشمن تھا چھوٹے لڑکے نے اس کام کو کرتے ہوئے اپنے چہرے کو ڈھانک لیا تا کہ وہ شخص شرمندہ نہ ہو۔ بوڑھے باپ اور دونوں بھائیوں نے یہ اقرار کیا کہ سب سے جواں مردی کا کام چھوٹے بیٹے نے کیا اور وہی اس جواہرات کے صندوق کا حق دار ہے۔

iii 'کلمۃ الحق' معروف بہ 'راست گوئی'

حالی کی یہ مثنوی 121 اشعار سے بنی ہے۔ یہ عجیب طرز بیان کی مثنوی ہے جس میں راست گوئی یا سچ بولنے پر جو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا ذکر فقروں میں، محاوروں میں تشبیہوں اور استعاروں میں بیان کر کے شاعر نے ان برگزیدہ ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی حق گفتاری سے دنیا میں انسانی اور دینی قدریں باقی رہ گئیں اگر چہ وہ خود قربان ہو گئے۔ حالی کی یہ نظم اخلاقیات کا درس اور انسانی قدروں کو مہمیز کرنے کا عمل معلوم ہوتی ہے۔ سچائی یا راست گوئی تلخ ہے، تند ہے، کڑوی ہے، برہنہ تلوار، زہر ہلاہل اور شہادت ہے۔

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہو گی
چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
تو آشتی کی رہتی ہے دشمن

یہی سچ گفتاری نے تاریخ میں وہ نقش بنائے جو آج بھی تر و تازہ ہیں۔ حالی نے راست گویوں سر بازوں کا ذکر کئی مقامات پر علاحدہ علاحدہ کیا ہم اِسے کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں ؎

سقراط کو زہر تو نے دلایا
شبیرؑ کو قتل تو نے کرایا
بدر و اُحد میں رن تو نے ڈالے
موسیٰ کو مدین تو نے بھگایا
احمدؐ سے مکہ تو نے چھڑایا

حالی نے راست گوئی کو ہر زاویہ سے دیکھا اور ہم کو دکھایا ہے۔ حالی اس عظیم شاعر کے شاگرد ہونے کا شرف رکھتے ہیں جس کے لیے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیاں اور ہم یہاں اس کی جھلک دیکھ رہے ہیں ؎

اے راست گوئی اے تیغ براں — تیرا مخالف کیوں ہو نہ دوراں
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر — دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
اٹھتا ہے عملہ لات اور صفا کا — ہوتا ہے گھر پر قبضہ خدا کا
ہوتے ہیں اغیار احمد کے ساتھی — بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناتی
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت — تو جھوٹ پر واں کرتی ہے لعنت
یاں نام تیرا جس نے لیا ہے — عالم کو اپنا دشمن کیا ہے
کتنوں نے مانا ساحر نبیؐ کو — کتنوں نے جانا کافر علیؑ کو
طوفان اٹھائے اہل ہدیٰ پر — بہتان باندھے زین العبا پر
نعمان کو دی بدعت سے نسبت — کی شافعی پر برپا قیامت
مالک پہ لائے آفت جفا جو — یاں تک کہ اکھڑا مفصل سے بازو
کی ابن حنبل کی یہ مدارا — چہرے پہ تھوکا کوڑوں سے مارا
نکلے ایمہ اکثر وطن سے — خالی ہوا رے ابن حسن سے
مرتد بنایا اہل یقیں کو — ٹھہرایا زندیق ارباب دیں کو

حالی یہ بتا رہے ہیں کہ ان تمام مشکلات اور تکالیف کے باوجود راست گوئی پیروز رہی، اس نے دلوں پر حکومت کی، تاریکیوں کو اجالوں سے بدل دیا ظلم و جور کو نابود کر دیا، اس لیے آج دنیا میں راست گویوں کے نام زندہ ہیں۔

اے کلمہ حق تیری بدولت تجھ پر ہوے وہ دیوانے جب سے
دامن انھوں نے تیرا نہ چھوڑا دنیا نے ان پر گو ظلم توڑا
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اجالا حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

iv دولت اور وقت کا مناظرہ

اردو شعر و ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ بعض گراں بہا جواہر اردو کے پرستاروں سے ظاہر ہو کر بھی مخفی ہیں۔ حالی کی بہت سی نظمیں نہ صرف ہمارے مطالعے میں ہوتیں بلکہ ان کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں ہونا چاہیے تھا۔ حالی کے مسدس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ان کی دوسری مثنویاں اس کے سامنے بے نور ہو کر اردو دشت میں جلتی رہیں جن میں ایک 47 اشعار کی مثنوی دولت اور وقت کا مناظرہ ہے۔ ہمارے مطالعے میں علم و دولت، شاعری و موسیقی، حسن و عشق اور کئی دوسری قدروں کے مناظرے نظر آتے ہیں لیکن دولت کا وقت کے ساتھ مناظرہ جس میں دونوں قدروں کی مثبت جہتیں بتائی گئی ہیں کم ہے۔ حالی نے یہ مثنوی اس دور میں لکھی جب وہ غزل گوئی سے زیادہ شغف نہیں رکھتے تھے۔ حالی کی دوسری نظموں، قطعوں، غزلوں، رباعیوں اور نظموں کی طرح اس مثنوی میں بھی سادہ و سلیس زبان ملتی ہے جس سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حالی نے نہ صرف اردو شاعری کے مضامین کو بدلا بلکہ اس کی زبان کو بھی زمانے کے اعتبار سے بنایا۔

مثنوی یوں شروع ہوتی ہے۔

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایہ عزت یا میں؟

کیونکہ دولت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور وقت کا اثر صرف کامیاب افراد سمجھ سکتے ہیں اس لیے۔

وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا
سبز ہے گلشن دنیا مجھ سے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو ونما
نام اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر
میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر
کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا
درمیاں گر نہ قدم ہو میرا
جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں
جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو

مناظرہ کرتے وقت مثبت اور منفی قوتوں کو آمنے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ حالی کا کمال ہے کہ دونوں قدروں کی قدر و قیمت میں تقابل کر کے مناظرے میں جان ڈالتے ہیں اور ملٹن کے قاعدے کے مطابق شعر کو سچا اور سادہ بناتے ہیں۔ ہم کسی مزید تشریح کے بغیر واں مصرعوں سے نثر کا کام لیتے ہیں جو بقول شبلی نعمانی وہ شعر جس کی نثر نہ ہو سکے وہ عمدہ شعر ہے کیونکہ سادہ سلیس الفاظ میں روزمرہ میں کہا گیا ہے۔

وقت نے سن کے کہا اے دولت
ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر
کیجیے فرض تجھے گر چشمہ

تو ہوں چشمے کا میں سر چشمہ
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن لوگوں نے وقت کا لحاظ رکھا وہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب اور سرخ رو ٹھہرے۔ وقت دریا کے پانی کی طرح واپس نہیں لوٹتا، دنیاوی کام کاج وقت کے محتاج، دینی ذمہ داریاں سب وقت کی پابند۔ وقت کی اہمیت قدر و قیمت سے واقف دنیا کے عظیم افراد ہیں اگرچہ ان کے پاس شاید دولت کا انبار نہ ہو۔ دولت مٹھی میں رہتی ہے لیکن وقت آزاد ہے ۔

ان کی مٹھی میں ہے تو اے دولت	طائر رشتہ بہ پا کی صورت
نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود	جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر	جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر
جانتے ہیں حکما و عرفا	مجھ کو سرمایہ دین و دنیا
گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت	ہے مگر تنگ مجال فرصت

v مناظرہ رحم وانصاف

1876 میں حالی نے ایک 119 اشعار پر مبنی مثنوی رحم و انصاف کے درمیان گفتگو مکالمے کی صورت میں مناظرے کے عنوان سے تصنیف کی۔ یہ حالی کی تخلیقات کا وہ دور تھا جب ان پر جدید شاعری نے پورا تسلط حاصل کر لیا تھا وہ اب اپنی نظموں میں موضوع سے گلشن شعر سجا رہے تھے جس کا بیج پنجاب میں محمد حسین آزاد کے ترتیب دیے گئے مشاعروں نے حالی کے ذہن میں بو دیا تھا۔ ان نظموں کی تخلیق کر کے حالی یہ بتانا چاہتے تھے کہ عشقیہ فلاسفانہ اور تصوفی مضامین کے علاوہ بھی اردو شاعری میں ایسے موضوعات کی کمی نہیں جس سے شاعری کو دلچسپ اور دل پسند بنایا جا سکتا ہے جس سے ہر طبقہ استفادہ کر کے اپنی اور معاشرے کی فکری صلاحیت کو بلند کر سکتا ہے۔ حالی جن دنوں ایسی نظمیں لکھ رہے تھے تو اس کا خیر مقدم اس طرح کا نہیں ہوا جن کی حق دار یہ

نظمیں تھیں جس کی وجہ قوم کی جہالت اور عوام وخواص کا خاص شعری مذاق تھا جس میں عشق کی تندی، چوما چاٹی کے چٹخارے اور ہرزہ سرائی کے علاوہ اساتذہ شعرا کے دفتر جوان لغویات سے خالی تھے لیکن فلسفہ اور تصوف سے بھرے ہوئے تھے۔ حالی کی شاعری کو بیانیہ کہہ کر اس کو سپاٹ اور بے مزا بتا کر ان نظموں کو کچھ اس طرح قدیم بستوں میں باندھ دیا گیا کہ آج سوا سو سال گزرنے کے بعد بھی ان نظموں پر خاطر خواہ کام نہ ہوسکا۔

مناظرے کے لغوی معنی بحث کرنے کے یا باہمی مباحث کے ہیں۔ اس علم میں مدح اور قدح کر کے سکے کے دونوں رخوں کو دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالی کی کئی نظمیں مکالمے کی شکل میں مناظرہ پیش کرتی ہیں۔ اس مثنوی میں حالی نے انصاف اور رحم کا تعارف کر کے ان دونوں میں بحث کروائی اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا کہ یہاں دونوں فریقین کی جج عقل بنی اور دونوں کی لن ترانیاں سن کر کہا کہ رحم اور انصاف۔ سنو!

خیر اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں
صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف
اور سن اے عدل نہیں اس میں تکلف سرمو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدہ بے نور ہے تو
فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
رحم کہلائے جو مظلوم کی فریاد سنے
عدل ٹھہرے جو سزا ظالم بے رحم کو دے
کہیں وہ مہر کی صورت میں عیاں ہوتی ہے
اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے

انصاف اور رحم کا مکالمہ سنیے اور حالی کے فن کی داد دیجیے ہم کچھ اشعار اور مصرعے یہاں کسی ترتیب بغیر پیش کرتے ہیں۔

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا — کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں — دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں
قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری — سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری
تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوے سرتن سے جدا — اور ترے حکم سے لاکھوں ہوے مسکن سے جدا
اسی کرتوت پہ اے عدل یہ دعوے ہیں تجھے — کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے
رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا — فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا
لطف ہے عام سدا اہل خطا پر میرا — ہاتھ اٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

حالی اپنی نظموں کے مضمون کو تلمیحات سے سجاتے ہیں۔

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے — اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے
فوج راون کی لڑائی میں کھپائی کس نے — آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے
مصر میں قید سے یوسف کو نکالا میں نے — اور ایوب کے بیڑے کو سنبھالا میں نے
بیڑا فرعون کا جب غرق فنا ہوتا تھا — میں وہاں ساحل دریا پہ کھڑا روتا تھا

رحم کی بات سن کر انصاف نے اپنی کارکردگی بتائی اور کہا۔

یوں تو اے رحم تری ذات میں جوہر ہیں بہت — خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت
بے مروت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا — جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

یہاں حالی بلا تفریق مذہب وملت دنیا میں جو ظلم ہوئے ہیں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔
انصاف کہتا ہے۔

جس قلم رو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں — ظلم کے ہاتھ میں واں فکر و عمل کی ہے عناں
دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب وہاں — اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں
نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو حلقہ بگوش — رام لچھمن کی طرح پھرتے ہیں واں خانہ بدوش
مان رکھا ہے جنھیں قوم نے اولاد رسولؐ — قوم کے ہاتھ سے ہوجاتے ہیں پیاسے مقتول
زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں — اور یوسف سے برادر کو دغا دیتے ہیں

vi حب وطن

حالی نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران انجمن پنجاب کے برگزار مشاعرے میں شرکت کر کے ایک طویل مثنوی 'حب وطن' 1874 میں پڑھی جس کی دھوم شعر و ادب میں آج بھی باقی ہے۔ ملٹن نے جو تین شرطیں اچھے شعر کے لیے بیان کی تھی وہ سادگی، جذبات اور اصلیت تینوں یہاں موجود ہیں۔ اس مثنوی میں کل دو سو پندرہ 215 اشعار محبت کے دھاگے میں پیروے گئے ہیں۔ یہاں شاعر وطن کے ہم وطنوں کو باہم محبت، اخوت، ہمکاری، ہمدردی، ہمنوائی، ہمراہی اور ہم بستگی کی طرح احساس ملی قومی اور وطنی سے جوڑ رہا ہے۔

حالی کے فن پر کام کرنے والوں نے اس مثنوی کے کئی اشعار مختلف پیرائے میں نقل کیے ہیں۔ اس مقام پر ہم پوری مثنوی کا مختصر اور جامع جائزہ لیں گے۔ اس مثنوی کا حسن یہ بھی ہے کہ اِسے بلاتفریق مذہب وملت صرف اہل وطن ہونے کی نسبت سے پیش کیا گیا ہے۔ تمہید میں وطن کی تاریخ جغرافیہ کے علاوہ اس کی تہذیب اور تمدن کا ذکر بھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی زمین، اس کے پربت، اس کی ہوائیں، اس کے موسم، اس کے دشت و باغات، اس کے چرند و پرند سب اہل وطن کے لیے دل شاد اور نور چشم معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کے دل و دماغ میں یہ تمام مناظر اور یادیں تازہ ہیں جن کی قدر و قیمت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب وطن سے دوری ہوتی ہے۔

اے پہاڑوں کی دل فریب فضا — اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمہ سحری — اے شب ماہتاب تاروں بھری
تیری دوری ہے مورد آلام — ترے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

وطن کی محبت کی تمہید کے بعد حالی نے قدیم تاریخ کا دروازہ کھولا جہاں ہندوستان کے اصلی باشندوں کو آریا قوم نے اپنا غلام بنالیا اور پھر اس وطن پر حملہ آوروں نے حکومت برقرار کی۔

گو غلامی کا لگ گیا دھبا ۔۔۔ نہ چھٹا ان سے دیس پر نہ چھٹا

وطن کی اہمیت اور محبت کو شاعر نے تین مختلف مقامات اور واقعات سے اجاگر کیا۔ ہندوستان میں رام چندر جی کو ان کے وطن اجودھیا سے نکل کر چودہ برس پردیس میں بن باس میں گزارنا پڑا۔

جب ملا رام چندر کو بن باس ۔۔۔ اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس
پاؤں اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف ۔۔۔ اور کھینچتا تھا دل وطن کی طرف
گزرے غربت میں اس قدر مہ وسال ۔۔۔ پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا ۔۔۔ آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا

پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اصحاب سے جب وطن مکہ چھوٹا اور انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اس کا نقشہ یوں کھینچا۔

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی ۔۔۔ سید بطحٰی کے ہم راہی
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا ۔۔۔ پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے ۔۔۔ سنگریزے زمین بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کے چھوٹا تھا ۔۔۔ دل سے رشتہ نہ ان کا ٹوٹا تھا

حضرت یوسفؑ سے بھی کنعان وطن چھوٹا وہ ہمیشہ نہ صرف کنعان کی یاد میں تھے بلکہ وطن والوں کی مدد بھی کرتے تھے۔

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور ۔۔۔ اور ہوا ملک مصر پر مامور
یاد کنعاں جب اس کو آتی تھی ۔۔۔ سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اٹھائے تھے جس وطن میں سخت ۔۔۔ تاج بھاتا تھا اس بغیر نہ تخت

ان کو بیان کر کے حالی گریز کرتے ہیں کہ وطن کی محبت اگر سچی ہو تو وہ صرف وہاں کے جمادات، نباتات اور حیوانات کی حد تک محدود نہ ہو بلکہ اصل چیز تو انسانوں اور ہم وطنوں کی محبت اخوت اور ان کی خوشی میں ان کے غم میں غمگین ہونا چاہیے۔

حالی نے ایک طولانی پند و نصیحت کیا ہے وہ اصلی وطن دوستی اہل وطن کی مدد سمجھتے ہیں۔

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ کہ ہے اترن تمھاری جن کا بناؤ
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

شاعر کہتا ہے ہندوستان میں اتحاد اور اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اسے بیرونی حملہ آوروں نے آسانی سے زیر کرلیا۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب بھائی بھائی ہیں۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی جین مت ہووے یا ہو بیشوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ہند میں اتفاق ہوتا اگر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی ایک شائستہ قوم مغرب کی

شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف مختلف مذاہب اور ملتوں کے نفاق کی بات کر رہا ہے بلکہ ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں کی آپس کی رسا کشی جو خودکشی کے مترادف ہے ذکر کر رہا ہے۔

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار خوش نویسوں کو ہے یہی آزار
نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
سب کمالات اور ہنر ان کے قبر میں ان کے ساتھ جائیں گے

حالی اہل وطن کو غیرت اور حمیت کا سبق دے کر انھیں نصیحت کرتے ہیں۔

عزت قوم چاہتے ہو اگر جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر

ان کی عزت تمھاری عزت ہے ان کی ذلت تمھاری ذلت ہے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
گر نہیں سنتے قول حالی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

vii نشاط امید

حالی نے یہ 79 اشعار کی مثنوی 1874 میں محمد حسین آزاد کے موضوعی مشاعرے لاہور میں پڑھی۔ ہر دین میں اور خصوصی طور پر اسلام میں نا امیدی کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ شاعروں نے امید کو زندہ دلی اور نا امیدی کو مردہ دل کہہ کر اس بات کو بانگ دہل کہنے کی کوشش کی ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

اس مثنوی کا اصلی محور، جو ہر اور مبدا امید ہے جو ایک صحت مند، کار آمد اور کامیاب ذہن کی نشو ونما کے لیے وہی کام کرتی ہے جو خون میں آکسیجن۔ حالی کی یہ نسبتاً طویل مثنوی عنوان کے گرد ہی گردش کرتی نظر آتی ہے۔ مثنوی کیا ہے ایک گلدستہ ہے جس میں خیالات، جذبات، واقعات تلمیحات، استعارات، تشبیہات، محاورات کو سلیقے اور رنگینی سے نرم خوش رنگ الفاظ کی ڈور سے باندھا گیا ہے تا کہ خیالوں کے پھول ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بندھے رہیں۔

نظم کے آغاز میں امید کو جاں نواز، دل سوز، کارساز، عیش اور رنج کی شفیق، دکھ اور سکھ کی رفیق وغیرہ بتایا گیا ہے۔ ہر مصرعہ سچا اور سادگی سے لبریز ہے۔

اے مری امید مری جاں نواز اے مری دل سوز مری کارساز
عیش میں اور رنج میں میری شفیق کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج کھول دیے تو نے قناعت کے گنج
خاطر رنجور کا درماں ہے تو عاشق مہجور کا ایماں ہے تو

تمہید کے بعد حالی قدیم واقعات کا ذکر تلمیحات اور اشارات میں کرتے ہیں یعنی مصرعہ میں پوری داستان کو گھول کر یہ بتاتے ہیں کہ یہی امید تھی جس سے کامیابی، روشنی، زندگانی اور کامرانی کا راستہ طے ہوا۔

نوحؑ کی کشتی کا سہارا تھی تو　　چاہ میں یوسفؑ کی دل آرا تھی تو
تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس　　ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ذیل کے شعر میں حالی کو رام کی جگہ پانڈو اور پانڈو کی جگہ رام لکھنا تھا کیوں کہ رام کو بن باس ملا اور پانڈوں کو جنگ کرنی پڑی۔ حالی کہتے ہیں۔

رام کے ہمراہ چڑھی ان میں تو　　پانڈو کے بھی ساتھ پھری بن میں تو

حقیقت یہ ہے کہ امید ایک ایسی مثبت قدر ہے جس میں منفی کا شائبہ بھی نہیں۔ امید ہی نیکی اور ایمان وایقان سے بندھی ہے۔ امید ہی دین ودنیا کی کامیابی کا راز ہے اور یہی عاقبت کی کلید بھی ہے۔

دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو　　تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو
دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ　　دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ
نام ہے سدرہ کبھی طوبٰی ترا　　روز نرالا ہے تماشا ترا
کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل　　جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال وقیل

دنیا کے کاموں میں امید کی وجہ سے کامیابی ہے۔ امید کسی مثبت اور خوشحالی ماحول سے پہلے اس کا نقشہ ذہنوں میں کھینچ دیتی ہے۔ امید ہی ہے جو لا علاج مریضوں کو بھی تندرست ہونے کے خواب دکھاتی ہے۔ فقیر اور لاچاروں کو ہوائی محلوں میں سلاتی ہے۔ حالی نے مثنوی میں محاورے اور معروف فقروں کو جوڑ کر اشعار میں شعری چاشنی پیدا کی ہے۔

وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو　　رکھتی ہے ہر ایک کو خور سند تو
آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس　　رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس
جن کو میسر نہیں کملی پھٹی　　خوش ہیں توقع پہ وہ زر بفت کی
چٹنی سے روٹی کا ہے جن کے بناؤ　　بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

حالی امید کی تمام قدریں بتا کر اس نظم کے آخر میں یہ بتاتے ہیں کہ جب نا امیدی انسان کو اسیر کر لیتی ہے اور اس کے دین ودنیا کے رشتے کو توڑ دیتی ہے تو زندگی وبال جاں بن جاتی ہے۔

ہوتا ہے نو میدیوں کا جب ہجوم　　آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم کر
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھایئے　　پھاڑ کے کپڑے باہر نکل جایئے
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا　　اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا
مگر جیسے ہی امید کی کرن چمکتی ہے۔
کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں　　رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژ مردگی　　ہو گئی کافور سب افسردگی

viii قوم کا متوسط طبقہ

حالی نے 'قوم کا متوسط طبقہ' ترکیب بند دسمبر 1891 میں علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا۔ طبقہ سے مراد وہ لوگ جو سلف ہلپ علم و ہنر سیکھ کر دولت عزت نام و مقام پائے ہیں۔ یہ لوگ متوسط فقیر اور امیر دونوں گروہوں سے بہتر ہیں۔ ادنیٰ لوگ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرتے اعلیٰ طبقہ اشراف وہ لوگ ہیں جو دولت اور اپنی حالت میں مست ہیں اس میں ترقی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالی نے اس نظم میں جو ترکیب بند ہیئت میں لکھی گئی ہے قوم کے متوسط طبقہ کو کارمند کارکن اور کارآمد و کامیاب دکھایا ہے۔ اس نظم کا مطلع ہے۔

شکر اس نعمت کا یارب کر سکے کیوں کر زباں　　تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

حالی نظم میں گدائی، محتاجی اور ناداری کی مذمت کرتے ہوئے یہاں مولانا روم کے شعر کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ مولانا روم نے کہا تھا۔

آنچہ شریاں را کند روباہ مزاج　　احتیاج است احتیاج است احتیاج
الحذر اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر　　لومڑی جاتے ہیں بن جن کی بدولت شیر نر

حالی پھر یہ بتاتے ہیں کہ مسلسل کوشش اور محنت سے انسان کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ حالی انگریزی ضرب المثل Rome was not built in day کو یوں نظم کرتے ہیں۔

انجمن ہے قوم کی ہنگامہ شادی نہیں　　ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

حالی متوسط طبقہ میں مزدور اور علم و ہنر کے اشخاص کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

ix متوسط طبقہ (مزدور)

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جاں آتی ہے مردوں میں وہ طاقت ہے یہی
آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے
نوع انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے
کرتے ہیں اخلاق ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے
پھونکتے ہیں روح قومیت یہی افراد ہیں
ہے جہاں قوموں میں یک رنگی و وحدت ان سے ہے
دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

x متوسط طبقہ (علم و ہنر)

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیوں کر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں
ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری
یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں
رونق بازارِ جنس علم و حکمت ان سے ہے
پاؤ گے ان میں طبیب ان میں ادیب ان میں خطیب
ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے
ان میں قوموں کے ہیں مصلح ان میں ملکوں کے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت ان سے ہے
مشکلیں اکثر انہی سے قوم کی ہوتی ہیں حل
بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت ان سے ہے

سرسید اس نظم پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’اے دوستو! آج یہ نظم جو مولانا حالی نے پڑھی ایک عجیب نظم ہے کہ شاید ایسی نظم فارسی اردو عربی میں کسی شاعر نے نہیں لکھی...... جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا، اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے، مولانا حالی ہی کا کام ہے۔ ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانے میں جو کہا جائے گا کہ فخر قوم، فکر شعرا، فخر علما اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اوران سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے؟ تو کہا جائے گا کہ حالی۔‘‘ [7]

xi علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے؟

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے سہارا غیر کا چھوڑیں یہ ایک اک کو سجھاتا ہے
نہ چھوڑیں دین کا دامن، رہیں دنیا میں عزت سے سبق سب قوم کے بچوں کو یہ دونوں پڑھاتا ہے
نہیں پاتا کبھی عزت کی خواہش سے کوئی عزت معزز کس طرح بنتے ہیں؟ گر اس کے بتاتا ہے
خدا نے کر دیا ہے حکمراں جس قوم کو ہم پر خلوص اور دوستی اس قوم کی دل میں بٹھاتا ہے
رعیت کو برابر حق دیے ہیں جو حکومت نے طلب سے پہلے ان کا مستحق بننا بتاتا ہے
زمانہ قوم نے غفلت میں جو پہلے گزارا ہے ڈرانی صورتوں میں بار بار اس کو دکھاتا ہے
یہ باہم مذہبی فرقوں کو ہے شیر و شکر کرتا یہ روٹھوں کو مناتا ہے، یہ بچھڑوں کو ملاتا ہے
کھلاتا ہے یہ کھانا ایک دسترخوان پر سب کو نمازیں پنجگانہ ایک مسجد میں پڑھاتا ہے
وفا کا بیج بوتا ہے، تعصب دل سے کھوتا ہے مسلمانوں کو گڈ سبجکٹ [8] بننا یہ سکھاتا ہے
نہ چھوڑے گا یہ باقی قوم میں دیکھے گا جو خامی خدا کی برکتیں ان پر جو اس کالج کے ہیں حامی

حالی نے اس ایک دس شعر کے قطعہ بند میں علی گڑھ کالج کا منشور مرتب کیا ہے۔ یہاں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے ساتھ سماجی، مذہبی اور اقتصادی قدروں کی حفاظت کا درس دیا گیا ہے۔ اس پیغام میں قوم کو پسماندگی سے نجات اور انسانیت کی رہ پر گامزن رہنے کا حوصلہ سکھایا گیا ہے۔ وطن دوستی اہل وطن سے محبت اور حکمران جو عدل و مساوات کے حامی ہوں ان سے خلوص کرنے کا سبق پڑھایا گیا ہے۔ مسلمان قوم کی تفرقہ بازی، کاہلی، غفلت، جہالت، تعصب اور دوسری حیوانی عادتوں سے نجات کا سامان مہیا کر کے ان کو اچھے عوام بننے کی تلقین کی گئی ہے یہ چھوٹی سی نظم سلیس اور رواں بحر میں آب زلال کی طرح شیریں ہے جو مضطرب فکر کو سکون بخشتی ہے۔ آج کے اس دور میں علی گڑھ یونیورسٹی کے علاوہ علی گڑھ المنائی انجمنیں دنیا کے مختلف ملکوں میں سرسید اور علی گڑھ کی یاد مناتی ہیں۔ کیا بہتر ہوگا اگر اس نظم کے منشور کو یہ ادارے اپنے مینوفسٹو میں شامل کریں۔

سید تقی عابدی

1 جواں مردی کا کام[9]

(سنہ تصنیف: 1872، ہیئت: مثنوی، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

تھا کسی ملک میں اک دولت مند
حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند

دور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا
باپ بیٹوں کی جواں مردی کا

باپ ہوں جن کے مروت والے
بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمت والے

ہو چکا عمر کا جب سرمایا
ایک دن باپ کے جی میں آیا

گھر ہے تکرار کا یہ دولت و زر
مشترک چھوڑ مرے اس کو اگر

جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم
آخر اک روز ہے مرنا تسلیم

بس کہ تھا اس کو بہت فکر مآل
ایک دن بیٹھ کے، سب مال و منال

اک گراں مایہ جواہر کے سوا
تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا

پھر کہا ان سے کہ اے اہل ہنر!
باپ کی جان فدا ہو تم پر

تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی
یہ جواہر ہے امانت اس کی

باپ نے ان سے کہا جب یہ سخن
پھر تو تینوں کو لگی اور ہی دھن

کہ کوئی کارِ نمایاں کیجے
جس طرح ہو یہ جواہر لیجے

ان میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے
اس کو یہ فکر سوا تھا سب سے

ایک دن اس کا کوئی واقف کار
کہ نہ تھا جس سے کچھ اخلاص اور پیار

رکھ گیا آ کے جواں مرد کے پاس
ایک بھاری سی رقم بے وسواس

تھے رقم سے وہی دونوں آگاہ
نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ

کچھ بھی نیت میں گر آ جائے خلل
تو یہ تھا عین خیانت کا محل

جب رقم اس نے طلب کی اس سے — وسوسے دل میں بہت سے آئے
مگر اس شیر کی نیت نہ پھری — لی تھی جن ہاتھوں انہی ہاتھوں دی
نفس سرکش کو کیا مات اس نے — دی رقم اور نہ دی بات اس نے
صاحب زر نے جو کچھ نذر کیا — وہ بھی اس دل کے غنی نے نہ لیا
باپ کو آن کے دی جب یہ خبر — ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر!
اک برائی سے بچے تم تو کیا — اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا؟
اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز — شرم کی جا ہے، تری عمر دراز!

***

منجھلے بیٹے نے پھر اک دن یہ کہا — میں جو دریا کی طرف جا نکلا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک طفل صغیر — گر کے پانی میں چلا صورت تیر
تھا جہاں یار نہ کوئی یاور — ماں کا پہلو تھا نہ آغوش پدر
آنکھ تھی جانب مادر نگراں — ماں کنارے پہ ادھر تھی حیراں
گرچہ تھا کام خطرناک بڑا — پر اسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا
جان و تن کی نہ رہی مجھ کو خبر — جا پڑا نام خدا کا لے کر
جان تو جا ہی چکی تھی اس کی — پر مری شرم خدا نے رکھ لی
ایک دم بھر میں گیا اور آیا — لا کے بیٹے کو دیا ماں سے ملا
باپ نے سن کے یہ سب اس سے کہا — کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا!
آدمیت کا کیا تم نے کام — جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے — نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے

***

پسر خورد کا اب سنیے بیاں — جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں
عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز — باپ سے اپنے کہ اے بندہ نواز!
بات گو لائق اظہار نہیں — آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں
خوب اک روز گھٹا چھائی تھی — رات آدھی کے قریب آئی تھی

شب تاریک میں وہ ابر سیاہ
کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ

اک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا
خوف چھاتی پہ چڑھا جاتا تھا

ساتھ تم تھے نہ کوئی بھائی تھا
میں تھا اور عالم تنہائی تھا

کوندی اک سمت سے بجلی ناگاہ
جس سے آگے کو کھلی راہ نگاہ

پڑی اک غار پہ واں میری نظر
جس کی صورت سے برستا تھا خطر

موت کھولے ہوئے تھی منہ گویا
جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا

دیکھتا کیا ہوں کہ اک مرد غریب
جس کو روتے ہیں کھڑے اس کے نصیب

جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی
یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی

جان و تن کا نہیں کچھ نیند میں ہوش
غار کے منہ میں پڑا ہے مدہوش

اپنی ہستی کی نہیں اس کو خبر
اور قضا کھیل رہی ہے سر پر

اجل آ جائے تو ہے روک نہ تھام
ایک کروٹ میں ہے بس کام تمام

اتنے میں اور جو بجلی چمکی
شکل پھر غور سے دیکھی اس کی

مرد نکلا وہ شناسا میرا
تھا مگر خون کا پیاسا میرا

مجھ میں اور اس میں عداوت گہری
ایک مدت سے چلی آتی تھی

واں عداوت پہ گر آؤں اپنی
اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی

مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار
اک اشارے میں وہ تھا لقمہ غار

آ گیا مجھ کو مگر خوفِ خدا
اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا

مرتے کو مارنا بے دردی سے
ہے بہت دور جواں مردی سے

حوصلے کا ہے یہی وقت، کہ آج
ہے عدو اپنی مدد کا محتاج

جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار
کہ اسے کیجیے چل کر بیدار

واں سے جا اس کو اُٹھا لایا میں
موت کی زد سے بچا لایا میں

منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا
اس کو شرمندہ احساں نہ کیا

***

سن کے دی باپ نے بیٹے کو دعا
اور چھاتی سے لیا اس کو لگا

پھر بڑے بیٹوں کو بلوا کے کہا
بولو اب، کس سے ہوا کام بڑا؟
داستاں جب یہ سنی دونوں نے
باپ سے عرض کی یہ دونوں نے
خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف
پوچھیے ہم سے تو ہے یہ انصاف
جس جواہر کے طلب گار تھے ہم
اس کے لائق تھے نہ حق دار تھے ہم
اور کو اس کی ہوس نا حق ہے
حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے
باپ یہ سن کے ہوا شاد بہت
ان کے انصاف کی دی داد بہت
چھوٹے بیٹے کو بلا کر پھر پاس
پہلے خالق کا کیا شکر و سپاس
پھر جواہر اسے دے کر یہ کہا
لو، یہ ہو تم کو مبارک بیٹا!

2 برکھارت

(سنہ تصنیف: 1874، ہیئت: مثنوی، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان
عارف کے لیے کتابِ عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جان
سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا
اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چارپائے
تھیں لومڑیاں زباں نکالے
اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سست
گھڑیال تھے رودبار میں سست

ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا
بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا

بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں
اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں

گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ
تھا پیاس کا ان پہ تازیانہ

گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا
اور انس نکل رہا تھا سب کا

طوفان تھے آندھیوں کے برپا
اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا

آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے
شعلے تھے زمین سے نکلتے

تھی آگ کا دے رہی ہوا کام
تھا آگ کا نام مفت بدنام

رستوں میں سوار اور پیدل
سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بےکل

گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں
ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں

تھی سب کی نگاہ سوے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک

پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی
وہ بادِ سموم سے سوا تھی

بجھتی نہ تھی آتش درونی
لگتی تھی ہوا سے آگ دونی

سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک
جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک

ٹٹی[10] میں تھا دن گنواتا کوئی
تہہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی

بازار پڑے تھے سارے سنسان
آتی تھی نظر نہ شکل انسان

چلتی تھی دکان جن کی دن رات
بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات

خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا
یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا

تھا شہر میں قحط آدمی زاد
سلطان[11] کا اک کنواں تھا آباد

پانی سے تھی سب کی زندگانی
میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی

تھیں برف پہ نیتیں لپکتی
فالودے پہ رال تھی ٹپکتی

پھل پھول کی دیکھ کر طراوت
پاتے تھے دل و جگر طراوت

کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی
بھر آتا تھا سن کے منہ میں پانی

تھے جو خفقانی اور مراقی
گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی

کھانے کا نہ تھا انھیں مزا کچھ
آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ

بن کھائے کئی کئی دن اکثر
رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر

شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے
مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے

اور صبح سے شام تک برابر
تھا العطش العطش زباں پر

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال

آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کرتے 'مم مم'

ہر بار پکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لا کر
پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر

بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر
تھا حال بڑوں کا ان سے بدتر

تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری
پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

***

کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور

پروا کی دہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
ایک آتی ہے فوج ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

مینہ کا ہے زمین پر دریڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہے منہ پر
اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر

باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار
اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی
عالم ہے تمام لاجوردی

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے

سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر
پانی میں مگر، کچھار میں شیر

زردار ہیں اپنے مال میں مست
قلاش ہیں اپنی کھال میں مست

ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر
کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

مسجد میں ہے ورد اہلِ تقویٰ
"یا رب لنا ولا علینا[12]"

مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا
کرپا ہوئی تیری میگھ راجا

کرتے ہیں گرو، گرو گرنتھی
گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی

جاتا ہے کوئی ملہار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا

بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے
اور بانسریاں بجاتے پھرتے

سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا
چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے
ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے

کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھشا
تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

***

ہیں شکر گزار تیرے برسات
انساں سے لے کے تا جمادات

دنیا میں بہت تھی چاہ تیری
سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت　　راحت ملتی ہے بعد کلفت
شکر یہ فیض عام تیرا　　پیشانیِ دہر پر ہے لکھا
گلشن کو دیا جمال تو نے　　کھیتی کو کیا نہال تو نے
طاؤس کو ناچنا بتایا　　کوئل کو الاپنا سکھایا
جب مور ہے ناچنے پہ آتا　　آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا
کوئل کو نہیں قرار اک کل　　ایسی کوئی تو نے کوک دی کل
شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں　　کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں
سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا　　اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن　　کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ　　اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ
دریا تجھ بن سسک رہے تھے　　اور بن تری راہ تک رہے تھے
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان　　اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی　　ملتی نہیں آج تھاہ ان کی
جو دانے تھے خاک میں پریشان　　سب آ کے چڑھائے تو نے پروان
دولت جو زمین میں تھی مخفی　　آگے ترے اس نے سب اگل دی
پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر　　واں سبزہ و گل ہیں جلوہ گستر
جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے　　باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
جن باغوں میں اڑتے تھے بگولے　　واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار　　ہے بیر بھٹیوں سے گلنار

***

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں　　جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن　　جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری　　اور جھول رہی ہیں باری باری

جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی

اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے
اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے

ہے ان میں کوئی ملہار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی

گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا

اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں
تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں

گھڑ ناؤ پہ ہے سوار کوئی
اور تیر کے پہنچا پار کوئی

بگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی
مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی

چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے
دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے

زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی
موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی

ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں
موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں

ملاحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان
بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان

منجدھار کی رو بھی زور پر ہے
مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

***

بے زار اک اپنی جان وتن سے[13]
بچھڑا ہوا صحبت وطن سے

غربت کی صعوبتوں کا مارا
چلنے کا نہیں جس کو یارا

غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو
اک باغ میں ہے پڑا لب جو

ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی
آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا
اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

برق آ کے لگی تڑپنے پیہم
اور پڑنے لگی پھوار کم کم

آنے جو لگے ہوا کے جھوکے
تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

سامان ملے جو دل لگی کے
یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا — اور جوش میں آ کبھی یہ گانا
اے چشمہ آبِ زندگانی — گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری — بستی ہے اسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو — دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اول کہیو سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمھاری آئی برکھا
آتا ہے تمھارا دھیان جس دم — مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یونہی صبح و شام اکثر — تالاب میں تیرتے تھے جا کر
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے — صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہی ہات میں دیے ہات — پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا — میں تم کو ادھر ادھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو — دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار — جی اپنا ہے ایسی رت سے بے زار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی — چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو سلگتی — پر دل میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد — جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی — فریاد یہ درد ناک اس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز — پکڑا دل سن کے اس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر — روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی — نکلا وہ ہمارا دوست حالی

3 نشاط امید

(سنہ تصنیف: 1874، ہیئت: مثنوی، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

اے مری امید مری جاں نواز
اے مری دل سوز مری کارساز

میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں میری تکیہ گاہ

عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

کاٹنے والی غم ایام کی
تھامنے والی دل ناکام کی

دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ
تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ

تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ
تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج
کھول دیے تو نے قناعت کے گنج

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس
تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطر رنجور کا درماں ہے تو
عاشق مہجور کا ایماں ہے تو

نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو
چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو

رام کے ہمراہ چڑھی بن میں تو
پانڈو کے بھی ساتھ پھری رن میں تو

تو نے سدا قیس کا بہلایا دل
تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل

ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام
پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام

تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس
ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب
مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

ہاتھ میں جب آ کے لیا تو نے ہات
سات سمندر سے گزرنا ہے بات

ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم
کہتا ہے وہ یہ ہے عرب وہ عجم

گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ
سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ

عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست
گنبد گردوں نظر آتا ہے پست

تو نے دیا آ کے اُبھارا جہاں　　سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں
ذرے کو خورشید میں دے تو کھپا　　بندے کو اللہ سے دے تو ملا

***

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ　　دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ
نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم اساس　　تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس
دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو　　تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو
خشک تھا بن تیرے درختِ عمل　　تو نے لگائے ہیں یہ سب پھول پھل
دل کو لبھاتی ہے کبھی بن کے حور　　گاہ دکھاتی ہے شرابِ طہور
نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا　　روز نرالا ہے تماشا ترا
کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل　　جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال وقیل
روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ　　ہے کہیں فردوس کہیں ہے سرگ
چھوٹ گئے سارے قریب اور بعید　　ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی اُمید
تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت　　تیرے ہی صدقے سے ملا تاج وتخت
خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند　　تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند
تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں　　تو نہ ہو تو ہے ابھی برہم جہاں
کوئی پڑا پھرتا ہے بہر معاش　　ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش
ایک تمنا میں ہے اولاد کی　　ایک کو دل دار کی ہے لو لگی
ایک کو ہے دھن کہ جو کچھ ہاتھ آئے　　دھوم سے اولاد کی شادی رچائے
ایک کو کچھ آج اگر مل گیا　　کل کی ہے یہ فکر کہ کھائیں گے کیا
قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک　　جس میں ہو ان کے لیے انجام نیک
ایک کو ہے تشنگی قرب حق　　جس نے کیا دل سے جگر تک ہے شق
جو ہے غرض اس کی نئی جستجو　　لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو
تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ　　گل کوئی ہونے نہیں پاتا چراغ

سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد
کہتی ہے جب تو کہ اب آئی مراد

وعدہ ترا راست ہو یا ہو دروغ
تو نے دیے ہیں اسے کیا کیا فروغ

وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو
رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو

بھاتی ہے سب کو تری لیت و لعل
تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل

تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے
بزم عزا کو طرب آگیں کرے

آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس
رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس

یاس کا پاتی ہے جو تو کچھ لگاؤ
سیکڑوں کرتی ہے اُتار اور چڑھاؤ

آنے نہیں دیتی دلوں پر ہراس
ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس

جن کو میسر نہیں کملی پھٹی
خوش ہیں توقع پہ وہ زر بفت کی

چٹنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ
بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ ذوق
گھوڑا جو سبز ہو تو نیلا ہو طوق

فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب
دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب

تیرے کرشمے ہیں غضب دل فریب
دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب

تجھ سے مہوس نے جو شوریٰ لیا
پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا

دل سے بھلایا زن و فرزند کو
لگ گیا گھن نخلِ برومند کو

کھانے سے پینے سے ہوا سرد جی
ایسی کچھ اکسیر کی ہے لو لگی

دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام
دھن ہے یہی رات دن اور صبح شام

دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا
شہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا

پیسے کو جب تاؤ پہ دیتا ہے تاؤ
پوچھتا یاروں سے ہے سونے کا بھاؤ

کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر
''رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر''

ہے اسی دھندے میں وہ آسودہ حال
تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال

تول کے گر دیکھیے اس کی خوشی
کوئی خوشی اس کو نہ پہنچے کبھی

پھرتے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت
جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت

آج جو برتن ہیں تو کل گھر گرو
ملتی ہے مشکل سے انھیں نانِ جو
تیرے سوا خاک نہیں ان کے پاس
ساری خدائی میں ہے لے دے کے آس
پھولے سماتے نہیں اس آس پر
'صاحب عالم' انھیں کہیے اگر
کھاتے ہیں اس آس پہ قسمیں عجیب
''جھوٹے کو ہو تخت نہ یا رب نصیب''

***

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم
آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے
حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ
عرصہ عالم نظر آتا ہے تنگ
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھایئے
پھاڑ کے یا کپڑے نکل جایئے
بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح
یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا
اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی
ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل
کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں
رختِ سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی
ہو گئی کافور سب افسردگی
تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے اُمید

4 حب وطن

(ایضاً)

اے سپہرِ بریں کے سیارو
اے فضائے زمیں کے گل زارو
اے پہاڑوں کی دل فریب فضا
اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمہ سحری
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھوکو
دہر ناپائیدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے ساماں تھے — تم مرے دردِ دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی — تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن اک اک تمھاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غم خواری — دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے — ہو کے خوش حال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب — دھوکے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بے زار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیر گلشن ہے جی کا اک جنجال — شب مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لب دریا — جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں — تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور — یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا — پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

***

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے مورد آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا — ان کو کیا ہو گا زندگی کا مزا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال — تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے؟
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار — یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار؟
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں؟ — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو — مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کو نمو تجھ سے — روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشوونما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

***

حملہ جب قوم آریا نے کیا — اور بجا ان کا ہند میں ڈنکا
ملک والے بہت سے کام آئے — جو بچے وہ غلام کہلائے
شدر کہلائے راکشس کہلائے — رنج پردیس کے مگر نہ اٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبا — نہ چھٹا ان سے دیس، پر نہ چھٹا

***

قدر اے دل وطن میں رہنے کی — پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا رام چندر کو بن باس — اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس
باپ اک حکم رکھ لیا سر پر — پر چلا ساتھ لے کے داغ جگر
پاؤں اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف — اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گزرے غربت میں اس قدر مہ وسال — پر نہ بھولا اجدھیا[14] کا خیال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا — دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا — آتی تھی جب اجدھیا کی ہوا
کٹنے چودہ برس ہوئے تھے محال — گویا ایک ایک جگ تھا ایک اک سال

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی سید بطحیٰ کے ہم راہی
رشتے اُلفت کے سارے توڑ چلے اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے ساماں پر نہ بھولے وطن کے ریگستاں
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے سنگریزے زمین بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کی چھوٹا تھا دل سے رشتہ نہ ان کا ٹوٹا تھا

***

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور اور ہوا ملک مصر پر مامور
مصر میں چار سو تھا حکم رواں آنکھ تھی جانب وطن نگراں
یاد کنعاں جب اس کو آتی تھی سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اُٹھائے تھے جس وطن میں سخت تاج بھاتا تھا اس بغیر نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت بے مہری لو تھی ان بھائیوں کی دل کو لگی

***

ہم بھی حب وطن میں گو ہیں غرق ہم میں اور ان میں ہے مگر یہ فرق
ہم ہیں نامِ وطن کے دیوانے وہ تھے اہل وطن کے پروانے
جس نے یوسف کی داستاں ہے سنی جانتا ہو گا روئداد اس کی
مصر میں قحط جب پڑا آ کر اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر
کر دیا وقف ان پہ بیت المال لب تک آنے دیا نہ حرفِ سوال
کھتّیاں 15 اور کوٹھے کھول دیے مفت سارے ذخیرے تول دیے
قافلے خالی ہاتھ آتے تھے اور بھر پور یاں سے جاتے تھے
یوں گئے قحط کے وہ سال گزر جیسے بچوں کی بھوک وقتِ سحر

***

اے دل! اے بندہ وطن ہشیار!
خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

او شرابِ خودی کے متوالے
گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

نام ہے کیا اسی کا حب وطن
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے
کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے

یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
لو کبھی اہل شہر کی ہے لگی

نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار
پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار

کیا وطن کی یہی محبت ہے؟
یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے؟

اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ[16] فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آ کے کابل سے یاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بارور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دور
اس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے لالے ان کی پڑتے ہیں

گائے یا بھینس، اُونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہیے حب وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کم تر

***

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد

جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

سمجھے ان کی خوشی کو راحت جاں
واں جو نو روز ہو تو عید یہاں

رنج کو ان کے سمجھے مایہ غم
واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم

بھول جائے سب اپنی قدر جلیل   دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل
جب پڑے ان پہ گردشِ افلاک   اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

***

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!   اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو!
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ   ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ   دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک   کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ   ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار   زندگی سے ہے جن کا دل بے زار
نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا   ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو   واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی   جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پنہاؤ   کہ ہے اترن تمھاری جن کا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ وثمر   ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند   کوئی آزردہ ہے کوئی خورسند
مقبلو! مدبروں کو یاد کرو   خوش دلو! غم زدوں کو شاد کرو
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ   تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر   لو جو لی جائے کور و کرّ کی خبر
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو   لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو
تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ   رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر   نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو   بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی   جین مت ہووے یا ہو بیشنوی [17]

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اُکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام — کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام
ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم — پڑتی جو سر پہ وہ اٹھاتے تم
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے — چین کس کو ملا ہے غیروں سے

***

قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ — سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ
اہل دولت کو ہے یہ استغنا — کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
شہر میں قحط کی دہائی ہے — جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے
بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا — موت کی مانگتا ہے کوئی دعا
بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں — رو کے ماں باپ کو رلاتے ہیں
کوئی پھرتا ہے مانگتا در در — ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر
پر جو ہیں ان میں صاحب مقدور — ان میں گنتی کے ہوں گے ایسے غیور
کہ جنھیں بھائیوں کا غم ہو گا — اپنی راحت کا دھیان کم ہو گا
جتنے دیکھو گے پاؤ گے بے درد — دل کے نا مرد اور نام کے مرد

عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات — عید ہے دن تو شب برات ہے رات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے — کام انھیں اپنے حلوے مانڈے سے
ان کو اب تک خبر نہیں اصلا — شہر میں بھاؤ کیا ہے غلے کا
غلہ ارزاں ہے ان دنوں کہ گراں — کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں
کال کیا شے ہے کس کو کہتے ہیں بھوک — بھوک میں کیونکہ مرتے ہیں مفلوک
سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے — اس کے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

***

اہل دولت کا سن چکے تم حال — اب سنو روئدادِ اہل کمال
فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد — پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا — ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا
رہتے دو اہل علم ہیں اس طرح — پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح
عیدو والوں لے[18] کا ہے اگر پٹھا — شیخو والوں میں جا نہیں سکتا
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار — خوش نویسوں کو ہے یہی آزار
لاکھ نیکوں کا کیوں نہ ہو اک نیک — دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک
اس پہ طرّہ یہ ہے کہ اہل ہنر — دور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر
ملی اک گانٹھ جس کو ہلدی کی — اس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری
نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے — سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
جس کو آتا ہے پھونکنا کشتہ — ہے ہماری طرف سے وہ گونگا
جس کو ہے کچھ رمل میں معلومات — وہ نہیں کرتا سیدھے منہ سے بات
باپ بھائی ہو یا کہ ہو بیٹا — بھید پاتا نہیں منجّم کا
کام کندلے[19] کا جس کو ہے معلوم — ہے زمانے میں اس کے بخل کی دھوم
الغرض جس کے پاس ہے کچھ چیز — جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز
قوم پر ان کا کچھ نہیں احساں — ان کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں

سب کمالات اور ہنر ان کے / قبر میں ان کے ساتھ جائیں گے
قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی / نام پر کیونکہ جان کھوئے گی
تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے / خواہ بی۔اے ہوں اس میں یا ایم۔اے
بھرتے حب وطن کا گو دم ہیں / پر محبّ وطن بہت کم ہیں
قوم کو ان سے جو امیدیں تھیں / اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں
ہسٹری ان کی اور جوگرفی [20] / سات پردوں میں منہ دیے ہے پڑی
بند اس قفل میں ہے علم ان کا / جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا
لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے / گویا گونگے کا گڑ ہیں کھائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں سیر گل تنہا / کوئی پاس ان کے جا نہیں سکتا
اہل انصاف شرم کی جا ہے / گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے
تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ / تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ
یہ جو دولت تمھارے پاس ہے آج / ہم وطن اس کے ہیں بہت محتاج
منہ کو ایک اک تمھارے ہے تکتا / کہ نکلتا ہے منہ سے آپ کے کیا
آپ شائستہ ہیں تو اپنے لیے / کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیے؟
میز کرسی اگر لگاتے ہیں آپ / قوم سے پوچھیے تو پن [21] ہے نہ پاپ
منڈا [22] جوتا گر آپ کو ہے پسند / قوم کو اس سے فائدہ نہ گزند
قوم پر کرتے ہو اگر احساں / تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش نہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو / پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو
علم کو کردو کُو بہ کُو ارزاں / ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

***

سنتے ہو سامعینِ باتمکیں! / سنتے ہو حاضرینِ صدر نشیں!
جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد / بندہ قوم ان کے ہیں زن و مرد
باپ کی ہے دعا یہ بہرِ پسر / قوم کی میں بناؤں اس کو سپر

ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد　　قوم پر سے نثار ہو اولاد
بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں　　تو اگر مال دے تو میں دوں جاں
اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں　　ہم وطن فائدے اُٹھاتے ہیں
کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری　　دخل اور خرج جن کے ہیں بھاری
اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم　　مبحثِ حکمت و ادب قائم
نت نئے کھلتے ہیں دوا خانے　　بنتے ہیں سیکڑوں شفا خانے
ملک میں جو مرض ہیں عالم گیر　　قوم پر ان کی فرض ہے تدبیر
ہیں سدا اس اُدھیڑ بن میں طبیب　　کہ کوئی نسخہ ہاتھ آئے عجیب
قوم کو پہنچے منفعت جس سے　　ملک میں پھیلیں فائدے جس کے
رسمِ بد کا اثر جہاں پایا　　حملے پر حملہ اس پہ ہونے لگا
کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر　　کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر
ایک ناٹک بنا کے لاتا ہے　　دوسرا اس کو کر دکھاتا ہے
لاکھ تدبیریں جی سے جوڑتے ہیں　　آخر اس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں
قوم کی خاطر ان کے ہیں سب کام　　خواہ اس میں سفر ہو خواہ مقام
سیکڑوں گل رخ اور مہ پارے　　لاڈلے ماں کے، باپ کے پیارے
جان اپنی لیے ہتھیلی پر　　کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر
شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے　　پر کوئی بات کام کی ہاتھ آئے
جس سے مشکل ہو کوئی قوم کا حل　　ملک کا آئے کوئی کام نکل
کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں　　مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں
لکھے، جب تک جیے، سفر نامے　　چل دیے ہاتھ میں قلم تھامے
گو سفر میں اٹھائے رنج کمال　　کر دیا پر وطن کو اپنے نہال
ہیں اب ان کے گواہ حبِ وطن　　در و دیوارِ پیرس و لندن
کہیے دنیا کا جس کو باغ جناں　　ہے فرانس آج یا ہے انگلستاں

کام ہیں سب بشر کے، ہم وطنو! تم سے بھی ہو سکیں جو مرد بنو
چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ
قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں
قافلوں سے اگر ملا چاہو ملک اور قوم کا بھلا چاہو
گر رہا چاہتے ہو عزت سے بھائیوں کو نکالو ذلت سے
ان کی عزت تمھاری عزت ہے ان کی ذلت تمھاری ذلت ہے
قوم کا مبتذل ہے جو انساں بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز
عزت قوم چاہتے ہو اگر جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
اب نہ سید کا افتخار صحیح نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
ہوئی ترکی تمام خانوں کی کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

5 مناظرہ رحم وانصاف

(ایضاً)

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیک نامی سے تری سخت تحیر ہے ہمیں ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں
دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کا کام نہیں آنکھ میں تیری مروت کا کہیں نام نہیں
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں

قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری
سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے

فوج راون کی لڑائی میں کھپائی کس نے؟
آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے

قید خانوں میں جہاں کے ہے پڑا غل تیرا
جتنے قیدی ہیں تری جان کو دیتے ہیں دعا

تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوئے سرتن سے جدا
اور ترے حکم سے لاکھوں ہوئے مسکن سے جدا

لطف ہے تیری طبیعت میں نہ کچھ جوش وغضب
تجھ کو خوردوں پہ ہے شفقت نہ بزرگوں کا ادب

کانپتے آتے ہیں محفل میں تری شاہ و گدا
تجھ سے تھراتے ہیں احباب ہوں یا ہوں اعدا

جان پہچان کا ساتھی ہے نہ انجان کا دوست
یار ہندو کا ہے تو اور نہ مسلمان کا دوست

نہیں جائز ترے مذہب میں کسی کی امداد
تیرے نزدیک برابر ہے غلام اور آزاد

دم میں تو صحبت دیرینہ بھلا دیتا ہے
دوستی خاک میں برسوں کی ملا دیتا ہے

طور برتاؤ کا ہے سب سے نرالا تیرا
تجھ سے روکھا کوئی دنیا میں نہ دیکھا نہ سنا

ہٹ پہ تو اپنی جہاں نام خدا آ جائے
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کا گلا کٹوائے

اسی کرتوت پہ اے عدل! یہ دعوے ہیں تجھے
کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے

ایک تو ہے کہ یگانوں کے ہیں دل تجھ سے فگار
ایک میں ہوں کہ نہیں غیر بھی مجھ سے بے زار

رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا
فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا

حق کی الطاف و عنایت کا بہانہ ہوں میں
خلق کی کام روائی میں یگانہ ہوں میں

میری سرکار میں ہو جاتے ہیں سب عذر قبول
میرے دربار سے جاتے نہیں مجرم بھی ملول

لطف ہے عام سدا اہل خطا پر میرا
ہاتھ اٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

غم مرے سامنے شادی سے بدل جاتے ہیں
ہنستے جاتے ہیں جو یاں روتے ہوئے آتے ہیں

مجرئی شرم و مروت مرے دربار کے ہیں
بخشش و جود ملازم مری سرکار کے ہیں

موج زن ہوتا ہے جب فیض کا میرے قلزم
یاس ہو جاتی ہے انبوہ میں امید کے گم

مصر میں قید سے یوسفؑ کو نکالا میں نے
اور ایوبؑ کے بیڑے کو سنبھالا میں نے

میں ہر اک درد میں ہو جاتا ہوں انساں کے شریک
میں نہ ہوتا تو نہ دیتا کوئی محتاج کو بھیک

میں ہی دیتا ہوں تییموں کو سہارا جا کر
میں ہی لیتا ہوں برے حال میں رانڈوں کی خبر

میرے ہی دم سے ہے آدم کا نمونہ باقی
میرے ہی دم سے ہے عالم میں نمودِ بشری

ورنہ انسان کہ ہے جرم و خطا کا پتلا
میں نہ ہوتا تو بھلا اس کا ٹھکانا کیا تھا

بیڑا فرعون کا جب غرق فنا ہوتا تھا
میں وہاں ساحل دریا پہ کھڑا روتا تھا

تجھ سے ہوتے اگر اے عدل جہاں میں دو چار
لٹ گئی ہوتی کبھی کی مرے گلشن کی بہار

***

جب سنا رحم سے یہ ولولہ انگیز خطاب
کہا انصاف نے ہو حکم تو دوں اس کا جواب

آپ کی نیکیوں سے کس کو ہے انکار یہاں
کیوں کہ ہے ذکرِ جمیل آپ کا مشہور جہاں

مگر اے رحم! برا ماننے کی بات نہیں
نیکیاں آپ کو کر دیں نہ یہ بدنام کہیں

ہم نے مانا کہ مروت بھی بڑی ہے اک چیز
پر مروت کے لیے شرط ہے اے دوست! تمیز

کھو دیا، جس نے مروت کو یہاں عام کیا
اس کو رسوا کیا اور آپ کو بدنام کیا

بول بیٹھے نہیں، آفت کے یہ پر کالے ہیں
اس مروت نے تری سیکڑوں گھر گالے ہیں

دوستوں کو ہے اشارہ کہ کسی سے نہ ڈرو
دشمنوں سے یہ مدارا کہ جو چاہو سو کرو

چور چوری سے نہیں ڈرتے بدولت تیری
لیے پھرتی ہے اُچکّوں کو حمایت تیری

جتنے قزاق ہیں یاں ان کا مددگار ہے تو
اور سب ڈاکوؤں کا قافلہ سالار ہے تو

ہوا جس ملک پہ سرکار کا جاری فرماں
اس کو سمجھو کہ ہوا اب کوئی دن میں ویراں

باپ کا حکم نہیں مانتے فرزند رشید
اور نوکر نہیں دیتے کبھی آقا کو رسید

لڑکے استاد کی گھر کی کو نہیں مانتے کچھ
بدمعاش اہل پولیس[23] کو نہیں گردانتے کچھ

اہلکاروں کا کچہری میں جو دیکھو بیوہار[24]
سمجھو دیوان عدالت کو کہ ہے اک بازار

پیٹ پکڑے ہوئے واں پھرتے ہیں حاجت والے
روا منہ کھولے ہوئے بیٹھے عدالت والے

نہیں حاکم کی مروت سے انھیں خوف مآل
''بول کیا لایا ہے؟'' اظہار کا پہلا ہے سوال

ہر طرف بیچ میں دلال ہیں کچھ چھوٹ رہے
دونوں ہاتھوں سے غرض مندوں کو ہیں لوٹ رہے

یوں تو اے رحم تری ذات میں جوہر ہیں بہت
خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت

ایک رہ زن کو جو تو قید سے چھڑواتا ہے
بیسیوں قافلوں کو جان کے لٹواتا ہے

باپ کو ہونے نہیں دیتا جو بیٹے سے خفا
بے ادب رکھنا اسے چاہتا ہے تو گویا

مار پر اُٹھنے نہیں دیتا جو استاد کا ہاتھ
یہ سلوک اچھے نہیں ہیں ترے شاگرد کے ساتھ

میٹھی باتوں میں تری زہر ہلاہل ہے بھرا
تیرا آغاز تو اچھا ہے پہ انجام برا

کاش تو بھی مرے قانون پہ چلتا اے رحم
اپنے اندازے سے باہر نہ نکلتا اے رحم

بے مروت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا
جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

راست بازی جو سنی ہو وہ طبیعت ہے مری
اور عدالت جسے کہتے ہیں وہ عادت ہے مری

معتدل نام ہے جس کا وہ مزاج اپنا ہے
بھاگ اس ملک سے جس ملک میں راج اپنا ہے

میں ہی تھا جس نے کہ ویرانوں کو آباد کیا
میں ہی تھا جس نے کہ اخباروں کو آزاد کیا

حکم سے میرے ہوئی کونسلوں کی ماموری
رائے سے میری بنیں سلطنتیں جمہوری

کھو دیا میں نے نشاں سلطنت شخصی کا
اور دنیا سے غلامی کو مٹا کر چھوڑا

مجلسیں سیکڑوں ملکوں میں بٹھائیں میں نے
راہیں اغلاط سے بچنے کی سجھائیں میں نے

حکم و قانون کسی گھر میں مقید نہ رہا
سلطنت نام ہے اب قوم کی پنچایت کا

جس طرح ظلم کا اے رحم! روادار نہیں
میں اسی طرح سے تیرا بھی مددگار نہیں

سر ذرا جس نے اُٹھایا اسے کھو کر چھوڑا
پاپ کی ناؤ کو دریا میں ڈبو کر چھوڑا

حکم عالم میں مرا شرق سے تا غرب ہے عام
جس نے مانا نہ مرا حکم، رہا وہ ناکام

رائے کرتی نہیں میری کسی حالت میں خطا
تیر لگتا ہے مرا جا کے نشانے پہ سدا

میں دکھا دیتا سیاست کی گر اپنی تلوار
چل نہ سکتا کبھی قابیل کا ہابیل پہ وار

کارفرما ہے جہاں میری عدالت اے رحم
دم نہیں مارتی واں تیری مروت اے رحم

واں تعصب کا پتا اور نہ عداوت کا گزر
نہ قرابت کا نشاں اور نہ محبت کا اثر

حکم جاری ہے جدھر دیکھیے آزادی کا
بڑھ کے چلتا نہیں واں شاہ سے لے تا بہ گدا

کج روی مکر سے کہتی ہے میں آئی تو چل
ٹیڑھے ترچھوں کے بل اک آن میں جاتے ہیں نکل

پاک بازوں کو نہیں عہد میں میرے کھٹکا
جو کنونڈرے[25] ہیں وہی مجھ سے کھٹکتے ہیں سدا

سات پردوں میں اگر عیب کسی کا ہے چھپا
نہ ہوا آج تو کل ہو گا مقدر رسوا

ہیں خطا کار کے دشمن در و دیوار یہاں
بھائی بھائی کے نہیں ہوتے مددگار یہاں

اور اگر عیب سے ہے پاک کسی کا دامن
غم نہیں اس کا ہو گر سارا زمانہ دشمن

نہ رعیت کا اسے خوف نہ کچھ شاہ کا ڈر
نہ اسے چور کا خطرہ نہ اسے ساہ[26] کا ڈر

نہ عدالت میں اسے ڈر کسی فریادی کا
اور نہ کچھ دغدغہ اخباروں کی آزادی کا

جو ہنرمند ہیں دل ان کے بڑھاتا ہوں میں
خوبیاں ان کی زمانے میں جتاتا ہوں میں

بے ہنر ہو کسی پیرائے میں یاں جلوہ نما
عہد میں میرے ہنرمند نہیں بن سکتا

یاں نہ استاد کو شاگرد کی اصلاح سے عار
اور نہ شاگرد کو اپنی غلطی پر اصرار

سنتے جاہل سے ہیں گر فائدے کی بات حکیم
مستمندوں کی طرح کرتے ہیں اس کو تسلیم

نوکر آقا کی جتاتا ہے اگر کوئی خطا
بن نہیں آتا کچھ آقا سے ندامت کے سوا

کرنے پاتے نہیں گاہک پہ دکاں دار ستم
جنس یاں تل نہیں سکتی کبھی مقدار سے کم

بیل بے وجہ نہیں آر کسی کی کھاتا
سدھ منے گھوڑے پہ چابک نہیں اُٹھنے پاتا

اُونچے اُونچوں سے یہاں لیتے ہیں خدمت پوری
اور مزدوروں کو دیتے ہیں کھری مزدوری

محنتی جتنے ہیں یاں خرم و دل شاد ہیں سب
خوار پھرتے ہیں وہی جو کہ ہیں آرام طلب

اہل مقدور کو کھٹکا نہیں کچھ چوروں سے
زورمند آنکھ ملاتے نہیں کم زوروں سے

خوب کو خوب سمجھتے ہیں یہاں زشت کو زشت
ناپ سے کم نہیں لگتی کہیں تعمیر میں خشت

جھوٹے سچوں کا نہیں بھیس بدلنے پاتے
دام بازار میں کھوٹے نہیں چلنے پاتے

جس طرف جایئے واں امن واماں کا ہے عمل
فتنہ سرحد سے مری جاتا ہے کترا کے نکل

جس قلم رو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں
ظلم کے ہاتھ میں واں فکر و عمل کی ہے عناں

دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب[27] وہاں
اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں

نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو حلقہ بگوش
رام لچھمن کی طرح پھرتے ہیں واں خانہ بدوش

مان رکھا ہے جنھیں قوم نے اولاد رسولؐ
قوم کے ہاتھ سے ہو جاتے ہیں پیاسے مقتول

زکریاؑ کی طرح جو ہیں خدا کے پیارے   ان کے سر پر ہیں سدا ظلم کے چلتے آرے
زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں   اور یوسفؑ سے برادر کو دغا دیتے ہیں

***

گفتگو ختم پہ انصاف کی جب آ پہنچی   عقل پرکار قضا کار وہاں جا پہنچی
واں جو دیکھا تو ہے دو بھائیوں میں کچھ تکرار   اور ہر اک کو بزرگی پہ ہے اپنی اصرار
رحم ادھر عدل سے کہتا ہے کہ تو ہے کیا چیز   اور ادھر رحم کو ہے عدل سمجھتا ناچیز
عقل نے دونوں کی تقریر سنی سر تا پا   کہہ چکے وہ تو یہ سنجیدہ جواب ان کو دیا
خیر اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں   ایک سے ایک ہو تم بہتر و برتر دونوں
صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف   تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف
اور سن اے عدل! نہیں اس میں تکلف سرِ مُو   گر نہ ہو رحم تو اک دیدہ بے نور ہے تو
دونوں تم خلق کے ہو مایہ آرام و شکیب   گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب
سرسری فیصلہ تو یہ ہے اگر تم مانو   اور نہیں مانتے گر بات مری، تم جانو
ابھی اک نکتے میں تم دونوں کو جھٹلاتی ہوں   لو سنو غور سے، میں کہتی ہوں اور جاتی ہوں
فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو   جب کہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو
وہی اک شے ہے کہ ہے عدل کہیں نام اس کا   کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا
رحم کہلائے، جو مظلوم کی فریاد سنے   عدل ٹھہرے، جو سزا ظالم بے رحم کو دے
وہی شفقت ہے کہ استاد کی ہے مار کبھی   اور ماں باپ کی ہو جاتی ہے چمکار کبھی
وہی شفقت ہے کہ ہے گھور کہیں پیار کہیں   وہی جلوہ ہے کہ ہے نور کہیں نار کہیں
کہیں وہ مہر کی صورت میں عیاں ہوتی ہے   اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے
کہیں وہ قندِ مکرر کا مزا دیتی ہے   اور کہیں چاشنی موت چکھا دیتی ہے
یہی شفقت تھی کہ جب اس نے سجھایا انجام   شیخ فاروقؓ نے بیٹے کا کیا کام تمام
یہی شفقت تھی کہ جب ہو گیا بے جان پسر   ایک برچھی سی لگی باپ کے دل میں آ کر
یہی شفقت ہے کہ زخمی کہیں کرواتی ہے   یہی شفقت ہے کہ پھر زخم کو بھرواتی ہے

رحم اور عدل سے جب عقل نے تقریر یہ کی
اور دی ساتھ ہی حالی نے شہادت اس کی

رہی باقی نہ فریقین کو جاے انکار
چار و ناچار کیا یک جہتی کا اقرار

بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ تھے گویا ایک
مل کے ہو جائیں کہیں جیسے کہ دو دریا ایک

6 تعصب وانصاف

(ایضاً)

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا
جب کہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا

اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی
اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی

اپنی ہر آن پہ ہم مرتے تھے
اپنی رعنائی کا دم بھرتے تھے

اپنے انداز کے سودائی تھے
اپنے جلوے کے تماشائی تھے

کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ
سر دُھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ

آپ خوبی پہ تھے اپنی مفتوں
خود ہی لیلیٰ تھے ہم اور خود مجنوں

جس جزیرے میں ہوئے تھے پیدا
اپنی لے دے کے وہی تھی دنیا

روم کی تھی نہ خبر شام کی تھی
آگہی طوس نہ بسطام کی تھی

تھے تماشائی دست پرخار
کبھی گلشن کی نہ دیکھی تھی بہار

پی کے شوراب ہی ہوتے تھے بحال
کہ نہ چکھا تھا کبھی آبِ زُلال

نالہ زاغ و زغن پر تھے فدا
نہ سنی تھی کبھی بلبل کی صدا

سیر و انگوزے[8] کی بو پر تھے نثار
کہ نہ برتا تھا کبھی مشک تتار

پرنیاں جانتے تھے کمبل کو
کہ نہ برتا تھا کبھی مخمل کو

اوپری تھی نہ سنی بات کبھی
بدلے دیکھے تھے نہ دن رات کبھی

ہم بسر کرتے تھے جس عالم میں
واں سماں ایک تھا ہر موسم میں

رخ ہوا کا نہ بدلتا تھا کبھی
موسم آ کر نہ نکلتا تھا کبھی

ایک ہی فصل پہ تھا دار و مدار
واں خزاں جا کے نہ آتی تھی بہار

ایک سے رہتے تھے دن رات سدا
آسماں کو تھی نہ گردش اصلا

تھی سمجھ پیر و جواں کی یکساں
عقل تھی خرد و کلاں کی یکساں

رکھتے تھے ایک سبق ازبر یاد
مبتدی، منتہی، شاگرد، استاد

واں نہ تھی حدِّ بلوغِ صبیاں
پیر بالغ تھے، نہ بالغ تھے جواں

نئ بولی کا وہاں صرف نہ تھا
تیس حرفوں کے سوا حرف نہ تھا

تھے خدا کے وہی ننیانوے نام
اور لینا تھا وہاں نام حرام

اہلِ دولت کی نہ تھی عام عطا
ایک ہی سمت برستی تھی گھٹا

تھا نہ دین داروں کو غیروں سے لگاؤ
ایک ہی سمت تھا رحمت کا جھکاؤ

دعوے غیروں کے تھے سب بےصرفہ
فیصلے ہوتے تھے نت یک طرفہ

راستی کا نہ تھا غیروں پہ گماں
حق نہ دائر تھا فریقین میں واں

تھی عناصر میں نہ واں آگ نہ باد
خلق سے اک موئی مٹی تھی مراد

حس و حرکت کے کوئی پاس نہ تھا
واں کا حیوان بھی حساس نہ تھا

تھی درختوں کو نہ واں نشو و نما
چلنے پاتی تھی نہ گلشن میں ہوا

گل شگفتہ تھے نہ پودے شاداب
واں زمانے پہ نہ آتا تھا شباب

وہی مرغوب تھی واں پوشش تن
جس سے آدمؑ نے چھپایا تھا بدن

تھے پسندیدہ اسی شان کے گھر
کی تھی حوا نے جہاں عمر بسر

اسی انداز کے چلتے تھے جہاز
کشتیِ نوح کا جو تھا انداز

تھی اسی نسخے پہ موقوف شفا
جو تھا بقراط نے ترتیب دیا

ٹوٹ سکتی نہ تھی واں راے قدیم
تھا امٹ لکھ گئے جو اگلے حکیم

واں کسی طرح نہ ممکن تھا خلا
واں نہ پانی تھا مرکب نہ ہوا

گھوڑے دوڑائے تھے اگلوں نے جہاں
وہی جولاں گہ مردم تھی وہاں

کی تھی جس جا قدما نے منزل
بڑھنے پاتے تھے نہ واں سے محمل

علم و فن تھے نئے سارے مردود
غیب کے واں تھے خزانے محدود

نئی لذت سے تھی ہر طبع نفور　　نعمتیں حق کی وہاں تھیں محصور
سب کی گدّی پہ لگی تھیں آنکھیں　　کچھ نہ آگے نظر آتا تھا انھیں
پیچھے گر دیکھتے تھے ریگستاں　　سوجھتا تھا انھیں وہ آبِ رواں
آگے ہوتا تھا اگر چشمہ آب　　وہ سراسر نظر آتا تھا سراب
روشنی رکھتی تھی ان سے ان بن　　جیسے خفّاش سے سورج کی کرن
تھا لکیر اپنی پہ ایک ایک فقیر　　دل پہ ہر نقش تھا پتھر کی لکیر
رسم و عادت نہ بدلتی تھی وہاں　　برف جم کر نہ پگھلتی تھی وہاں
آگ واں بجھ کے سلگتی کم تھی　　اور سلگتی تھی تو لگتی کم تھی
شان میں واں نہ سنا تھا حق کی　　"کل یوم ھو فی شان "[29] کبھی
وضع میں تھا نہ تغیّر خو میں　　جاے دل سنگ تھا ہر پہلو میں
سمجھا جاتا تھا وہ دل بے فرماں　　مہر جس دل پہ نہ ہوتی تھی وہاں
بات مشکل تھی دلوں سے جانی　　نقش تھے دل کے خط پیشانی
غیر کی بات خطا، اپنی صواب　　سب سوالوں کا تھا واں ایک جواب
چڑھ کے گر بحث کو جاتے تھے کہیں　　فتح کا پہلے سے ہوتا تھا یقیں
تھی وہاں حق کی یہی ڈیفینیشن [30]　　منہ سے جو اپنے نکل جائے سخن
اسی عالم میں پلے تھے ہم بھی　　اسی ساون کے تھے اندھے ہم بھی

***

جانتے تھے کہ جہاں میں ہم پر　　ختم ہیں سارے کمالات بشر
حق نے جو ہم پہ کیے ہیں احساں　　ان سے محروم ہے نوعِ انساں
سب سے ہر بات میں ہم ہیں افضل　　اب نہیں کوئی ترقی کا محل
اپنے حصے میں ہے ساری تہذیب　　خانہ پرور ہے ہماری تہذیب
جو قدیم اپنا چلن ہے اور چال　　خردہ گیری کی نہیں اس میں مجال
ہے بری عیب سے خوراک اپنی　　پاک دھبے سے ہے پوشاک اپنی

رسم اپنی نہیں بے جا کوئی
طور اپنا نہیں بھونڈا کوئی

آدمیت کے ہمی ہیں مصداق
ہم سے سیکھے کوئی حسنِ اخلاق

سب سے عالی ہیں خیالات اپنے
سب مسلّم ہیں کمالات اپنے

ہم چلے جاتے ہیں جس رستے پر
واں نہ کھٹکا ہے کہیں کا نہ خطر

تھے سمائے ہوئے جو دل میں خیال
تھا تصور بھی خلاف ان کے محال

جس کو اک بار برا جان لیا
عمر بھر پھر اسے اچھا نہ کہا

ٹوٹتی تھی نہ کبھی اپنی دلیل
وہی دعویٰ تھا وہی اپنی دلیل

وہم و شک کی کوئی صورت ہی نہ تھی
ہم کو تحقیق کی حاجت ہی نہ تھی

جو بدلتی تھی نہ بدلی تھی کبھی
رائے ایسی تھی، پسند ایسی تھی

ہم سمجھتے تھے نہ سمجھانے سے
اور اُلجھ جاتے تھے سلجھانے سے

سچ وہی تھا جسے سچ جان لیا
جھوٹ تھا، جھوٹ جسے مان لیا

حق و باطل کی یہی تھی میزان
جھوٹ اور سچ کی یہی تھی پہچان

ذات باری کو نہیں جیسے زوال
رائے اپنی بھی بدلنی تھی محال

کوہ ہٹ جائے تو یہ تھا ممکن
ہم نہ ہٹتے تھے جگہ سے لیکن

حسن ظن تھا یہ سمجھ پر اپنی
غلطی کا تھا گماں تک نہ کبھی

تھے لڑکپن کے خیالات تمام
دل میں اُترے ہوئے شکل الہام

دیکھتے سنتے تھے جو اس کے خلاف
نظر آتا تھا وہ سب لاف وگزاف

تھی نئی بات سے یاں تک نفرت
ہوتی تھی سننے سے پہلے وحشت

بو نئی شے کی جو پا لیتے تھے
ناک بن دیکھے چڑھا لیتے تھے

عقل کی تھیں نہ صلاحیں مقبول
تھی وہ سرکار میں اپنی معزول

فکر پر زور نہ ڈالا تھا کبھی
ہوش ہم نے نہ سنبھالا تھا کبھی

جو کہ تھا اپنی کتابوں میں لکھا
کوئی حرف اس میں جز الہام نہ تھا

جو کہانی تھی بزرگوں نے کہی
تھا وہی فلسفہ اور علم وہی

تھا لباسوں میں لباس اپنا لباس
اور سب سوختنی بے وسواس

تھی زباں اپنی زبانِ پاکاں
ماسوا، اہل جہنم کی زباں

جلوہ دہر کا باقی تھا نہ ہوش
تھے نشے میں یہ خودی کے مدہوش

کان میں پڑتی تھی جب بات نئی
غیر ہو جاتی تھی حالت دل کی

خرق عادت بھی اگر دیکھتے تھے
آنکھ اُٹھا کر نہ ادھر دیکھتے تھے

نئی آواز سے چونک اُٹھتے تھے
اوپری شکل پہ بھونک اُٹھتے تھے

ساری دنیا سے نرالا تھا مذاق
ہم کو تھا زہر بھی اپنا تریاق

اپنی حجت کو قوی جانتے تھے
بات ہر پھر کے وہی مانتے تھے

تھا نہ قصدِ حق و باطل مطلق
جو پڑھا تھا وہی از بر تھا سبق

خصم سے بحث اگر کرتے تھے
حق سے ہم قطع نظر کرتے تھے

کاٹ دی خصم نے جو بات کہی
بحث و تکرار کی غایت تھی یہی

خصم کی بات کو کرنا تسلیم
اپنے نزدیک ہزیمت تھی عظیم

حق کا خطرہ جو کبھی آتا تھا
نفس آپ اپنے کو جھٹلاتا تھا

دشمنی کے یہی معنے تھے کہ جو
ہم کہیں بات وہ تسلیم نہ ہو؟

ہم اندھیرے کو اگر کہتے تھے نور
دوستوں کو یہی کہنا تھا ضرور

گر خلاف اپنے کوئی بول اٹھا
اس سے بڑھ کر کوئی بدخواہ نہ تھا

ذکر غیروں کا نہ تھا بے نفریں
کوئی مردود تھا اور کوئی لعیں

غیر کے واسطے تھی نارِ سعیر
باغِ فردوس تھی اپنی جاگیر

اور تھے حرص و ہوا کے بندے
ہم تھے مخصوص خدا کے بندے

بخششیں ختم تھیں ساری ہم پر
وقف تھی رحمت باری ہم پر

نیک اعمال تھے غیروں کے تباہ
اور مغفور تھے سب اپنے گناہ

عین تحقیق تھی اپنی تقلید
شرک اپنا تھا سراسر توحید

تھا بدی کا نہ گنہ کا کچھ ڈر
پاس ایسی کوئی رکھتے تھے سپر

سب دعا گو تھے ہمارے ملکوت — تھے ہمیں آدم و حوا کے سپوت
حوض کوثر پہ تھا قبضہ اپنا — سلسبیل اپنی تھی طوبیٰ اپنا
اپنی ظلمت تھی سراسر تنویر — اپنے اندھوں کو بھی کہتے تھے بصیر
رکھتے جنت میں نہ تھے ہم ساجھی — غیر ناری تھے سب اور ہم ناجی
تھے قضا اور قدر کے مالک — ہم تھے اللہ کے گھر کے مالک

***

صحبت میں رہے جب تک چور — کھنچتے یوں ہی رہے آپ کو دور
نظر آتا تھا نہ کچھ پست و بلند — تھے ہم اک کلبہ تاریک میں بند
دی جب انصاف نے دستک آ کر — حجرۂ تنگ سے نکلے باہر
جلوۂ علم و یقیں کو دیکھا — آسماں اور زمیں کو دیکھا
رخ حقیقت نے دکھایا ہر سو — چندنا سا نظر آیا ہر سو
کی تعصب سے جونہی قطع نظر — ہوا اک اور ہی عالم میں گزر
علم پر تھا نہ جہاں کوئی حجاب — دھوکا پانی کا نہ دیتا تھا سراب
جھوٹ سے سچ نظر آتا تھا الگ — دودھ پانی نظر آتا تھا الگ
نکتہ چیں یار تھے واں یاروں کے — قدر داں غیر تھے اغیاروں کے
دور بیگانہ نہ تھے خویش سے واں — خویش اول تھا نہ درویش سے واں
عیب سب کہتے تھے اپنے خوش خوش — دوغ واں اپنی بھی ہوتی تھی ترش
تھی نجس کوئی نہ انساں کی زباں — گاڈ بھی کہتے تھے اللہ کو واں
حق کی پہچان جز اخلاص نہ تھی — حق کی پوشش کوئی واں خاص نہ تھی
ساتھ اغیار کے کھاتے تھے اگر — کبھی ایماں کا نہ ہوتا تھا ضرر
صلحا لمپ جلاتے تھے وہاں — اتقیا میز پہ کھاتے تھے وہاں
نہ سمجھتا تھا وہاں کوئی بشر — آپ کو نوعِ بشر سے بہتر
بھائی انساں تھے سب انسانوں کے — میت ہندو تھے مسلمانوں کے

ایک معدن کے تھے سب لعل و گہر — ایک ڈالی کے تھے سب برگ و ثمر
اشعری، معتزلی[31] لا مذہب — ایک ماں باپ کی اولاد تھے سب
اپنی ہر رائے پہ کرنا اصرار — کفر واں بس یہی پایا تھا قرار
ہٹ سے باز آتے نہ تھے جو زنہار — تھے وہ بوجہل کی امت میں شمار
پاؤں واں جن کے پھسل جاتے تھے — خود پھسل کر وہ سنبھل جاتے تھے
نٹیڑھ واں دل کی نکل سکتی تھی — رائے اپنی بھی بدل سکتی تھی
دیکھ حجت کو قوی پیر و جواں — بند ہو جاتے تھے بچوں سے وہاں
حق کی آواز جہاں آتی تھی — مت کروڑوں کی بدل جاتی تھی
پاک عقلیں تھیں خطا سے نہ علوم — جز نبی کوئی نہ تھا واں معصوم
غور ہر بات میں کی جاتی تھی — مشورت عقل سے لی جاتی تھی
تھی وہاں عقل معطل نہ حواس — سب قوی کام میں تھے بے وسواس
آنکھ رہ سکتی نہ تھی بن دیکھے — کان سننے سے نہ باز آتے تھے
سوجھتی تھی جو انوکھی کوئی چیز — جانچتی تھی اسے واں چشم تمیز
سنتے تھے بات نرالی جس دم — کستے تھے اس کو محک پر پیہم
کڑوے اور میٹھے کو چکھ لیتے تھے — کھرے کھوٹے کو پرکھ لیتے تھے
پھول ہر خار سے چن لیتے تھے — بھوگ[32] نیچوں کے بھی سن لیتے تھے
عادتیں سب کی بدلتی ہیں سدا — ایک اللہ کی عادت کے سوا
عیب جس رسم میں پا لیتے تھے — دل وہیں اس سے ہٹا لیتے تھے
اُجلی پوشاک جو مل جاتی تھی — ملگجے کپڑوں سے شرم آتی تھی
دیکھ لی جس نے کہ شمع کافور — تھا وہ چیکٹ بھرے ڈیوٹ سے نفور
ہاتھ آ جاتا تھا جب مال نیا — پھینک سب دیتے تھے عطار دوا
گر کے ہو جاتے تھے گھر جن کے کھنڈر — گھر کی واجب تھی مرمت ان پر
نت نئی ریت نکلتی تھی وہاں — رُت سماں روز بدلتی تھی وہاں

قافلے چلتے تھے دن رات تمام — کسی منزل پہ نہ کرتے تھے مقام
قبلہ تھا علم الٰہی ان کا — تھا سفر لامتناہی ان کا
تشنہ علم تھے واں سب ایسے — پیاسے پانی کے ہوں طالب جیسے
نہ 'مجسطی' پہ قناعت تھی انھیں — نہ 'اشارات' کفایت تھی انھیں
عرش تحقیق تھا استھان ان کا — مصر تیرتھ تھا نہ یونان ان کا
دیکھا جب عالم انصاف کا رنگ — ہم کو خود آنے لگا آپ سے ننگ
خوبیاں اپنی تھیں جو ذہن نشیں — ان پہ ہم کرنے لگے خود نفریں
عیب سب اپنے نظر آنے لگے — آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے
ہوئی وہ بزمِ خیالی برہم — تھا طلسمات کا گویا عالم
جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا — اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا
تھا کیا جس کو یقیں چشمہ آب [33] — وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب
قصر و ایواں کا گماں تھا جن پر — نکلے آخر وہ گڑھے اور کھنڈر
تھا سبک دانہ خر دل سے سوا [34] — کوہ الوند جسے سمجھا تھا
جب ہر ایک قوم کا ساماں دیکھا [35] — ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا
نکلے سب ہیچ خیالات اپنے — ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے
آپ کو اونٹ سمجھتا تھا بڑا — نکلا جب تک کسی گھاٹی سے نہ تھا
چوٹیاں آئیں جو پربت کی نظر — پھر اُٹھایا نہ کبھی اونٹ نے سر
بھنگا [36] جب تک رہا گولر میں نہاں — تھا وہی اس کے تصور میں جہاں
پر وہ گولر سے جو باہر آیا — اپنی ہستی سے بہت شرمایا
پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا — حسن پر اپنے گماں تھے کیا کیا
منہ جب آئینے میں دیکھا جا کر — ہم کو اک شکل مہیب آئی نظر
ہوا حیرت سے دگرگوں احوال — ڈر گئے دیکھ کے اپنے خط و خال
دیکھا جب آپ کو بالکل معیوب — چھپ گئے غیروں کی آنکھوں کے عیوب

یک قلم ہو گئی نخوت کافور — بن گیا رشک ہمارا وہ غرور
ناخن فکر نے کی دل میں خراش — عیب جویوں کی لگے کرنے تلاش
جن کے طعنوں کی تھی ہم پر بھر مار — ان کے ہم دل سے ہوئے شکر گزار
ہم نے جانا کہ یہی ہیں دل سوز — چل رہے تیر ہیں جن کے دل دوز
ان کا غصہ ہے سراسر رحمت — زہر میں ان کے بھرا ہے امرت
انہی بندوں کے ہیں ایماں سچے — یہی کافر ہیں مسلماں سچے
قائم انصاف کا جب ہو گا نشاں — مانے جائیں گے انہی کے احساں
بے خبر کب کے پڑے سوتے تھے — ان کی آواز سے ہم چونک اُٹھے
ان کے طعنوں نے جگایا ہم کو — زہر نے ان کے جلایا ہم کو
یار و اغیار کے عیب اور ہنر — آشکارا ہوئے ایک اک ہم پر
حق کے جلوے نظر آئے ہر جا — اہل باطل میں بھی اک پائی ادا
نہ ملا راہ میں باطل کا سراغ — اہل حق کو بھی نہ پایا بے داغ
اہل تقویٰ کی ریائیں دیکھیں — اہل حکمت کی خطائیں دیکھیں
زشتیاں دیکھیں نکو کاروں میں — خوبیاں پائیں گنہگاروں میں
کلب کی پاک سرشتی دیکھی — پائے طاؤس کی زشتی دیکھی
عیب بھی دیکھے ہنر بھی دیکھے — خار بھی دیکھے ثمر بھی دیکھے
ہنر اغیار میں پائے اکثر — عیب اپنے نظر آئے اکثر
دفتر علم کو ابتر پایا — علم کو جہل سے بدتر پایا
مجلسیں غیبت و بہتان سے پر — صحبتیں جھوٹ کے طوفان سے پر
منقطع بھائی کی بھائی سے اُمید — اپنا بیگانہ، لہو سب کے سفید
پاک بندوں کی زباں پر دشنام — نہ ثقات اس سے بری اور نہ کرام
فقرا مکر و ریا کے پتلے — اغنیا حرص و ہوا کے پتلے
شیخ عیار تو زاہد پر فن — مولوی، عقل کے سارے دشمن

پیاز کی طرح نرے پوست ہی پوست قوم کے دوست مگر ناداں دوست
حالت القصہ جو دیکھی اپنی کوئی کل سیدھی نہ پائی اپنی
سارے آوے کو ٹٹولا جا کر کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر
پایا اک دین کا محکم قانون وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون
دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالتِ زار جی بھر آیا، نہ رہا صبر و قرار
گو نہ تھا تلخ نوائی کا محل آہیں دو چار گئیں دل سے نکل
تلخ گزرے جو کسی کو یہ صدا حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا؟

7 کلمۃ الحق معروف بہ 'راست گوئی'

(ایضاً)

اے راست گوئی! کیا قہر ہے تو اے حق کی تلخی! کیا زہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہو گی حنظل میں ایسی تلخی نہ ہو گی
ہے ناگواری پہچان تیری 'اَلحَقُّ مُرٌّ'[37] ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
رشتے ہزاروں تو نے تڑائے باپوں سے بیٹے تو نے چھڑائے
سقراط کو زہر تو نے دلایا شبیرؑ کو قتل تو نے کرایا
بے جرم مسموم تو نے کرائے سولی پہ معصوم تو نے چڑھائے
رخنے عرب میں تو نے نکالے بدر و اُحد میں رن تو نے ڈالے
موسیٰؑ کو مدین تو نے بھگایا احمدؐ سے مکہ تو نے چھڑایا
تو نے صلے میں بخشے ہیں اکثر سولی کے اورنگ، کانٹوں کے افسر
مظلوم کتنے تیرے سہارے 'ایلیٰ'[38] بھی 'ایلیٰ' کہتے سدھارے
خوں خوار لشکر ہیں ساتھ تیرے رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے
تیری جلو میں رسوائیاں ہیں سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں

تدبیر ہے تو ناکامیوں کی　　تقریب ہے تو بدنامیوں کی
تو آشتی کی رہتی ہے دشمن　　تو مصلحت سے رکھتی ہے ان بن
قطع و برش ہے تاثیر تیری　　رہتی ہے ننگی شمشیر تیری
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر　　دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں　　آتی ہے دنیا اک زلزلے میں
حق معبدوں میں ہوتا ہے داخل　　ہوتے ہیں جھوٹے معبود باطل
اٹھتا ہے عملہ لات اور صفا کا　　ہوتا ہے گھر پر قبضہ خدا کا
عبرانیوں کا اڑتا ہے پرچم　　صف قبطیوں کی ہوتی ہے برہم
ہوتے ہیں اغیار احمدؐ کے ساتھی　　بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناتی

***

اے راست گوئی اے تیغ براں　　تیرا مخالف کیوں ہو نہ دوراں
سب وحشت آگیں مضموں ہیں تیرے　　نت مصلحت پر شب خوں ہیں تیرے
گن تیرے جن پر ظاہر ہوئے ہیں　　وہ تیری دھن میں آخر ہوئے ہیں
اڈا جہاں سے سیلاب تیرا　　پھر واں نہ کشتی ٹھہری نہ بیڑا
اٹھتی ہیں دل سے جب تیری موجیں　　ہوتی ہیں نازل واں حق کی فوجیں
دیتی ہے ہمت ان کو سہارے　　کرتی ہے امید پنہاں اشارے
عزم ان کی مشکل کرتا ہے آساں　　دل ان سے لاکھوں کرتا ہے پیاں
چھا جائے ظلمت گو بحر و بر میں　　ہے روز روشن ان کی نظر میں
زور ان پہ تیرے ہیں آشکارا　　مٹھی میں ان کی عالم ہے سارا
عظمت جہاں ہے تیری سمائی　　پربت وہاں ہیں نظروں میں رائی
شاہوں سے گردن جھکتی نہیں واں　　طوفاں سے کشتی رکتی نہیں واں
اے راست گوئی تو ہے وہ افسوں　　منکر بھی دل سے ہیں جس پہ مفتوں
تلخی میں تیری طرفہ مزا ہے　　ہر دل میں چبھتی تیری ادا ہے

تو نے جہاں دی آواز جا کر — لاکھوں اٹھے سو تیری صدا پر
ہوتی ہے دھیمی پرواز تیری — بڑھتی ہے کم کم آواز تیری
پھر دوڑتی ہے یوں مرد و زن میں — جس طرح آتش لگتی ہے بن میں
بنتے ہیں دشمن انصار تیرے — ہوتے ہیں قیدی احرار تیرے
پطرس نے چھوڑے یار آشنا سب — یرون پہ دیکھی تیری ادا جب
ڈالا عمرؓ پہ جب تو نے سایا — ارقمؓ [39] کے گھر میں آ سر جھکایا
آہٹ سے تیری کرتے ہیں جو رم — ہیں گدگداتے دل ان کے ہر دم
جوں جوں وہ زد سے کرتے ہیں دوری — ضرب ان پہ تیری پڑتی ہے پوری
جاتا ہے آہو جب چوٹ کھا کر — گرتا ہے آخر کچھ دور جا کر
تجھ سے بھی جو ہیں وحشی بدکتے — پھر پھر کے تجھ کو جاتے ہیں تکتے
گو حق کی تلخی پائے ہوئے ہیں — پر چوٹ دل پر کھائے ہوئے ہیں
بھاگے ہیں کھا کر زخم نہاں وہ — جائیں گے بچ کر تجھ سے کہاں وہ
دل دوز ہیں سب تیری ادائیں — کڑوی ہیں تیری ساری دوائیں
زہر ہلاہل برسوں پئیں جب — بیمار تیرے پائیں شفا تب
دیتی ہے اول تو زخم کاری — مرہم کی آخر آتی ہے باری
کل ہے مسرت، ہے آج غم تو — دیتی ہے امرت کہتی ہے سمّ تو
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت — تو جھوٹ پر واں کرتی ہے لعنت
جس جا تعصب ہے عین ایماں — انصاف کا غل کرتی ہے تو واں
رسم سلف پر مرتے جہاں ہیں — رسموں پہ حملے تیرے وہاں ہیں
تقلید جس جا ہے طوقِ گردن — تقلیدیوں سے ہے تیری ان بن
کرتی ہے واں تو واعظ کو رسوا — ہے وحیِ مُنزَلْ قول اس کا جس جا
واں مفتیوں پر ہیں تیرے دھاوے — ہیں مثلِ قرآن جس جا فتاوے
پجتی ہیں قبریں جب اولیا کی — تو ہے دہائی دیتی خدا کی

جس ملک میں ہے تیری غلامی ہوتی ہے تو واں بردوں کی حامی
غل بھیڑیوں کا پڑتا جہاں ہے تو بکریوں کی واں پاسباں ہے
زہر اس عسل کو تو ہے بتاتی [40] جس میں حلاوت ہے سب کو آتی
اس نیش میں تو کہتی شفا ہے نیش اجل کا جس میں مزا ہے
ہندی میں تیری تازی کی بو ہے مشرق میں کہتی مغرب کی تو ہے
جس سر زمیں میں پانی ہے عنقا تو چھیڑتی ہے واں ذکر دریا
ہر سو جہاں ہے طغیان باراں شور العطش کا کرتی ہے تو واں
سانپوں کا خطرہ پاتی جہاں ہے اندھوں کے آگے کرتی فغاں ہے
طوفاں کی حالت پہلے سے پا کر بیڑوں میں چرچا کرتی ہے جا کر
ڈاکے کی آمد ڈاکے سے پہلے کہتی ہے جا کر تو کارواں سے
بلبل ہے گل پر جب چہچہاتی اس دم خزاں سے تو ہے ڈراتی
پاتی ہے گھر میں جب کچھ دھواں تو آگ آگ کا غل کرتی ہے واں تو
جب دیکھتی ہے قومیں بگڑتی ہے آگ میں تو قوموں کی پڑتی
کرتی ہے ظاہر ان کی خطائیں دیتی ہے ان کو پیچیدہ رائیں
گہ منعموں پر تو ہے برستی گہ جھاڑتی ہے مفلس کی مستی
دیتی ہے طعنے بے غیرتوں کو کرتی ہے رسوا بے عزتوں کو
للکارتی ہے تو کاہلوں کو پھٹکارتی ہے تو جاہلوں کو
جھڑکی ہے تیری عادت میں داخل ترشی ہے تیری طینت میں داخل
بگڑے ہیں تجھ سے دل بے نہایت لاکھوں نے کی ہے تیری شکایت
یاں نام تیرا جس نے لیا ہے عالم کو اپنا دشمن کیا ہے
احکام تیرے ٹلتے رہے ہیں تیرے نوشتے جلتے رہے ہیں
پہنچایا جس نے پیغام تیرا جمہور میں وہ بدنام ٹھہرا
کتنوں نے مانا ساحر نبیؐ کو کتنوں نے جانا کافر علیؓ کو
طوفاں اٹھائے اہل ہدیٰ پر بہتان باندھے زین العبا پر

نعمانؒ کو دی بدعت سے نسبت	کی شافعیؒ پر برپا قیامت
مالکؒ پہ لائے آفت جفا جو	یاں تک کہ اکھڑا مفصل سے بازو
کی ابن حنبلؒ کی یہ مدارا	چہرے پہ تھوکا، کوڑوں سے مارا
نکلے ائمہ اکثر وطن سے	خالی ہوا رے ابن حسنؒ سے
کتنوں کی باندھیں ذلت سے مشکیں	کتنوں کے رسی ڈالی گلے میں
مرتد بنایا اہل یقیں کو	ٹھہرایا زندیق اربابِ دیں کو

***

اے کلمہ حق! تیری بدولت	مردوں پہ گزری کیا کیا مصیبت
ٹھہرے جہاں میں بیگانے سب سے	تجھ پر ہوئے وہ دیوانے جب سے
دنیا نے ان پر گو ظلم توڑا	دامن انھوں نے تیرا نہ چھوڑا
ہے تلخ و شیریں ہر بات تیری	سننے میں کڑوی کہنے میں میٹھی
کانوں کو ہے تو گو ناگوارا	منہ سے نکلنا تیرا ہے پیارا
جو حرفِ حق سے بھاگے بگڑ کر	حق ان کو لایا گردن پکڑ کر
حق کے سب آخر طالب ہوئے ہیں	نت حق کے دعوے غالب ہوئے ہیں
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اجالا	حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

***

اے راست گوئی ! اے ابرِ رحمت!	ہے اس چمن میں سب تیری برکت
گر تو نہ ہوتی یاں سایہ افگن	برباد ہوتا کب کا یہ گلشن
عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے	آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے
باغِ جہاں کو چھانٹا ہے تو نے	اکثر خزاں کو ڈانٹا ہے تو نے
تو بے کسوں کی یاور رہی ہے	تو گمراہوں کی رہبر رہی ہے
جن بستیوں میں تو چہچہائی	کھیتی انہی کی یاں لہلہائی
بند اپنی جس جا تو نے زباں کی	نکبت نے منزل آ کر وہاں کی

رہبر نہ ہوتا گر نور تیرا — یوناں میں ہوتا ہر سو اندھیرا
گر مصر کی تو کھوتی نہ خامی — مصری نہ ہوتے عالم میں نامی
سریا میں حق کا جھنڈا نہ گڑتا — سایہ اگر واں تیرا نہ پڑتا
جنبش نہ ہوتی گر تیرے لب کو — قبلہ نہ کرتے خاکِ عرب کو
ہوتے رہے ہیں سب ملک و ملت — سر سبز تجھ سے نوبت بہ نوبت
مشرق میں جب تھی تیری حکومت — چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت
جب دور تیرا مغرب میں آیا — مغرب کو تو نے مشرق بنایا
کھلتے رہے ہیں گل تیرے ہر سو — مہکی ہے اکثر یاں تیری خوشبو
گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے — پر تیری دارو صحت فزا ہے
ہر بول تیرا جوش غضب میں — ہے حق کی آواز راہِ طلب میں
گو علم کی ہے تو زندگانی — پر جہل تیرا دشمن ہے جانی
جاہل ہمیشہ تجھ سے لڑے ہیں — ناداں ہزاروں تجھ سے اڑے ہیں
لاکھوں بلائیں آئی ہیں تجھ پر — اکثر گھٹائیں چھائی ہیں تجھ پر
ملکوں نے تجھ پر حملے کیے ہیں — قوموں نے تجھ سے بدلے لیے ہیں

***

اے کلمہ حق! اے سر یزداں — جس وقت ہو تو پردے سے عریاں
ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے — دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے
عالم ہو تیرا جب نا شناسا — حالی کو رکھیو اپنا شناسا

8 مناظرہ واعظ وشاعر

(ایضاً)

کل جو میں نے بستر راحت پہ جا کر دم لیا — دل کو اک وقفہ غم دنیا سے فرصت کا ملا
کی تصور نے وہیں اک بزمِ رنگیں آشکار — مجلس ارباب معنی جس کو کہنا ہے بجا

گرم تھا واں ہر طرف ہنگامہ بحث و نظر
سرخ رو گلگونہ حجت سے تھا ہر مدعا

شمع استدلال میں روشن تھا فانوس بیاں
چارسو ہنگامہ آرا تھی 'لم و لا[41]' کی صدا

تھے فراہم جس قدر اس بزم میں اہل کمال
تھا شرف کا اپنے اپنے فن کے سب کو اِدّعا

مولوی کہتے تھے غیر از علم دیں سب ہیچ ہے
فلسفی کہتے تھے ہر فن کی ہے حکمت پر بنا

صوفی صافی ادھر کچھ کہہ رہا تھا زیر لب
واعظ معجب ادھر کچھ بک رہا تھا برملا

خود فروشی کا غرض تھا ہر طرف بازار گرم
ساز گوناگوں تھے لیکن ایک تھی سب کی صدا

شاعر مغرور بھی اک سمت خنداں زیر لب
سن رہا تھا لاف اہل فضل اور خاموش تھا

جا کے پہنچا جب وہاں تک دورِ صہبائے سخن
دفعتہً مجلس سے اٹھا اور ہوا یوں خود ستا

دعویٰ فضل و براعت اس کو زیبا ہے یہاں
جو کوئی تلمیذ رحماں[42] تم میں ہو میرے سوا

ہے تصرف میں ہمارے عرصہ دشت خیال
کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا

رہ روی میں ہم کو چشم و گوش پر تکیہ نہیں
ہیں ہمارے بال و پر اندیشہ فکر رسا

صاف ہوتا ہے بیاں اپنا خس و خاشاک سے
پاک ہو جیسے وساوس سے دلِ اہل صفا

اتفاقاً گر کسی کی مدح پر آجائیں ہم
خاطرِ دشمن میں اس کا نقش الفت دیں بٹھا

خاک کو چرخ بریں پر دیں اگر ترجیح ہم
ماند ہو ذرے کے آگے مہر تاباں کی ضیا

وصف خوباں ہم سے گر سن پائے سالک ایک بار
ہو نہ ہرگز پنجہ عشق مجازی سے رہا

گر کریں ہم گل رخوں کی بے وفائی کا بیاں
ہو نہ بلبل پھر چمن میں روئے گل پر مبتلا

کھینچ دیں گر خاطر مشتاق کی تصویر شوق
قیس کی کرنی پڑے لیلیٰ کو جا کر التجا

ہیں ہماری مدح کے پیر و جواں اُمید وار
اور ہماری ہجو سے ٹھہراتے ہیں شاہ و گدا

گرمی بزم حریفاں ہے ہماری ذات سے
بادہ گلگوں کا ہے ہر بات میں اپنی مزا

فکر اپنی لغزش اہل نظر سے پاک ہے
ہم جہاں چلتے ہیں واں مسدود ہے راہِ خطا

کچھ نہیں اپنا ضرر گر ہو روایت میں خلل
جھوٹ سے ہوتی ہے یاں رونق عبارت کو سوا

دی نہیں گویا شریعت نے ہمیں تکلیف کچھ
جو نہیں جائز کسی کو ہے وہ سب ہم کو روا

خود ستائی جو کسی کو جز خدا پھبتی نہیں
آ کے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوش نما

فحش اور دشنام کو ملتا ہے یاں رنگ قبول
گالیاں دے دے کے ہم سنتے ہیں اکثر مرحبا

***

جب یہ بالا خوانیاں شاعر کی واعظ نے سنیں
مسکرایا اور یہ فرمایا کہ اے ہذیاں سرا!

شیوہ تیرا بوالفضولی اور یہ لاف و گزاف
پیشہ تیرا باد خوانی اور اتنا ادعا

اُمت برحق کے عالم جو ہیں از روے خبر
وارثِ علم نبی قائم مقامِ انبیا

کیا ادب جاتا رہا ان کا بھی تجھ کو اے سفیہ
بر سر مجلس ہے تو جو اس طرح بنکارتا

گو نہیں گنتی میں اہل علم کی یہ خاکسار
پر سنے جاتے نہیں یہ تیرے دعوے ناروا

ہر سخن کا اک جدا ہوتا ہے موقع اور محل
ہزل و سخریت کجا، بزم خرد منداں کجا

علم اور حکمت کے ہوں جس بزم میں دفتر کھلے
کس نے دی ہے تجھ کو واں اس ہرزہ گوئی کی رضا

شعر مستحسن اگر ہوتا تو قرآں میں اسے
کیوں خلافِ شانِ ختم المرسلیں کہتا خدا[43]

شان میں "بالعلم یزری" جس کی آیا ہے صریح
فخر ہے اس شعر پر تجھ کو یہ اے شر الوریٰ

چاہیے انفاسِ اہل الذکر سے ہو مستفید
ہو نہ جس کو علم سنت اور کتاب اللہ کا

خود ہو تم بے علم اور صحبت سے اہل علم کی
بھاگتے ہو جیسے شیطاں ہے اذاں سے بھاگتا

ہے یہی باعث کہ بک اُٹھتے ہو تم بے اختیار
جو تمھارے منہ میں آتا ہے سزا اور نا سزا

اس زبانِ یاوہ گو کو اپنی کیا سمجھا ہے تو
جرم گو چھوٹا ہے اس کا جرم ہے لیکن بڑا

بے حقیقت ہیں ترے سارے خیالات بلند
ہجو ہے تو بے اثر اور مدح ہے تو بے صفا

ہے جہاں خامے کو تیرے خدمت مشاطگی
مورت اک پتھر کی ہے واں حورِ جنت سے سوا

بال سے باریک تر معشوق کی تیرے کمر
رات سے تاریک تر ہجر صنم میں دن ترا

شش جہت میں تو کرے برپا قیامت سات بار
یار سے اپنے اگر دم بھر کو ہو عاشق جدا

تیغ چوبیں کی ہو گر برش بیاں کرنی تجھے
ہے تنزل گر اسے ٹھہرائے تو تیغ قضا

ہو جہاں لکھنی تجھے اسپ گلی کی جست و خیز
اک ترارے میں اسے پہنچائے تو فوق السما

تو ہوا مدح و ثنا میں جس کی سرگرمِ غلو
اور اُلٹا خوبیوں پر اس کی پردہ پڑ گیا

پرلے درجے کا تنزل ہے اگر ٹھہرائے تو
جم کو اس کے در کا درباں اور بہمن کو گدا

بہمن وجمشیدیاں بے چارے کس گنتی میں ہیں
تنگ ہیں ہاتھوں سے تیرے انبیا اور اولیا

لکھے تو اک گربہ مسکیں کو سارا[44] منزلت
اور کہے اک لعبت سنگیں کو تو یوسف لقا

فی المثل گر ہو ترا ممدوح اک برگِ گیاہ
اس میں ثابت کر کے چھوڑے تو صفاتِ کبریا

باد خوانوں سے سوا ہو تجھ کو فکر تہنیت
خواب میں سن پائے تو گر گوشِ[45] شادی کی صدا

ہند میں غل ڈال دے تو نالہ ہائے شوق سے
چین میں شہرہ ہو گر ایک شاہد نو خیز کا

شعر کو الہام سمجھے گر نصیبوں سے کبھی
کان میں پڑ جائے تیرے ایک جھوٹی واہ وا

مذہب شاعر میں جس کا دینِ باطل نام ہے
راستی اور صدق سے بڑھ کر نہیں کوئی خطا

سر بسر اقوال تیرے کچھ ہیں اور افعال کچھ
ہے زبانِ گوہر افشاں پر 'نعم' اور دل میں 'لا'

شان میں آیا ہے جن کے قول "مالا یفعلون"[46]
چشم بد دور آپ کے ہادی ہیں وہ اور مقتدا

ایسے دروازے بہت کم پائیں گے آفاق میں
جن پہ صبح و شام تو نے دی نہ ہو جا کر صدا

ہے زبان و خامہ تیرے تابع فرمانِ حرص
کام تجھ کو کچھ نہیں جز مدح و قدحِ اغنیا

مدح میں حد سے زیادہ جن کی کرتا ہے غلو
گالیاں دیتا ہے تو اکثر انہی کو برملا

جیسے دروازوں سے پھرتے ہیں دعا دے کر فقیر
مدح تو بھی ختم کرتا ہے یونہی دے کر دعا

ہر دعا میں ہے مقدر شرط 'اِنْ اَعْطَیْتَنِیْ'[47]
صاف لعنت کا دعا میں تیری آتا ہے مزا

پردہ عرض ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو
گر یہی شاعری تو تجھ سے بہتر ہے گدا

***

زہر دل کا جب کہ واعظ نے لیا سارا اُگل
اور نہ کوئی تیر باقی اس کے ترکش میں رہا

سن کے شاعر نے کہا، بس اے خدنگ انداز بس
ہے زباں تیرے دہن میں یا سنانِ جاں گزا

چوٹ تھی تیری سخن پر، جا پڑی اخلاق پر
تو نے چاکِ پیرہن کو تا جگر پہنچا دیا

خردہ گیری کے لیے حاضر ہے شاعر کا کلام
اس سے کیا مطلب کہ ہے وہ بندہ حرص و ہوا

تو اگر معصوم ہے تو کچھ کہی جاتی نہیں
پھنس رہا ہے ورنہ اس پھندے میں ہر شاہ و گدا

کھیلتے پھرتے ہیں میدان جہاں میں سب شکار
آڑ میں ٹٹی کی، لاکھوں اور ہزاروں برملا

حرص ہوتی جسم میں انسان کے گر جائے خون
شاعروں سے تیرے چہرے کی دمک ہوتی سوا

میں نے ان آنکھوں سے اے واعظ لباسِ وعظ میں
جو فروشی کرتے دیکھے ہیں بہت گندم نما

خبط ہے اک تم کو، کہہ دوں گر برا مانو نہ تم
آپ ہو بیمار اور دیتے ہو اوروں کو دوا

آپ میں تسبیح و ذکر و طاعت و زہد و ورع
خوبیاں سب کچھ سہی پر دل کا مالک ہے خدا

میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
جو ہیں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے برا

بات حق ہو یا کہ باطل تیری مرضی کے خلاف
منہ سے نکلی اور تجھے تکفیر کا پہلو ملا

ترک اولیٰ پر فضیحت جس قدر کرتا ہے تو
قتل انساں پر نہیں ملتی کہیں ایسی سزا

ہے فقط دوزخ تری سرکار میں جنت نہیں
چوک جس سے ہو گئی کچھ پھر نہیں تو بخشتا

عاصیوں کی مغفرت جن سے نکلتی ہے صریح
ایسی آیات اور حدیثوں سے ہے تو جی میں خفا

گر خدا بھی واعظو! ہوتا تمہی سا سخت گیر
اس چمن کو دیکھتا کوئی نہ پھر پھولا پھلا

گرم بازاری اسی میں اپنی بس سمجھے ہو تم
لوگ ہوں بد راہ اور ان کے بنو تم رہ نما

چاہتے ہو تم یہاں کثرت معاصی کی یونہی
ہیں اطبا چاہتے جس طرح امراض اور وبا

آپ ان باتوں کو اک بہتان سمجھیں گے مگر
سوجھتی اکثر نہیں انسان کو اپنی خطا

جو کہوں میں اس کو باور کر نہیں اس میں خلاف
شاعروں کے کذب سے بدتر ہے واعظ کی ریا

یہ بھی کوئی جھوٹ ہے، ہم جس کے خود ہیں معترف
جھوٹ وہ ہے جو ہو پردے میں تقدس کے چھپا

دعوتوں میں سچ بتا جس شوق سے جاتا ہے تو
ایک بھی کی ہے نماز اس شوق سے تو نے ادا

یاد ہے وہ تیرا کہنا دیکھ کر کھانے چنے
دین قائم ہے ابھی یارو کرو شکر خدا

مدرسے کوشش سے تیری گو بنے ہیں شہر شہر
مسجدیں بھی تو نے بنوائی ہیں اکثر جا بجا

پر یہ حیرت ہے کہ ان کاموں میں جو لاگت لگی
اس سے دہ چند آپ کے دیوان خانے میں لگا

مجرموں کے جرم شاید ہوں نہ اتنے خوف ناک
نیکیاں تیری ہیں جیسی پرخطر روزِ جزا

ہے یقیں اتنا ہی ہوگا اپنے دل میں تو حقیر
جس قدر مانا ہے زید و عمرو نے تجھ کو برا

کر دیا رسوا تری تزویر نے تذکیر کو
ورنہ اک منصب تھا یہ شایانِ شانِ انبیا

لطف ہے تو دل ربا اور قہر ہے تو دل فریب
سحر ہے، افسوں ہے، جادو ہے، تری جو ہے ادا

گہ جہنم سے ڈرا کر چاہتا رشوت ہے تو
گاہ حوروں پر لبھا کر مانگتا ہے رونما

گونجتا منبر پہ ہے یوں بیٹھ کر گویا کہ آپ
آسماں سے لے کے اُترے ہیں ابھی حکمِ خدا

ہاتھ میں تیرے ہے گویا نار و جنت کی کلید
جس نے پوجا تجھ کو وہ فردوس میں داخل ہوا

نیکیاں برباد ہیں ساری تری خدمت بغیر
فرقہ ناجی ہے بس اک پوجنے والا ترا

اپنی اک امت الگ سب سے بنانے کے لیے
تفرقے ڈالے ہیں دینِ حق میں تو نے جا بہ جا

تیرے گہرے ہیں مسلمانوں میں جب تک ہے نزاع
اختلاف امت کا حق میں تیرے رحمت ہو گیا

جس طرح جھگڑوں کے خواہاں ہیں عدالت میں وکیل
مانگتا ہے تو یونہی باہم خصومت کی دعا

چاہتا ہے قوم میں جوتی سدا چلتی رہے
کشتی اسلام کا پھر کیوں نہ ہو تو ناخدا

شاعروں کو بس اسی منہ سے گدا کہتا ہے تو
اے اسیرِ دامِ نفس، اے بندہ حرص و ہوا

کچھ گدا کہنے سے تیرے، ہم گدا ہوتے نہیں
ورنہ ہم بھی یوں تو کہہ اُٹھتے ہیں بعضوں کو گدا

شاعری پر ہے بڑا یہ طعن حضرت کا کہ ہم
حد سے بڑھ جاتے ہیں جب کرتے ہیں مدحِ اغنیا

طعن کچھ بے جا نہیں، رکھتے ہیں پر اک عذر ہم
غور کرنا عذر پر ہے شیوۂ اہل صفا

سب پہ روشن ہے کہ ہم لوگوں کا اک پیشہ ہے مدح
جیسے تم لوگوں کا پیشہ ہے یہی مکر و ریا

اپنے اپنے کام اور پیشے میں، ہم ہوں یا کہ تم
کرتے ہیں، ہوتا ہے جو کچھ مصلحت کا مقتضا

وعظ میں دیتے ہو آخر داستاں کی چاٹ تم
راستی سے کام جب چلتا نہیں تسخیر کا

مدح میں ہم بھی یونہی کرتے ہیں رنگ آمیزیاں
جب تن ممدوح پر کھلتی نہیں سادی قبا

پھول پھل سے سرو کو بے بہرہ جب پاتے ہیں ہم
ایک طرہ اس میں آزادی کا دیتے ہیں لگا

سوسن و نسرین و گل میں جب وفا پاتے نہیں
وصف رنگ و بو سے ہم دیتے ہیں عیب ان کا چھپا

پر ہم اس پردے میں خود اپنا دکھاتے ہیں کمال
ورنہ ایسی مدح ہے ممدوح کے حق میں ہجا

اس سے بڑھ کر ہجو ہو سکتی ہے کیا انسان کی
لکھیں اعمیٰ کو بصیر و راہ زن کو رہ نما

عدل میں لکھتے ہیں ہم نوشیروانِ عہد انھیں
ایک منکوحہ کا حق ہوتا نہیں جن سے ادا

حاتم وقت ان کو ٹھہراتے ہیں جن کا بذل و جود
اس لیے ہے تا کہ حاصل حاکموں کی ہو رضا

زیرکی میں ان کو کہتے ہیں ارسطوے زماں
ہم نشیں احمق بناتے ہیں جنھیں صبح و مسا

کہتے ہیں کس شد و مد سے ہم انھیں بیدار مغز
جونہیں واقف کہ آمد کیا ہے اور ہے خرچ کیا

جو غلامانہ خوشامد کرتے ہیں حکام کی
ان کی آزادی پہ ہم کہتے ہیں سو سو مرحبا

ان پہ ثابت کرتے ہیں ہمدردی نوع بشر
آپ کو گنتے ہیں جو نوعِ بشر سے ماورا

حامی اسلام دیتے ہیں خطاب ان کو کہ جو
کرتے ہیں رسوا چلن سے اپنے نام اسلام کا

یاورِ خلق ان کو کہتے ہیں جنھیں اے واعظو!
تم کسی کے کام کا رکھتے نہیں اپنے سوا

مدح کی جاتی ہے یاں اکثر اسی انداز سے
شیخ ہو ممدوح یا واعظ، غنی ہو یا گدا

قطب دوراں ان ریا کاروں کو ٹھہراتے ہیں ہم
آپ کو بھی جو سکھائیں مدتوں مکر و دغا

ان فسوں سازوں کو ہم لکھتے ہیں ذوالنون زماں
بیٹھ کر منبر پہ جو آنکھوں کا کاجل لیں اُڑا

آپ جھٹ اس کو کہے جو مدح وہ بے مغز ہے
نام اسی کا مدح ہے تو ہجو ہے پھر چیز کیا

***

چبھتی اور دکھتی سخن ور نے یہ کی تقریر جب
اور لگے سب مسکرانے دیکھ کر یہ ماجرا

دل میں واعظ نے پڑھی لاحول اور سمجھا کہ میں
چھیڑ کر اک بے ادب کو مفت میں رسوا ہوا

پر بہ ظاہر داغ یہ دامن سے دھونے کے لیے
ہنس کے اک سنجیدگی سے اور متانت سے کہا

ہو چکیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ اور ذکر
ہزل و استہزا زیادہ حد سے ہوتا ہے برا

کہیے فکر شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق
آپ نے دیواں مرتب کیوں نہیں اب تک کیا

ہیں ہنسی کی اور باتیں کیجیے انصاف اگر
ہے غزل میں آپ کی دیوانِ حافظ کا مزا

عرض کی شاعر نے حضرت کا ہے یہ سب حسن ظن
ورنہ میں کیا اور مرا مجموعہ اشعار کیا

قبلہ! اب وہ دن گئے جب شاعروں کی قدر تھی
شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا

شعر اگر کہیے تو روٹی جا کے کس گھر کھائیے
سیکڑوں پھرتے ہیں شاعر تنگ دست و بے نوا

اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر
وعظ میں شاگرد ہو جاؤں کسی استاد کا

اس گئے گزرے زمانے میں بھی یہ فن شریف
کیمیا ہے، کیمیا ہے، کیمیا ہے، کیمیا

آپ لوگوں کی تو اس میں ریس کرنی ہے محال
پر ہمیں بھی سیکھنے سے کچھ نہ کچھ آ جائے گا

روز اک سونے کی چڑیا گر نہ ہاتھ آئی، نہ آئے
ہم گنہگاروں کا پیٹ ایسا نہیں ہے کچھ بڑا

کی سخن پرداز نے واعظ سے جب یہ گفتگو — قہقہوں سے چار سو مجلس میں اک غل پڑ گیا
خواب کا سا وہ سماں جاتا رہا سب یک بہ یک — اور دی پہلو سے دل نے کان میں میرے صدا
ہزل ہو یا جد نصیحت لیجیے ہر بات سے — کہہ گئے ہیں اہل دل دُع ما کدر خذ ما صفا[48]

9 پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ

(ایضاً)[49]

پھوٹ سے ایکے نے کی یہ گفتگو — میں ہوں جہاں کا چمن آرا کہ تو؟
میرا ہے یا تیرا مبارک قدم؟ — مجھ سے ہے یا تجھ سے بقائے امم؟
اپنی ستائش نہیں زیبا، مگر — حق نہ جتاؤں تو ہے خوف ضرر
منزل ہستی کا ہوں میں رہنموں — کچھ نہ ہوا ے پھوٹ اگر میں نہ ہوں
مجھ سے ہی اجسام کو ہے التیام — مجھ سے ہی اجرام میں ہے انتظام
میری بدولت ہے کھنچا اور تنا — جال یہ سب ثابت و سیّار کا
میرا اگر ہو نہ قدم درمیاں — زیر زبر ہو ابھی نظم جہاں
دانوں کو دیتا ہوں میں خرمن بنا — قطروں سے دیتا ہوں میں دریا بہا
ڈھیلوں سے چنتا ہوں حصارِ حصیں — ریشوں کو کر دیتا ہوں حبل المتیں
میں ہوں اگر مورچوں کے درمیاں — ان کا سلیماں کو کروں میہماں
مجھ سے ہے ہر قوم اعانت طلب — کرتے ہیں طاقت مری تسلیم سب
قوموں کے اقبال کی میں ہوں دلیل — میں نہیں جس قوم میں وہ ہے ذلیل
مجھ سے گھرانوں کی ہے چھاتی پہاڑ — میں نہیں جس گھر میں وہ گھر ہے اُجاڑ
ملک ہیں آباد میری ذات سے — یمن ہے اک میری کرامات سے
میں نے ہے جس قوم کو بخشا وقار — قوم وہی قوم ہے باقی کمہار
بخت عدو مال ہے اس قوم کا — بندہ خود اقبال ہے اس قوم کا
نرغے میں گھر جائے گر اک ان کا فرد — لاکھ پہ بھاری ہے بہ وقت نبرد

ڈال نہیں سکتا کوئی اس پہ ہاتھ
سوجھتی ہے قوم تمام اس کے ساتھ

میرا ہے جس ملک میں جاری عمل
واں کبھی آنے نہیں پاتا خلل

میرے تصرف میں ہے جو سر زمیں
واں کوئی بے کس کوئی تنہا نہیں

ایک ہے زخمی تو ہیں سب دل فگار
ایک ہے مظلوم تو حامی ہزار

ایک کو گر دیکھتے ہیں مضطرب
پیٹ کو پکڑے ہوئے پھرتے ہیں سب

آگ اگر گھر میں لگی ایک کے
قوم میں گھر گھر دھوئیں اُٹھنے لگے

کل کی مصیبت میں ہیں کل مبتلا
ایک پر آتی نہیں کوئی بلا

ضعف دباتا نہیں ان کو کبھی
رکھتے ہیں کمزور بھی واں دل قوی

غم نہیں افلاس کا مفلس کو واں
ایک کا افلاس ہے سب پر گراں

ایک کی خواری سے ہیں نادم ہزار
ایک ہے رسوا تو ہیں سب شرمسار

ایک کی عزت ہو تو نازاں ہیں سب
ایک ہو گر شاہ تو سلطاں ہیں سب

***

سنتی ہے اے خانہ بر انداز پھوٹ
سچ ہے یہ سب میرا بیاں یا کہ جھوٹ

مجھ میں نہیں عیب کچھ اس کے سوا
ساتھ مرے تیرا ہے کھٹکا لگا

ذات ہے میری مہ کامل مگر
دیتی ہے گہنا مجھے تو آن کر

ہوتی اگر تیری نہ یاں ہست و بود
میرا مبارک تھا جہاں میں وجود

چشمہ رحمت ہے جماعت ولے
کرتی ہے تو آ کے مکدر اسے

چار جو مل بیٹھتے ہیں یاں کبھی
سب نظر بد سے ہیں لرزاں تری

صلح کا رہتی ہے برا تکتی تو
دو کو بہم دیکھ نہیں سکتی تو

قطع و برش تیری جبلی ہے خو
گوشت جدا کرتی ہے ناخن سے تو

بھائیوں کو کرتی ہے اغیار تو
یاروں کو کر دیتی ہے بے یار تو

ڈالتی ہے ان میں نزاع و خلاف
دو کے نہیں چھوڑتی دل ان میں صاف

قوم میں جو دیکھیے چھوٹا بڑا
چنتا ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا

مضحکہ خود اپنا بناتے ہیں وہ
اپنے پہ عالم کو ہنساتے ہیں وہ

سوجھتی ملت کی نہیں کوئی بات
یہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات

رہتا ہے ایک ایک کے در پے نہاں
جس سے جسے دیکھیے ہے بدگماں

زید کا ہے عمرو سے ظاہر ملاپ
دل میں بھرا دونوں کے لیکن ہے پاپ

ایک یہ کہتا ہے کہ میری چلے
دوسرا خواہاں کہ زک اس کو ملے

دیکھیے جس کو وہ ہے اس تاک میں
یاروں کے منصوبے ملیں خاک میں

قوم کی قوم آتی ہے بے کس نظر
جاتی ہیں جھاڑوں کی سی سینکیں بکھر

عیب ہیں جو تجھ میں وہ مجھ میں نہیں
خوبیاں جو مجھ میں ہیں تجھ میں نہیں

***

پھوٹ نے ایکے سے سنا جب یہ لاف
بولی کہ تقصیر ہو میری معاف

نام ہے بدنام مقرر مرا
ذکر برائی سے ہے گھر گھر مرا

پر کوئی انصاف سے دیکھے اگر
میں ہوں وہی جو کہ ہے تو سر بسر

عیب ہیں کچھ مجھ میں تو تجھ میں بھی ہیں
خوبیاں تجھ میں بھی ہیں مجھ میں بھی ہیں

خلق کے ہم دونوں مددگار ہیں
دوست کا تو یار ہے، دشمن کی میں

اپنوں سے تو غیر کو کرتا ہے زیر
میں ہوں کہ دل غیروں کے رکھتی ہوں شیر

میں کروں تائید نہ تیری اگر
ہو کوئی خوبی نہ تری جلوہ گر

کام رہیں سارے ادھورے ترے
ہوں کبھی منصوبے نہ پورے ترے

میرے ہی بل چلتی ہے گاڑی تری
مجھ سے ہی سرسبز ہے باڑی تری

میں جو نہ ایراں کو دلاتی شکست
رومیوں کے حوصلے ہو جاتے پست

ڈالتی بغداد میں گر میں نہ جال
کرتی نہ عباسیوں کو پائے مال

کام نہ آتا کوئی تیرا ہنر
فتح نہ پاتی کبھی فوج تتر

ہوتی بخارا میں نہ گر میں مخل
کرتی نہ ساسانیوں کو مضمحل

غزنوی اس طرح نہ پاتے فروغ
ٹھہرتے دعوے ترے سارے دروغ

ہند میں میں گل نہ کھلاتی اگر — رنگ نہ یاں اپنا جماتی اگر
غوریوں کو فتح دلاتا نہ تو — خلجیوں کے کام کچھ آتا نہ تو
لودیوں کے بڑھتے نہ آگے قدم — مغلوں کا یاں آ کے نہ گڑتا علم
ہند میں کرتی نہ اگر میں وطن — پھیلتے مغرب کے نہ یاں علم وفن

***

یہ تو لیا تو نے سن اے اتفاق — اب کہوں کچھ اور جو گزرے نہ شاق
تجھ سے سوا مجھ میں ہے ہیچ اس کو جان — جلوہ گر انصافِ الٰہی کی شان
تو جو کسی قوم کا بنتا ہے یار — چاہتا ہے بگڑے نہ وہ زینہار
اس کو نہ پیش آئے کبھی روزِ بد — بات رہے اس کی بنی تا ابد
حصے میں اس کے رہے عز و شرف — رشک سے قومیں تکیں اس کی طرف
آئے نہ اقبال کو اس کے زوال — دوست رہیں شاد، عدو پائے مال
تیرا تو یہ خاصہ ٹھہرا مگر — عادتِ حق کی نہیں تجھ کو خبر
آج کسی کو جو چڑھاتا ہے وہ — دوسرے دن اس کو گراتا ہے وہ
جزر ہے دریا میں پس از مد ضرور — عزت و دولت کی ہے اک حد ضرور
ختم جب اقبال کا ہوتا ہے دور — سارے بگڑ جاتے ہیں قوموں کے طور
خصلتیں ان کی نہیں رہتیں درست — فرض ادا کرنے میں رہتے ہیں سست
بھول کے بھی وہ نہیں لاتے بجا — بندوں کے حق اور حقوقِ خدا
ملتی ہے ہر چند کہ مہلت انھیں — پر کبھی ہوتی نہیں جرأت انھیں
جب نہیں غفلت کا اترتا خمار — ہوش میں آتے نہیں وہ زینہار
کرتے سزا سے نہیں پھر درگزر — کار گزارانِ قضا و قدر
لیتے ہیں چھین ان سے حکومت کبھی — کرتے ہیں سلب ان کی لیاقت کبھی
علم کبھی دیتے ہیں ان کا مٹا — دیتے ہیں دولت کبھی ان کی لٹا
اس پہ بھی ہوتے نہیں جب ہوشیار — بھیجتے ہیں قحط و وبا بار بار

کوڑے یہ کھا کھا کے گئے گر سنبھل
سر سے بلا قوم کے جاتی ہے ٹل

ورنہ مجھے کرتے ہیں مامور واں
تا کہ کروں قدرتِ باری عیاں

الحذر اس وقت سے اے اتفاق
آن کے جب کہتی ہوں میں الفراق

آ گئے اس قوم کے بس دن برے
حق نے کیا جس پہ مسلط مجھے

کوہ کو کرتی ہوں پر کاہ میں
شیروں کو کر دیتی ہوں روبارہ میں

قدر و بہا قوم کی لیتی ہوں چھین
کوڑی کے کر دیتی ہوں میں تین تین

کرتے نہیں غیر انھیں آ کے پست
پاتے ہیں وہ اپنے ہی ہاتھوں شکست

دیتے ہیں دھیان ان کا بداندیش چھوڑ
آپ ہی مر جاتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ

آگ پہ گویا کہ ہوں بارود میں
قوموں کو کر دیتی ہوں نابود میں

ہو گیا جس ملک میں یاں میرا راج
قحط و وبا کی نہیں واں احتیاج

قحط و وبا کرتے ہیں جانیں تلف
کھوتی ہوں میں قوم کا عز و شرف

دیتے ہیں وہ قوم کی گنتی گھٹا
کرتی ہوں میں قوم کو بالکل فنا

حکم یہی ہے مجھے اے اتفاق
ڈالتی ہوں اس لیے ان میں نفاق

ہے مری تحقیر خلافِ ادب
میں ہوں فرستادہ درگاہِ رب

***

سلسلہ تقریر کا جب بڑھ گیا
پھوٹ کو یہ غیب سے آئی صدا

ڈال دیے تو نے دلوں میں شگاف
کب تلک اے پھوٹ یہ لاف وگزاف

حد سے سوا بڑھ گئی تو، شرم شرم!
جھوٹ میں اور اتنا غلو، شرم شرم!

چیز حقیقت میں کوئی تو نہیں
تجھ میں حقیقت کی کہیں بو نہیں

چیز وہی چیز حقیقت میں ہے
تعبیہ جو خلق کی فطرت میں ہے

فطرت انساں کے ہے جو کچھ خلاف
ہیچ ہے وہ اس میں نہیں اختلاف

طبع بشر میں ہے ودیعت وفاق
واں نہیں مطبوع بجز اتفاق

روم ہوں یا ترک، عجم یا عرب
مہر و محبت پہ ہیں مجبول سب

ایک کو ہے ایک کی جانب جھکاؤ
ایک سے ہے ایک کے دل کو لگاؤ

ہوتی کچھ اے پھوٹ اگر تیری اصل
متحد انسان کی ہوتی نہ نسل

تو وہ ہے سرچشمہ نہیں جس میں آب
تیری نمائش ہے برنگ سراب

ایسے بہت کرتی ہیں جلوے عیاں
آدم خاکی کی غلط فہمیاں

جیسے کہ بے اصل خبر گاہ گاہ
ملک کرا دیتی ہے دم میں تباہ

تجھ سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر بگاڑ
رائی کے ہو جاتے ہیں بن کر پہاڑ

ہے یہ نمائش تری اے خود نما
شعبدہ اک وہم غلط کار کا

سیکڑوں گھر جہل نے گھالے ہیں یاں
پردے بہت عقلوں پہ ڈالے ہیں یاں

جہل کا چھایا ہے اندھیرا جہاں
ملک کو ظلمت نے ہے گھیرا جہاں

ٹھیک نہیں سوجھتی واں کئی چیز
نفع و ضرر میں نہیں ہوتی تمیز

قوم کی تعریف نہیں جانتے
اپنی حقیقت نہیں پہچانتے

کر نہیں سکتے وہ حقائق میں غور
کہتے ہیں جڑ اور ہے ٹہنی ہے اور

جانتے دریا کو ہیں اک شے جدا
قطروں سے کہتے ہیں کہ وہ ہے جدا

پر یہ عزیزوں کو نہیں سوجھتا
ہے انھی قطروں سے وہ دریا بنا

بس یہی انساں کی غلط کاریاں
دیتی ہیں پہنچا اسے اکثر زیاں

ہوتا ہے بیٹھا ہوا جس شاخ پر
تولنے لگتا ہے اسی پر تبر

چلنے کو جس راہ میں ہوتا ہے وہ
کانٹے اسی راہ میں بوتا ہے وہ

پینے کا جو اس کے ہے جاں بخش جام
زہر ملاتا ہے اسی میں وہ خام

حق کبھی ہونے نہیں دیتیں عیاں
جہل کی چھائی ہوئی تاریکیاں

ہوتی ہے پر ختم شب تار جب
پھیلتے ہیں علم کے انوار جب

شے نہیں رہتی کوئی پیش نظر
نورِ حقائق کے سوا جلوہ گر

سچ نظر آتا ہے سچ اور جھوٹ جھوٹ
تفرقہ رہتا ہے نہ رہتی ہے پھوٹ

وہم دوئی دل میں سماتا نہیں — اپنے سوا کچھ نظر آتا نہیں
بھائیوں پر پہلے کیے تھے جو وار — اپنا بدن پاتے ہیں اس سے فگار
ان پہ چلائے تھے جو تیر و سناں — اپنے بدن پر ہیں اب ان کے نشاں
ان کے سمجھ کر جو بگاڑے تھے کام — کام نکلتے ہیں وہ اپنے تمام
علم ہو جس قوم کا یاں راہبر — برکتیں اللہ کی اس قوم پر
جانتے ہیں وہ برکات وفاق — ان پہ ہیں روشن خطرات نفاق
فرق نہیں ان کے زن و مرد میں — قوم کی طاقت ہے ہر اک فرد میں
رتبہ یہ ایکے نے ہے ان کو دیا — لاکھوں کروڑوں پہ ہیں فرماں روا
زور سے ہیں ان کے زبردست زیر — لومڑیاں سامنے ان کے ہیں شیر

***

اے کہ تری ذات ہے عالم پناہ — اسود و احمر کا ہے تو بادشاہ
جوڑنا ٹوٹوں کا تیری بات ہے — تیری صفت جامع اشتات ہے
منتج ادبار ہے جب تک نفاق — مثمر اقبال ہے جب تک وفاق
تلخ ہے جب تک ثمر اختلاف — ہے تر و تازہ شجر ایتلاف
بھیجیو نکبت نہ کسی قوم پر — رکھیو ہر اک قوم کو شیر و شکر
ٹوٹے نہ آفاق میں سنگت کوئی — ہو نہ پراگندہ جماعت کوئی
بندے سے ہو بندہ نہ کوئی جدا — بکھرے نہ شیرازہ کسی قوم کا
پھوٹ کسی قوم میں پڑ جائے جب — ایک سے ایک ان میں بچھڑ جائے تب
ورنہ اگر ہو نہ ملاپ ان کو راس — اور نہ ہو سر جوڑنے کی ان کے آس
وہ جیے تو کیا جیے بے آبرو — جلد اُٹھا لے انھیں دنیا سے تو
پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا — حق میں ہے اس قوم کے بہتر فنا

10 دولت اور وقت کا مناظرہ

(ایضاً)

ایک دن وقت نے دولت سے کہا ۔۔۔ سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا؟
تو ہے سرمایہ عزت، یا میں؟ ۔۔۔ تو ہے انسان کی دولت، یا میں؟
ہے زمانے میں بڑی بات تری ۔۔۔ دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا ۔۔۔ تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب جس کو خدائی مانے ۔۔۔ اس کی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشن دنیا مجھ سے ۔۔۔ لیتے ہیں توشہ عقبیٰ مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے ۔۔۔ لقب ادبار ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشوونما ۔۔۔ علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال ۔۔۔ لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر ۔۔۔ میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر
چند روز آ گئی میں جس کے کام ۔۔۔ زندہ تا حشر رہا اس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا ۔۔۔ وہ سدا خوار و نگوں سار رہا
منہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں ۔۔۔ اس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
چاہتے ہیں مجھے سب خورد و کلاں ۔۔۔ پھرتے ہیں دھن میں مری پیر و جواں
گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو ۔۔۔ کسی آغاز کا انجام نہ ہو
کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا ۔۔۔ درمیاں گر نہ قدم ہو میرا
ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں ۔۔۔ میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں
جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں ۔۔۔ ہو اگر شیر تو روباہ کروں
الغرض ہے وہ مری شان عظیم ۔۔۔ کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم
جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو ۔۔۔ میری عظمت نہیں باور تجھ کو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا
جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سن کے کہا اے دولت
شک نہیں اس میں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے، مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجیے فرض تجھے گر چشمہ
تو ہوں اس چشمے کا میں سر چشمہ

میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں
پہلے دریا ہے کہ مچھلی، ناداں

تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا گر عطر آگیں
میں ہوں اس عطر کی واللہ زمیں

ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن کے قبضے میں ہوں میں اے دولت
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت

لاکھ بار ان سے اگر بھاگے تو
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

ان کی مٹھی میں ہے تو اے دولت
طائر رشتہ بہ پا کی صورت

نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

ایک پل میری اگر دیجیے گنوا
لیجیے ہاتھ اس سے ہمیشہ کو اُٹھا

تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت

ہیں اسی واسطے جو اہل تمیز
میری ایک ایک پل ان کو ہے عزیز

میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
ہے مرا جاگتے سوتے انھیں پاس

جانتے ہیں حکما و عرفا
مجھ کو سرمایہ دین و دنیا

دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
ان کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں

نہ کوئی کام ہو ان سے انجام
نہ ارادہ ہو کوئی ان کا تمام

نہ انھیں دین کی دولت ہاتھ آئے
اور نہ دنیا کبھی ان سے پٹیائے

نہ ادا صوم ہو ان سے نہ صلواۃ
نہ ہو قدرت میں حج ان کی نہ زکوٰۃ

نہ مدد ان سے کچھ اپنی کی جائے
نہ خبر ان سے کسی کی لی جائے

گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت
ہے مگر تنگ مجالِ فرصت

بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو
بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اس میں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری اک اک آن

11 حقوقِ اولاد

(ایضاً)

(لاڈلا بیٹا)

لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا
جان ماں کی اور ایماں باپ کا

دیکھ اسے ہوتے تھے دونوں باغ باغ
تھا وہی لے دے کے اس گھر کا چراغ

بال بیکا اس کا ہوتا تھا اگر
دل کو رہ جاتے تھے دونوں تھام کر

ہر طرح اس کی رضا مقصود تھی
جان تک اس کے لیے موجود تھی

وقف تھی سب اس پہ دولت اور مال
پر نہ تھا تعلیم کا اس کی خیال

روک ٹوک اس کی کسی نے کی نہ تھی
باپ نے جھڑکی تک اس کو دی نہ تھی

گھور سے واقف نہ تھا استاد کی
شکل دیکھی ہی نہ تھی جلاد کی

راہ سے مکتب کی کتراتا تھا وہ
نام سے پڑھنے کے گھبراتا تھا وہ

لکھنے پڑھنے کی نہ تھی ترغیب کچھ
گوشمالی تھی نہ تھی تادیب کچھ

تربیت کے بدلے لاڈ اور پیار تھا
لہو و بازی میں سدا سرشار تھا

کھیل میں کرتا تھا برباد آپ کو
اور کچھ پروا نہ تھی ماں باپ کو

جانتے تھے گھر میں ہے دولت بہت
لکھنے پڑھنے کی نہیں حاجت بہت

نوکری کرنی نہیں اس کو تلاش
ہے اسی کے واسطے ساری معاش

گو رہے بے علم اور نادان یہ
پر کسی صورت چڑھے پروان یہ

پیروی کی اک خیالِ خام کی
فکر دونوں نے نہ کی انجام کی

(اولاد کی باقاعدہ تربیت نہ کرنے کا انجام)

جب ہوا وہ ناز پروردہ جواں رنگ لائیں ان کی بے پروائیاں
آ پڑا اس کا وہی آخر کو رنگ لاڈلے بیٹوں کا جو ہوتا ہے ڈھنگ
سامنا ماں باپ کا کرنے لگا ہم سری کا ان کی دم بھرنے لگا
حق تو ان کے اس سے کیا ہوتے ادا اور ناراض ان کو وہ رکھنے لگا
تھیں ادائیں اس کی اکثر ناپسند کارگر اس کو ملامت تھی نہ پند
جہل و نادانی کی تھیں طغیانیاں رات دن کرتا تھا نا فرمانیاں
اس کو صحبت تھی تو تھی اغیار سے اس کی ملت تھی تو تھی انفار سے
شہر میں آوارہ کہلاتا تھا وہ چوک میں پاتا تھا جب پاتا تھا وہ
پند سے ناصح کی نفرت تھی اسے سائے سے اچھوں کے وحشت تھی اسے
گھر میں آ اک اک سے لڑ جاتا تھا وہ باتوں باتوں میں بگڑ جاتا تھا وہ
نفس پر اپنے نہ کر سکتا تھا جبر نام کو اس میں تحمل تھا نہ صبر
دل پہ قابو زینہار اس کو نہ تھا اور زباں پر اختیار اس کو نہ تھا
جو وہ کرتا تھا اسے بھرتے تھے سب اس سے چھوٹے اور بڑے ڈرتے تھے سب
اصل میں کچھ بد نہ تھی اس کی سرشت کر دیے تھے جہل نے اطوار زشت
گو نہ مطلق آدمیت اس میں تھی پر جھلکتی قابلیت اس میں تھی
بد چلن تھا پر نہ تھی طینت بُری فطرت اچھی تھی، مگر عادت بُری
چڑھ رہا تھا اس پہ بدصحبت کا رنگ لگ رہا تھا روشن آئینے کو زنگ
ذات میں اس کی شرارت تھی نہ شر ہو گیا تھا بد، بدوں میں بیٹھ کر

(باپ کی نصیحت)

جب گئی حالت بگڑ حد سے سوا آ گیا دم ناک میں ماں باپ کا
باپ نے اک روز گھر میں بیٹھ کر یوں کہا بیٹے سے اے جانِ پدر!
یاد ہیں وہ دن بھی تم کو یا نہیں جب کہ یہ رعنائیاں تم میں نہ تھیں

جب خبر اپنی نہ تھی کچھ آپ کو
جانتے تھے تم نہ ماں اور باپ کو

پاسباں تھے آپ کے ماں باپ جب
گوشت کا اک لوتھڑا تھے آپ جب

ہل نہ تم سکتے تھے بے امداد غیر
تھے نہ یہ اُڑنے کے پر، چلنے کے پیر

ہاتھ اور بازو، یہ سب بے کار تھے
سخت بے بس تھے اور تم لاچار تھے

آنکھ سے چیپڑ چھڑا سکتے نہ تھے
منہ سے مکھی تک اُڑا سکتے نہ تھے

آگ پانی میں نہ تھی تم کو تمیز
تھا تمھیں زہر اور امرت ایک چیز

رات دن یکساں سراسر تھا تمھیں
دھوپ اور سایہ برابر تھا تمھیں

بھوک میں بے چین ہو جاتے تھے، پر
اپنی بے چینی سے تھے تم بے خبر

پیاس لگتی تھی تو روتے تھے سدا
مانگنا پانی مگر آتا نہ تھا

کھا لیا جو کچھ دیا تم کو کھلا
پی لیا جو کچھ دیا تم کو پلا

تلخ و شیریں میں نہ تھا کچھ امتیاز
اس سے رغبت تھی نہ اس سے احتراز

یہ زباں زوری کہیں اصلا نہ تھی
تھی زباں منہ میں مگر گویا نہ تھی

سب کو رو رو کر جگاتے تھے، مگر
اپنے رونے کی نہ تھی تم کو خبر

تھی نہ اپنے نفع و نقصاں کی سمجھ
درد کی سدھ تھی نہ درماں کی سمجھ

دیتے تھے بہر شفا دارو اگر
سر پہ رو رو تم اُٹھا لیتے تھے گھر

گرمی اور سردی میں جب کپڑے تمھیں
ہم پہناتے تھے تو کرتے تھے ضدیں

کیچڑ اور گارے سے نفرت کچھ نہ تھی
اور نجاست سے کراہت کچھ نہ تھی

واں اگر ہوتا نہ دم ماں باپ کا
کون رکھوالا تھا اس دم آپ کا

دل کا کہہ سکتے نہ تھے تم مدعا
بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا

بھوکے یا پیاسے اگر ہوتے تھے تم
کچھ نہ کہتے تھے مگر روتے تھے تم

ہم سمجھ لیتے تھے لیکن مدعا
بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا

پیاس میں مضطر جو پاتے تھے تمھیں
بن کہے پانی پلاتے تھے تمھیں

بھوک میں گر دیکھتے تھے بے قرار
دودھ تھے تم کو پلاتے بار بار

روپ تھے معلوم سارے آپ کے
سب سمجھتے تھے اشارے آپ کے

تم کو کچھ تکلیف ہوتی تھی اگر
خود بخود تھی دل کو ہو جاتی خبر

چین ہو جاتا تھا سارا برطرف
پھرتے تھے بے تاب دوڑے ہر طرف

حالتیں سب تھے تمھاری جانتے
آپ کے تیور تھے ہم پہچانتے

ہوتے تھے بیمار، دور از حال، جب
رات دن سہتی تھی ماں رنج و تعب

بارہا آنکھوں میں کٹ جاتی تھی رات
اک بلا آتی تھی جب آتی تھی رات

ڈرتے تھے تم غیر عورت سے سدا
ماں کی گودی سے نہ ہوتے تھے جدا

اوپری صورت سے تھے تم بھاگتے
دودھ ہرگز غیر کا پیتے نہ تھے

پر کبھی تم سے دریغ اس کو نہ تھی
گو تمھارے کام آتی جان بھی

آج بیماری سے فرصت تھی نہ کل
آج چیچک، کل تھا پسلی کا خلل

کرتے تھے سیانوں کی جا جا منتیں
مانتے تھے نت ہزاروں منتیں

ناز اٹھاتے تھے طبیبوں کے سدا
ڈھونڈتے پھرتے تھے شربت اور دوا

عامل اور سیانوں نے جو مانگا دیا
منہ نہ پیسے کا کبھی ہم نے کیا

سخت بیماری کو جب پاتے تھے ہم
فکر کے مارے گھلے جاتے تھے ہم

رات اور دن ماں الگ تھی بے قرار
باپ پھرتا تھا الگ زار و نزار

اللہ آمیں کر کے ہم لیتے تھے نام
کرتے تھے دم تم پہ سورہ صبح و شام

آنکھ پر آتا تھا گر میل آپ کے
دم پہ بن جاتی تھی ماں اور باپ کے

چاہتے تھے تم کو خوش آٹھوں پہر
تم بسورے اور بنی یاں جان پر

آپ کی خاطر اٹھائے دکھ پہ دکھ
دس برس تک ایک دن پایا نہ سکھ

ہم پہ گزریں کیسی کیسی سختیاں
گزریں دشمن پر نہ ایسی سختیاں

آئے گی خدمت ہماری یاد جب
ہو گے تم خود صاحب اولاد جب

کی چھٹی ہم نے تمھاری جس طرح
کی ہو شاید ہی کسی نے اس طرح

مونڈن اور ختنہ کیا کس دھوم سے
شہر کو کھانا دیا کس دھوم سے

ہو چکی جب رسم بسم اللہ کی
رائے تھی اس وقت ایک اک کی یہی

تم کو مکتب میں بٹھانا چاہیے
پڑھنے لکھنے پر لگانا چاہیے

پر نہ مانا دل نے اپنے زینہار
ڈالتے اس عمر میں تم پر یہ بار

ایک دو بار امتحاں کے طور پر
تم کو مکتب میں جو دیکھا بھیج کر

سارا دن بے کل تمھاری ماں رہی
اور پڑی تم میں ہماری جاں رہی

پھر تمھارا ہم نے جب دیکھا یہ حال
تم کو ہے جانے سے مکتب کے ملال

جاتے ہو جب بے مزا ہوتے ہو تم
گھڑیوں ضد کرتے ہو اور روتے ہو تم

جلد مکتب سے اُٹھا ہم نے لیا
آپ کے دل پر نہ میل آنے دیا

دل میں سمجھا ہو نہ جب بچے کو شوق
لطف اسے پڑھنے میں آئے اور نہ ذوق

بھیجنا مکتب میں ہے اس کو ستم
باز آئے ایسے پڑھوانے سے ہم

اپنی رُت پر آپ بڑھ چڑھ لو گے تم
وقت جب آئے گا خود پڑھ لو گے تم

دوستوں نے ہم کو سمجھایا بہت
اپنے بیگانوں نے ہلسایا بہت

کھیل کی جب لگ گئی بچے کو چاٹ
ہو گیا جی پڑھنے لکھنے سے اچاٹ

کارگر ہو اس کو پند اور قید کیا
اس کے پڑھنے کی ہے پھر امید کیا

یوں سنورنے کا نہیں زنہار یہ
حق میں ہے زہر اس کے لاڈ اور پیار یہ

پیار سے سمجھے تو یوں سمجھاؤ تم
ورنہ اٹھتے بیٹھتے دھمکاؤ تم

وقت یہ اغماض کرنے کا نہیں
اب کا بگڑا پھر سنورنے کا نہیں

کہتے تھے اپنے پرائے سب یہی
آتی تھی آواز روز و شب یہی

تم کو لیکن ہم نے جھڑکی تک نہ دی
جبر کرنے کو کبھی چاہا نہ جی

سن تمھارا جب زیادہ کچھ ہوا
پھر پڑھانے کا ارادہ کچھ ہوا

اک معلم رکھا اور اک خوش نویس
یاد ہو گی تم کو ان دونوں کی فیس

ایک کو پانچ ایک کو ملتے تھے دس
یہ رہے نوکر برابر دو برس

اپنے اپنے فن میں تھے ہشیار یہ
پر رہے دونوں سدا بے کار یہ

گرچہ تھی تاکید دونوں کی شدید — پر نہ دی تم نے کبھی ان کو رسید
تم کو کب فرصت تھی کود اور پھاند سے — بھاگتے تھے تم نوشت اور خواند سے
مفت کی تنخواہ وہ پاتے رہے — نام کو ہر روز یاں آتے رہے
تم نے آخر جب نہ کچھ پڑھ کر دیا — دے کے کچھ، دونوں کو رخصت کر دیا
ہم نے یہ سمجھا کہ کوشش ہے فضول — ساری تدبیریں ہیں اپنی بے اصول
لکھنا اور پڑھنا ہے سب تقدیر کا — تنگ ہے یاں قافیہ تدبیر کا
جب ہوئے فضل الٰہی سے جواں — سر پہ شادی کا چڑھا بارِ گراں
منگنیاں ہوتی ہیں اکثر قوم میں — بیاہ ہوتے ہیں برابر قوم میں
کچھ بہت درکار زیور ہے نہ نقد — ہوتے اک شربت کے پیالے پر ہیں عقد
گر کفایت سوچتے کچھ خرچ میں — بیاہ دیتے بس یونہی ہم بھی تمھیں
اپنے دل میں پر یہی ہم نے کہا — ایک بیٹا اور وہ بھی لاڈلا
گو تمام املاک بک جائے مگر — خرچ کیجیے بیاہ میں دل کھول کر
کی اگر یاں بھی کفایت پر نگاہ — اور ہم کو کون سے کرنے ہیں بیاہ
وقت یہ آتے نہیں پھر بار بار — کل خزاں ہے آج اگر یاں ہے بہار
ہے فراغت اور عسرت ساتھ ساتھ — کرلیں کچھ ہم بھی کہ اب چلتا ہے ہاتھ
ٹھان کر یہ جی میں دی شادی رچا — اپنے سے جو ہو سکا سب کچھ کیا
گر نہ یاد اپنا رہا تم کو بیاہ — شہر کے چھوٹے بڑے ہیں سب گواہ
رات دن جلسہ تھا ناچ اور رنگ کا — غلغلہ تھا ڈھولک اور مردنگ کا
دیکھنے آتی تھی خلقت جھوم جھوم — دور تک اس بیاہ کی پہنچی تھی دھوم
دور سب کے دل سے رنج وغم رہا — بیس دن تک یاں یہی عالم رہا
جانتے ہیں قوم کے برنا و پیر — آج تک دیتے ہیں سب اس کی نظیر
کی نہ دینے میں کفایت پر نظر — جس کو دینا تھا دیا دل کھول کر
اگلی اور پچھلی، پرانی اور نئی — شہر کی املاک ساری بک گئی

قرضہ تھا نقدی کا باقی جس قدر
گو ہوئی اس سے سبک دوشی مگر

رہن تھے جو گاؤں شادی میں کیے
آج تک بے چین ہوں ان کے لیے

ہے بہت ان کے چھٹانے کا خیال
پر بظاہر ان کا چھٹنا ہے محال

اب بہت نازک ہے حالت باپ کی
پہنچی یہ نوبت بدولت آپ کی

مال اور جاں سے زیادہ کوئی چیز
آدمی کو یاں نہیں ہوتی عزیز

جان سے بھی ہم رہے خدمت گزار
مال بھی ہم نے کیا تم پر نثار

تم نے جو چاہا کھلایا وہ تمھیں
تم نے جو مانگا پہنایا وہ تمھیں

گھوڑے چڑھنے کے لیے تم کو دیے
رکھے خدمت گار خدمت کے لیے

شوق جو اچھا برا تم نے کیا
ہم نے بھی تائید کی اس کی سدا

خوب تم نے قدر کی ماں باپ کی
خوب خدمت کی ہماری داد دی

تھا نتیجہ جاں فشانی کا یہی؟
تھا صلہ سوز نہانی کا یہی؟

باپ کا تم کو ادب اصلا نہیں
ماں کی خدمت کی تمھیں پروا نہیں

گھر میں دو دو دن نہیں آتے ہو تم
آتے ہو اک اک سے لڑ جاتے ہو تم

لوگ شاکی ہیں تمھارے جا بجا
خود برا کہہ کہہ کے سنتے ہو برا

ہیں تمھارے سارے اوباشوں کے ڈھنگ
تم سے خوردوں اور بزرگوں کو ہے ننگ

ملنے والے ہیں تمھارے بادہ خوار
اور جواری ہیں تمھارے دوست دار

مرغ ہم نے بھی لڑائے ہیں بہت
اور کبوتر بھی اڑائے ہیں بہت

پر ہمارا حال تم جیسا نہ تھا
خبط تھا ہم کو بھی پر ایسا نہ تھا

اپنے سب کاموں کو جب بھگتا لیا
دو گھڑی اس میں بھی دل بہلا لیا

تم تو دنیا اور دیں سب چھوڑ کر
ہو انہی دھندوں میں غرق آٹھوں پہر

ہے غرض ایسی ہی جو ہے تم کو دھت
فکر دنیا ہے نہ فکر آخرت

ہم پہ سب ہنستے ہیں اشراف اور رذیل
کر دیا تم نے بھی ہم کو اب ذلیل

کر چکا تھا قرض پہلے ہی زبوں
اور تم نے کر دیا عزت کا خوں

منہ نہیں ہوتا کسی کے رو بہ رو
خاک میں تم نے ملا دی آبرو

بہتر اپنا یاں سے اٹھ جانا ہے اب
رہ گیا پھر کیا، گئی عزت ہی جب

باپ کا تم جانتے ہو اپنے حال
قرض میں جکڑا ہوا ہے بال بال

ہاتھ میں زر ہے نہ بازو میں ہے زور
مار کر فکروں نے کر ڈالا ہے بھور

کام کی باقی نہیں اپنے میں تاب
مدتوں سے دے چکی ہمت جواب

گور میں لٹکائے بیٹھے پاؤں ہیں
جا کے اب بن میں بساتے گاؤں ہیں

آپ میں ہوتا اگر کچھ حوصلہ
آدمیت کا تھا اب یہ مقتضا

سر پہ لیتے اپنے گھر کا بوجھ ٹک
باپ کو فکروں سے کر دیتے سبک

ہم رہے جیسے فدا تم پر مدام
تم بڑھاپے میں ہمارے آتے کام

ہم رہے اب تک تمھارے سربراہ
اب ہمارے بنتے تم پشت و پناہ

ہم بھی یاں سکھ پاتے کچھ اولاد کا
نام چلتا دیکھتے اجداد کا

پر خدا کو تھا یہی منظور آہ
ہوتے وارث کے ہو گھر اپنا تباہ

جب کریں دنیا سے آہنگ سفر
ہم بھرا گھر جائیں ویراں چھوڑ کر

خیر اب ہم کو تو یاں رہنا ہے کم
کوئی دن کے اور ہیں مہماں ہم

پر تمھیں ہے کاٹنی اک عمر یاں
ہو ابھی فضل الٰہی سے جواں

اب بھی اپنی حرکتوں سے باز آؤ
ڈھیل پر بازی دوراں کی نہ جاؤ

بس گئیں حد سے گزر رسوائیاں
کب تلک آخر یہ بے پروائیاں

ناز و نعمت کا زمانہ ہو چکا
خوابِ غفلت کا زمانہ ہو چکا

گردشِ گردوں ہے ہر دم گھات میں
شاطر دوراں ہے فکر مات میں

ہاتھ سے جا کر نہیں آتا ہے وقت
دیکھو بھائی ہاتھ سے جاتا ہے وقت

گر رہے اب بھی یوں ہی تم نادرست
خود زمانہ تم کو کر دے گا درست

گردشیں دیں گی نکال ایک ایک بل
ٹھوکریں کھا کھا کے جاؤ گے سنبھل

پھر سنبھلنا واں یہ کس کام آئے گا
جب سنبھلنے سے نہ سنبھلا جائے گا

ہو گی اڑنے کی ہوس تم کو مگر
ہوں گے اڑنے کے نہ اس دم بال و پر

عقل ہو گی پر نہ ہو گا اقتدار
عزم ہو گا پر نہ ہو گا اختیار

جب کہ گیتی رنگ یہ دکھلائے گی
تب ملامت باپ کی یاد آئے گی

(بیٹے کا جواب)

باپ یہ سب کر چکا تقریر جب
سر جھکا کر از رہِ شرم و ادب

عرض کی بیٹے نے ارشاد آپ کا
قبلہ عالم! سراسر ہے بجا

باپ کی اور والدہ کی شفقتیں
آخری دم تک نہ بھولیں گی ہمیں

حق ہیں سب سینے میں مضمر آپ کے
نقش ہیں احسان دل پر آپ کے

میری جو دل جوئیاں کیں آپ نے
وہ نہ کی ہوں گی کسی ماں باپ نے

اچھے سے اچھا کھلایا آپ نے
اچھے سے اچھا پہنایا آپ نے

جان و دل ہم پر فدا کرتے رہے
ناز برداری سدا کرتے رہے

ہے بڑے افسوس کا لیکن مقام
شفقتیں کچھ آپ کی آئیں نہ کام

وہ محبت اور نوازش آپ کی
حق میں اپنے زہر قاتل ہو گئی

خدمت عالی میں، گستاخی معاف
عرض کر سکتا نہیں میں صاف صاف

پر جہاں ہو بات کہنے کا محل
واں نہیں خاموش رہنے کا محل

گو کہ ہوں میں سر بسر تقصیر وار
مجھ سے ہے نوعِ بشر کو ننگ و عار

دھوم ہے میری بدی کی جا بجا
عیب ہے مجھ سے بزرگوں کو لگا

کو بکو آوارہ صبح و شام ہوں
شہر میں رسوا ہوں اور بدنام ہوں

بے ہنر مجھ سے نہیں ہوتے کہیں
پر مری تقصیر کچھ اس میں نہیں

اُٹھے ہم جیسے اُٹھایا آپ نے
بن گئے جیسے بنایا آپ نے

کہتے ہیں 'اخبار' میں آیا ہے یہ
مخبرِ صادق نے فرمایا ہے یہ

اصل فطرت میں ہیں سب بچے رشید
غیب سے آتے ہیں سب بن کر سعید

پھر اسی رستے پہ پڑ جاتے ہیں وہ
رخ جدھر ماں باپ کا پاتے ہیں وہ

آئے تھے ہم جستجو میں راہ کی
تھی فقط درکار ہم کو رہبری

آپ نے جو راہ دی ہم کو بتا
ہم نے لی وہ راہ بے چون و چرا

آپ کے انعام اور احسان سب
یوں اگر کہیے تو لوں میں مان سب

پر اگر انصاف کچھ فرمائیں آپ
اس طرح مجھ کو نہ پھر شرمائیں آپ

ذکر بچپن کا جو فرماتے ہیں آپ
اپنے احسانوں سے شرماتے ہیں آپ

ہاں مقرر مامتا ماں باپ کی
حق میں بچوں کے ہے اک نعمت بڑی

گر نہ ہو ماں باپ کو ان کا خیال
پرورش پانا ہو بچوں کا محال

پر نہیں دخل اس میں کچھ انسان کا
اس میں ہے ماں باپ کا احسان کیا

جان دے پانی اگر کھیتی میں ڈال
یا وہ کر دے خشک پودوں کو نہال

اس میں پانی کا نہیں کچھ اختیار
ہے یہ خاصیت عطائے کردگار

کچھ نہیں تخصیص یاں انسان کی
ہے یہی خصلت ہر اک حیوان کی

جانور بھی جو نہیں رکھتے تمیز
سب کو بچے اپنے ہوتے ہیں عزیز

بھوک میں لیتے ہیں سب ان کی خبر
پیاس میں کرتے ہیں سب حلق ان کا تر

زد میں جب دشمن کی پاتے ہیں انھیں
زد سے دشمن کی بچاتے ہیں انھیں

آنکھ سے اوجھل وہ ہو جاتے ہیں جب
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہر سو مضطرب

ہے غرض اُلفت وہی حیوان کو
لاگ جو بچوں سے ہے انسان کو

دی ہے آگ اک دل میں قدرت نے لگا
جس سے دل بس میں نہیں ماں باپ کا

جب کہ قابو میں نہیں رہتا ہے دل
مانتے ہیں دل کی جو کہتا ہے دل

فکر میں گھٹنا سدا اولاد کے
جھیلنے دکھ برملا اولاد کے

کچھ خوشی ماں باپ کے دل کی نہیں
پر کریں کیا، مانتا دل ہی نہیں

وہ تو کرتے لاکھ بار ان سے گریز
کیا کریں، ہے آتما کی آنچ تیز

اس خدا نے، ذات ہے جس کی حکیم
جس کی حکمت اور حکومت ہے قدیم

ہوش خوردوں کو نہیں جب تک دیا
ان کا ضامن ہے بزرگوں کو کیا

تا کہ بے ہوشی میں لیں ان کی خبر ۔۔۔ چوکسی ان کی کریں آٹھوں پہر
ہوں اگر بھوکے تو کچھ ان کو کھلائیں ۔۔۔ ہوں اگر پیاسے تو کچھ ان کو پلائیں
جاگتے سوتے ہوں ان کے پاسباں ۔۔۔ بیٹھتے اُٹھتے ہوں ان پر جاں فشاں
ان کو بے کل دیکھ کر ہوں بے قرار ۔۔۔ ان کی بیماری میں ہوں تیمار دار
بے بسی کے دن نکلواتا ہے یوں ۔۔۔ اپنے مدہوشوں کو پلواتا ہے یوں
ہر بشر کو دی ہے مہر اولاد کی ۔۔۔ اس طرح دنیا ہے یہ آباد کی
گر نہ ہو یہ مامتا انسان میں ۔۔۔ خانماں ویراں ہو سب اک آن میں
اس سے بچ سکتا کوئی انساں نہیں ۔۔۔ اس میں کچھ اولاد پر احساں نہیں
جب کہ دُکھتا ہے کوئی عضو بدن ۔۔۔ سارے ہو جاتے ہیں بے کل مرد وزن
کرتے ہیں تدبیر، ہو سکتی ہے جو ۔۔۔ درد کی تکلیف کھو سکتی ہے جو
درد کی جب تک کسک جاتی نہیں ۔۔۔ کچھ کیے بن ان کو بن آتی نہیں
ہے یہی بالکل مثال اولاد کی ۔۔۔ کیوں کہ ہے جزوِ بدن اولاد بھی
کل سے ان کی کل سدا پاتے ہیں دل ۔۔۔ دکھ سے ان کے سب کے دکھ جاتے ہیں دل
پیاس میں بچوں کو روتا دیکھ کر ۔۔۔ کیا کریں پانی نہ دیں ان کو اگر
بھوک میں جب روئیں بچے زار زار ۔۔۔ چھوڑ دیں کس طرح ان کو بے قرار
ان پہ گر سختی گزرتی ہے ذرا ۔۔۔ ان سے یاں دو چند ہوتی ہے سوا
ان کا خوش جس بات سے ہوتا ہے جی ۔۔۔ حصر ہے اس بات پر ان کی خوشی
ان کی کلفت ہے بلا ان کے لیے ۔۔۔ ان کی فرحت ہے غذا ان کے لیے
طبع انساں کا ہے یہ جب اقتضا ۔۔۔ کیا کرے گر ہو نہ بچوں پر فدا
اپنی راحت خوش نہیں آتی کسے ۔۔۔ اپنی آسائش نہیں بھاتی کسے
جب کہ مصرف دودھ کا کوئی نہ پائیں ۔۔۔ کیوں نہ مائیں اپنے بچوں کو پلائیں
ان کو بن بچوں کے نیند آئے نہ جب ۔۔۔ کیوں نہ چھاتی سے لگا کر سوئیں سب
کس طرح غافل ہوں پھر اولاد سے ۔۔۔ جب نہ بن دیکھے ہو چین اولاد کے

کہتے ہیں بچوں کو ہم کرتے ہیں پیار — اور دل کو اپنے دیتے ہیں قرار
ظاہراً ان کی خوشی کرتے ہیں یہ — اور ٹھنڈا اپنا جی کرتے ہیں یہ
مار پر ہاتھ ان کی اٹھتا ہے اگر — دل کو رہتا ہے قلق دو دو پہر
اس لیے رکھتے ہیں ان کو پیار سے — کیوں کہ دل دکھتا ہے ان کی مار سے
پیار انھیں کرتے ہیں سب اپنے لیے — ان کا دم بھرتے ہیں سب اپنے لیے
ایک شفقت میں ہے دہری منفعت — پرورش ان کی اور اپنی مصلحت
چین پر ان کے بھی ہو شاید نظر — ان سے چین اپنا مقدم ہے مگر
بھول کر بھی نام وہ ان کا نہ لے — پر طبیعت چین یاں لینے بھی دے
شفقتیں ایسی ہی سمجھیں آپ سب — کرتے ہیں بچوں پہ جو ماں باپ سب
اب رہی شادی، چھٹی اور بیاہ کی — رسم مونڈن اور بسم اللہ کی
گو ہے یاں دم مارنا بے غیرتی — ناسپاسی اور کافر نعمتی
بات لیکن بے کہے بنتی نہیں — خواہ نفریں کیجیے خواہ آفریں
شادیوں میں آپ نے جو کچھ کیا — میری تقریبوں میں جو جو کچھ دیا
تھا وہ سب کچھ اپنی عزت کے لیے — نیک نامی اور شہرت کے لیے
تھا بہانا یہ کہ ہے عقدِ پسر — تھی مگر اپنی نمائش پر نظر
ہر طرف مدح و ثنا تھی آپ کی — ہر زباں پر واہ وا تھی آپ کی
چپ تھے سارے خردہ گیر اور نکتہ چیں — سب یہ کہتے تھے کہ حضرت آفریں!
دوست ہی کرتے نہ تھے بس واہ وا — دشمنوں نے بھی لیے تھے سر جھکا
معترف بیگانے اور اپنے تھے سب — تھا جہاں چرچا یہی تھا روز و شب
تھا ہمارا کام، اور نام آپ کا — بلکہ تھا سب نام اور کام آپ کا
یاں نہ ہم کو دھیان تک شادی کا تھا — اور نہ ارماں گھر کی آبادی کا تھا
بیاہ یا شادی کا جب سنتے تھے نام — تھا ہمیں ایک اک کا منہ تکنے سے کام
ہم کو تھا شادی سے ایسا ہی لگاؤ — بیاہ کا ہو جیسے اک گڈے کو چاؤ

آپ کے دل میں تھے کچھ ارماں بھرے — بیاہ اٹھا کر وہ ہمارے سر دھرے
مفت ہم شرمندہ احساں ہوئے — اور پورے آپ کے ارماں ہوئے
گھر میں جو نقدی تھی یا اسباب تھا — یا سہارا تھا کچھ اک جائیداد کا
کی نہ حضرت نے نظر انجام پر — کر دیا قربان سب اک نام پر
آپ کی تو نبھ گئی عزت کے ساتھ — سو سے بہتر عیش اور عشرت کے ساتھ
پر ہماری کس طرح ہو گی بسر — گھر میں دولت ہے نہ ہاتھوں میں ہنر
ہے ہمیں اب آفتوں کا سامنا — ہو گیا عزت کا مشکل تھامنا
کر دیا خوں زور و زر کا آپ نے — گھاٹ کا رکھا نہ گھر کا آپ نے
آپ کو ہوتا اگر منظور یہ — کاشکیں ہم سے رہیں سب دور یہ
جورِ گردوں سے نہ ہوں پامال ہم — بعد حضرت کے رہیں خوش حال ہم
شادیوں میں رائیگاں کھوتے نہ مال — اپنی شہرت کا نہ کرتے کچھ خیال
کھولتے ہم پر نہ در افلاس کے — چھوڑ جاتے کچھ ہمارے واسطے
ہم پہ احساں آپ یاں کرتے اگر — علم کی دولت سے کرتے بہرہ ور
کھول کر تعلیم میں دل کرتے خرچ — ہوتا کچھ ہوتا اگر کاموں میں حرج
علم کا تھا ہم کو بے شک شوق کم — کانپتے تھے نام سے پڑھنے کے ہم
بے خبر تقدیر کی گھاتوں سے تھے — بھاگتے ہم کام کی باتوں سے تھے
تھے نصیحت سے بزرگوں کی نفور — رہتے تھے سائے سے ان کے دور دور
پاس عزت کا نہ ڈر ذلت کا تھا — پردہ آنکھوں پر پڑا غفلت کا تھا
تھے مگر ہر طرح بس میں آپ کے — حکم سے باہر نہ تھے ماں باپ کے
ہم سے سرزد جب خطا ہوتی کوئی — یا کہ حرکت نا سزا ہوتی کوئی
گو کہ دل کڑھتا سزا سے آپ کا — دل پہ کرتے جبر، پر دیتے سزا
آپ کی خفگی کا ڈر ہوتا اگر — تربیت کا کچھ نہ کچھ ہوتا اثر
گر وطن میں تربیت آساں نہ تھی — کچھ جدائی خارج از امکاں نہ تھی

سوچتے انجام کی بد بختیاں — کرتے فرقت کی گوارا سختیاں
بھیج دیتے گھر سے باہر چند روز — لیتے دھر چھاتی پہ پتھر چند روز
مصلحت پر کرتے الفت کو فدا — کچھ دنوں اپنے سے کر دیتے جدا
یاد سے اپنی بھلا دیتے ہمیں — پر کسی قابل بنا دیتے ہمیں
گر جدائی آپ کو آتی نہ راس — دل ہماری یاد میں رہتا اداس
دردِ فرقت سے نہ کچھ گھبراتے آپ — دل بہلتا جس طرح بہلاتے آپ
شادیوں میں خرچ جو اٹھا فضول — ہم کو آخر کیا ہوا اس سے حصول
تربیت میں اپنی وہ اٹھتا اگر — ہم نہ ہوتے خوار شاید اس قدر
گھر میں کچھ باقی نہ رہتا اپنے جب — چار سو پاتے کھلی راہِ طلب
ہاتھ میں ہوتا اگر کچھ بھی ہنر — رہتے عزت سے نکل جاتے جدھر
اپنے حق جتنے بتائے آپ نے — ہم پہ جو احساں جتائے آپ نے
یوں تو ہیں وہ قابل تسلیم سب — کیوں کہ ہے ہم کو یہی حُکمِ ادب
کرتے ہیں جب دل میں لیکن غور ہم — اپنا حصہ ان میں کچھ پاتے ہیں کم
یاد ہیں سب ہم کو احساں آپ کے — کچھ امیدیں تھیں، کچھ ارماں آپ کے
اپنی خوشیاں کرتے تھے پوری مگر — تھی مصالح پر ہماری، کم نظر
ایسے احسانوں سے ہو دل شاد کیا — ہم بزرگوں کو کریں گے یاد کیا

(بیٹے کی ندامت)

باپ سے جوشِ جوانی میں پسر — باتیں یہ کہتے تو کہہ گزرا مگر
کہہ کے جی میں اپنے شرمایا بہت — جرأتِ بے جا سے پچھتایا بہت
گو دیے الزام سب اپنے مٹا — پر نہ مٹ سکتا تھا حق ماں باپ کا
دے رہا تھا باپ کو زک صاف صاف — کہہ رہا تھا دل مگر اس کے خلاف
دعوے احساں سے سبک دوشی کے تھے — پر دبی جاتی تھی گردن بوجھ سے
گو زباں بس میں نہ تھی نادان کی — پر گلے میں تھی کمند احسان کی

کر کے عذرِ شوخ چشمی باپ سے   گر پڑا قدموں پہ آ کر باپ کے

دل جو اُمڈا دیر تک روتا رہا   متصل اشکوں سے منہ دھوتا رہا

(باپ کی دوبارہ نصیحت)

گو ہوئی تھی باپ کو خفت کمال   پر یہ دیکھا اس نے جب بیٹے کا حال

جلد قدموں پر سے سر اس کا اٹھا   اپنی چھاتی سے لیا اس کو لگا

پھر کہا بیٹے سے اے لخت جگر!   کیوں ہوئی تم کو ندامت اس قدر

تم نے جو الزام ہیں مجھ کو دیے   اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو گی مجھے

شکر ہے اتنی تو ہے تم کو خبر   باپ نے رکھا ہے تم کو بے ہنر

سب برے تم سے سلوک اس نے کیے   جو بھلائی کی، وہ کی اپنے لیے

باپ تو کہتا ہی تھا تم کو برا   تم نے کر دی باپ کی ثابت خطا

چاہیے اس کے سوا کیا باپ کو   باپ کے تم رہنما پیری میں ہو

پر مری جاں ہم تو ہیں پا در رکاب   آنے والی ہے اجل سر پر شتاب

فی الحقیقت گر ہوئی ہم سے خطا   حاصل اب اس کے جتانے سے ہے کیا

عمر رفتہ پھر ملے جب باپ کو   اس نصیحت پر عمل تب ہو تو ہو

جب کہیں بیٹا ہو پیدا دوسرا   عمر بھی خالق کرے اس کو عطا

اور رہے سر پر سلامت باپ بھی   بات بھی بگڑی نہ ہو پھر باپ کی

تب نصیحت ہو تمھاری سود مند   ہو سکے تب باپ اس پر کاربند

جب کہ یہ ممکن نہیں اے جانِ جاں   ہے ہمیں الزام دینا رائیگاں

سرزنش کا وقت ہی جب ہو چکا   سرزنش اب تم نے کی ہم کو تو کیا

رُت ہماری تو گئی ساری گزر   ہو ابھی تم جوہرِ قابل مگر

غلطیاں سب باپ کی ہو جانتے   اپنے نیک و بد کو ہو پہچانتے

راہ پر چاہو تو آ سکتے ہو تم   ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم

ہو گئی پا لغز جو کچھ باپ سے   ہے تلافی اس کی ممکن آپ سے

تربیت بے جا کریں ہم، یا بجا ‌ ‌ ‌ تربیت ماں باپ کی ہے چیز کیا
نوجوانی کا نشہ چڑھتا ہے جب ‌ ‌ ‌ سب دھری رہتی ہے تعلیم اور ادب
ہاں مگر جو عقل خود رکھتے ہیں یاں ‌ ‌ ‌ ٹھیک رہتے ہیں وہی ہو کر جواں
ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب ‌ ‌ ‌ کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب
پہلے اپنا سوچ لو انجام تم ‌ ‌ ‌ دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم
ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے، مگر ‌ ‌ ‌ اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور
اب بھی گر حالت نہ بدلی آپ کی ‌ ‌ ‌ آپ کی بھی پھر مثل ہو گی وہی
باپ نے بیٹے کو نالائق کہا ‌ ‌ ‌ بیٹا نالائق ہی سچ مچ بن گیا
تا کہ کہنا باپ کا جھوٹا نہ ہو ‌ ‌ ‌ نسبت نالائقی بے جا نہ ہو
ہے پسندیدہ اطاعت باپ کی ‌ ‌ ‌ پر نہ ایسی جیسی اس لڑکے نے کی
ہے اگر بیٹا ! اطاعت اس کا نام ‌ ‌ ‌ ایسی نا واجب اطاعت کو سلام

12 ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

(سنہ تصنیف: 1888، ہیئت: مثنوی، ماخذ: کلیات نظم حالی)

ہے لیاقت جن میں کچھ قدرِ قلیل ‌ ‌ ‌ اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل
ان کو ایسوں سے نہیں ملنا روا ‌ ‌ ‌ جو لیاقت رکھتے ہیں ان سے سوا
اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں ‌ ‌ ‌ دیکھنا لازم پہاڑ اس کو نہیں
سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر ‌ ‌ ‌ شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر
چاہیے دن کو نہ نکلے زینہار ‌ ‌ ‌ ورنہ ہو گا اپنے جی میں شرم سار

حواشی

1 کلیات حالی، بک کارنر، جہلم پاکستان، ص545

2 ایضاً، ص546

3 ایضا، ص548

4 ایضا، 2015، ص548

5 اسلم پرویز: حالی نظم اردو انجمن پنجاب الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ 2002، ص259

6 اے خدا اس سے ہمیں فائدہ ہو، نقصان نہ ہو۔

7 کلیات حالی، بک کارنر، جہلم پاکستان، ص573

8 Good Subject: اچھی رعایا

9 یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اس کو اردو میں بہ اضافہ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے۔ (حالی)

10 خس کی ٹٹی مراد ہے۔

11 لاہور میں جہاں یہ مثنوی لکھی گئی تھی، ایک سلطان کا کنواں مشہور ہے جس کا پانی نہایت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں وہاں آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ (حالی)

12 یارب ہمیں اس سے فائدہ ہو، نقصان نہ پہنچے۔

13 یہاں سے اخیر تک کچھ اشعار بہ رعایت موسم اپنے حسب حال بے اختیار ٹپک پڑے ہیں۔ ان دنوں ہجوم امراض اور دیگر عوارض کی وجہ سے لاہور میں رہنا فی الواقع نہایت شاق معلوم ہوتا تھا اور وطن کی طرف واپس آنے کے لیے کوشش کی جاتی تھی۔ (حالی)

14 اجدھیا (سنسکرت: ایودھیا، ہندی: اجودھیا یا اجدھیا) اودھ میں دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک قدیم تاریخی شہر، راجہ دسرتھ کی راجدھانی۔ یہاں یہ لفظ ہندی تلفظ کے مطابق (بہ تخفیف یا) نہیں باندھا گیا بلکہ 'دھیا' کو 'پیا' اور 'دیا' کے وزن پر پڑھا جائے گا۔ (1 ص)

15 کھتا یا کھتی: زمیں دوز گڑھا جس میں اناج بھرا جاتا ہے۔

16 روکھ: (ہندی) درخت

17 وشنو کا پیرو، ایک قسم کا ہندو فقیر

18 'عیدو والے' اور 'شیخو والے' پہلوانوں کے دو مقابل گروہ دلی میں تھے جن میں سے ایک کے سرگروہ اور استاد کا نام عیدو اور دوسرے کا نام شیخو تھا۔ (حالی)

19 کندلا: (ھ، سنسکرت: کندل) سونے کا تار، سونے کا ڈلا۔ 'کندلے کا کام' سے مراد تارکشی کا کام۔
20 تاریخ (History) اور جغرافیہ (Geography)
21 پن: نیکی یا ثواب کا کام۔ پاپ: بدی یا گناہ
22 ایک قسم کا جوتا جس میں نوک نہیں ہوتی۔ چوڑی ٹو کا بوٹ
23 'رسم فونڈیشن' کی طرح یہ ترکیب بھی حالی کی اجتہادی غلطی سمجھی جائے گی۔
24 مختلف نسخوں میں 'بہوار' چھپا ہے لیکن صحیح صورت 'بیوہار' ہے۔
25 کنونڈا: (1) شرمندہ، احسان مند۔ (2) ذلیل، رسوا۔ (3) ناقص، عیب دار۔ (نور اللغات)
26 مختلف نسخوں میں 'شاہ کا ڈر' چھپا ہے، لیکن یہاں 'ساہ' ہونا چاہیے جو ہندی میں مہاجن اور مال دار کے علاوہ کھرا اور دیانت دار کے معنی میں بولا جاتا ہے۔
27 صحیح لفظ معاتب ہے مگر اردو میں بجائے معاتب کے معتوب بولا جاتا ہے جیسے بجائے مفعو کے معاف۔ پس اردو میں یہ ہی صحیح اور فصیح ہے۔ (حالی)
28 سیر: لہسن، انگوزہ، ہینگ
29 یعنی ہر آن اس کی ایک نرالی شان ہے۔
30 Definition: تعریف
31 معتزلی: عقلیت پسند حکما و متکلمین، قدریہ۔ اشعری: وہ حکما جو عقل پر وحی و وجدان کی فوقیت کے قائل اور جبریت کی طرف مائل تھے۔
32 بھوگ: (دینا یا سنانا کے ساتھ) گالیاں دینا، (کھانا یا سننا کے ساتھ) گالیاں کھانا۔ (نور اللغات)
33 'تھا جس کو یقین چشمہ آب' (نسخہ شجاعت، صفحہ: 105، نسخہ فاضل، ص 145)
34 'کے سوا' (صفحہ: 105 و 145)
35 'ہر اک قوم' (نسخہ شجاعت، ص: 105۔ نسخہ فاضل، ص: 145)
36 نہایت چھوٹے، پردار کیڑے جو گولر میں بھرے رہتے ہیں۔
37 سچ کڑوا ہوتا ہے۔
38 ایلی: غالباً عبرانی لفظ ہے بمعنی اللہ۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہوتے وقت خدا کو اسی نام سے پکارا تھا۔
39 ارقم: حضرت ابو عبداللہ بن عبد مناف، مشہور صحابی جن کا مکان (دار ارقم) میں تبلیغ اسلام کا مرکز تھا۔
40 مثنویات کے دونوں نسخوں میں 'بناتی' ہے۔ (ص 111 و 151)

41 لم اور لا دونوں حروف نفی ہیں، مراد انکار و تردید۔

42 الشعراء تلميذ الرحمان (شعرا خدا کے شاگرد ہیں یعنی شاعری کا ملکہ وہبی ہے، کسبی نہیں)
براعت: فضیلت، کمالِ ہنر (نیز روشنی، فصاحت)

43 قرآن میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں فرماتا ہے: "وما علمناه الشعر وما ينبغي له"
(ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا اور یہ اس کی شان کے لائق بھی نہیں)

44 مراد حضرت سارہؑ (حضرت ابراہیمؑ کی بیوی) جیسی تقدس مآب

45 'گوش شادی' مجموعہ نظم حالی، طبع لاہور (ص:77)

46 سورۃ الشعرا کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (اور وہ جو کچھ کہتے
ہیں، خود اس پر عمل نہیں کرتے)۔ (القرآن 226:26)

47 اِنْ اَعْطَيْتَنِيْ: اگر تو نے مجھے عطا کیا۔

48 جو کچھ کثیف و مکدر ہے اسے چھوڑ دے، جو پاکیزہ ہے اسے لے لے۔

49 مثنویات حالی کے دونوں نسخوں میں اس نظم کا سنہ تصنیف 1882 درج ہے، لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ
خاں کا خیال ہے کہ غالباً یہ نظم 1887 میں لکھی گئی۔ (حالی کا ذہنی ارتقا، ص 107)۔ ڈاکٹر شجاعت علی
نے بھی اپنے تحقیقی مقالے 'حالی بحیثیت شاعر' (ص 86) میں 1887 درج کیا ہے۔ (1 ص)

باب دوم

حقوق زنان اور ہمدردی نسواں کی نظمیں

1 مناجات بیوہ

(سنہ تصنیف: 1884، ہیئت: مثنوی، ماخذ: مثنویات حالی)[1]

اے سب سے اول اور آخر   جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے سب داناؤں سے دانا   سارے تواناؤں سے توانا
اے بالا ہر بالا تر سے   چاند سے سورج سے امبر سے
اے سمجھے بوجھے بن سوجھے   جانے پہچانے بن بوجھے
سب سے انوکھے سب سے نرالے   آنکھ سے اوجھل دل کے اُجالے
اے اندھوں کی آنکھ کے تارے   اے لنگڑے لولوں کے سہارے
ناتیوں سے چھوٹوں کے ناتی   ساتھیوں سے بچھڑوں کے ساتھی
ناؤ جہاں کی کھینے والے   دکھ میں تسلی دینے والے
جب، اب، تب تجھ سا نہیں کوئی   تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی
جوت ہے تیری جل اور تھل میں   باس ہے تیری پھول اور پھل میں
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا   تو پاس اور گھر دور ہے تیرا
راہ تری دشوار اور سکڑی   نام ترا رہگیر کی لکڑی
تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا   تو ہے سہارا غمگینوں کا

تو ہے اکیلوں کا رکھوالا
تو ہے اندھیرے گھر کا اُجالا

لاگو[2] اچھے اور برے کا
خواہاں کھوٹے اور کھرے کا

بید نراسے بیماروں کا
گاہک مندے بازاروں کا

سوچ میں دل بہلانے والا
بپتا میں یاد آنے والا

اے بے وارث گھروں کے وارث
بے بازو بے پروں کے وارث

بے آسوں کی آس ہے تو ہی
جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی

بس والے ہیں یا بے بس ہیں
تو نہیں جن کا وہ بے کس ہیں

ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا
دسرایت کی واں نہیں پروا

دل میں ہے جن کے تیری بڑائی
گنتے ہیں وہ پربت کو رائی

بے کس کا غم خوار ہے تو ہی
بری بنی کا یار ہے تو ہی

دکھیا، دکھی، یتیم اور بیوہ
تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا

تو ہی ڈبوئے تو ہی ترائے
تو ہی یہ بیڑے پار لگائے

تو ہی مرض دے تو ہی دوا دے
تو ہی دوا دارو میں شفا دے

تو ہی پلائے زہر کے پیالے
تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے

تو ہی دلوں میں آگ لگائے
تو ہی دلوں کی لگی بجھائے

چمکارے چمکار کے مارے
مارے مار کے پھر چمکارے

پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے
مار میں بھی اک تیری مزا ہے

***

اے رحمت اور ہیبت والے
شفقت اور دباغت والے

اے اٹکل اور دھیان سے باہر
جان سے اور پہچان سے باہر

عقل سے کوئی پا نہیں سکتا
بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا

ایک کو تو نے شاد کیا ہے
ایک کے دل کو داغ دیا ہے

اس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا
اس سے نہ تو بے زار کچھ ایسا

ہر دم تیری آن نئی ہے
جب دیکھو تب شان نئی ہے

یاں پچھوا ہے واں پروا ہے
گھر گھر تیرا حکم نیا ہے

پھول کہیں کمہلائے ہوئے ہیں
اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں

کھیتی ایک کی ہے لہراتی
ایک کا ہر دم خون سکھاتی

ایک پڑے ہیں دھن کو ڈبوئے
ایک ہیں گھوڑے بیچ کے سوئے

ایک نے جب سے ہوش سنبھالا
رنج سے اس کو پڑا نہ پالا

ایک نے اس جنجال میں آ کر
چین نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر

مینہ کہیں دولت کا ہے برستا
ہے کوئی پانی تک کو ترستا

ایک کو مرنے تک نہیں دیتے
ایک اکتا گیا لیتے لیتے

حال غرض دنیا کا یہی ہے
غم پہلے اور بعد خوشی ہے

رنج کا ہے دنیا کے گلہ کیا
تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا

یاں نہیں بنتی رنج سہے بن
رنج نہیں سب ایک سے لیکن

ایک سے یاں رنج ایک ہے بالا
ایک سے ہے درد ایک نرالا

گھاؤ ہے گو ناسور کی صورت
پر اسے کیا ناسور سے نسبت

تپ وہی دق کی شکل ہے لیکن
دق نہیں رہتی جان لیے بن

دق ہو وہ یا ناسور ہو، کچھ ہو
دے نہ جواب امید کسی کو

روز کا غم کیونکر سہے کوئی
آس نہ جب باقی رہے کوئی

تو ہی کر انصاف اے مرے مولا
کون ہے جو بے آس ہے جیتا

گو کہ بہت بندے ہیں پر ارماں
کم ہیں مگر، مایوس ہیں جو یاں

خواہ دکھی ہے خواہ سکھی ہے
جو ہے اک امید اس کو بندھی ہے

کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سوکھی
آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی

گھاٹا جن کو اساڑھی میں ہے
ساوَنی کی اُمید انھیں ہے

ڈوب چکی ہے جن کی اگیتی
دیتی ہے ڈھارس ان کو پچھیتی

ایک ہے اس اُمید پہ جیتا
اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا

ایک کو جو اولاد ملی ہے
اس کو اُمنگ اب شادیوں کی ہے

رنج ہے یا قسمت میں خوشی ہے
کچھ ہے مگر اک آس بندھی ہے

غم نہیں ان کو، گو غمگیں ہیں
جو دل نا امید نہیں ہیں

کال میں کچھ سختی نہیں ایسی
کال میں ہے جب آس سمیں[1] کی

سہل ہے موجوں سے چھٹکارا
جب کہ نظر آتا ہے کنارا

پر نہیں اُٹھ سکتی وہ مصیبت
آئے گی جس کے بعد نہ راحت

شاد ہو اس رہگیر کا کیا دل
مر کے کٹے گی جس کی منزل

ان اُجڑوں کو کل پڑے کیوں کر
گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر

ان بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا
جن کو نہ ملنے دے گا زمانا

اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی
مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی

آئیں بہت دنیا میں بہاریں
عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں

پڑے بہت باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے

گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں کھلیں بہت برساتیں

پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

آس ہی کا یاں نام ہے دنیا
جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا

ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ
جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ

رونا ان بن باسیوں کا ہے
دیس نکالا جن کو ملا ہے

حکم سے تیرے پر نہیں چارا
کڑوی میٹھی سب ہے گوارا

زور ہے کیا پتے کا ہوا پر
چاہے جدھر لے جائے اُڑا کر

تنکا اک اور سات سمندر
جائے کہاں موجوں سے نکل کر

قسمت ہی میں جب تھی جدائی
پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی

آج کی بگڑی ہو تو بنے بھی
ازل کی بگڑی خاک بنے گی

تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا — بندے کا یاں بس نہیں چلتا
مارے اور نہ دے تو رونے — تھپکے اور نہ دے تو سونے
ٹھہرے بن آتی ہے نہ بھاگے — تیری زبردستی کے آگے
تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاہیں — بند ہیں چاروں کھونٹ کی راہیں
تو مارے اور خواہ نوازے — پڑی ہوں میں تیرے دروازے
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں — تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں
ماں ہی سدا بچے کو مارے — اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

***

اے مرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں — دنیا سے بے زار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے — منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
دکھ دل کا کچھ کہہ نہیں سکتی — اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتی
تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا — تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے — لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا — غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے — ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
کیسا تھا یہ بیاہ نناواں — جونہی پڑا اس کا پرچھاواں
چین سے رہنے دیا نہ جی کو — کر دیا ملیا میٹ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک — اور روؤں تو روؤں کہاں تک
ہنس ہنس دل بہلاؤں کیوں کر — اوسوں پیاس بجھاؤں کیوں کر

ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا　　ایک نہ ہنستا بھلا نہ روتا
لیٹیے گر سونے کے بہانے　　پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے
جاگیے تو بھی بن نہیں پڑتی　　جاگنے کی آخر کوئی حد بھی
اب کل ہم کو پکڑے گی مر کر　　گور ہے سونی سیج سے بہتر
بات سے نفرت، کام سے وحشت　　ٹوٹی آس اور بجھی طبیعت
آبادی جنگل کا نمونا　　دنیا سونی اور گھر سونا
دن بھیانک اور رات ڈرانی　　یوں گزری ساری یہ جوانی
بہنیں اور بہنیلیاں میری　　ساتھ کی تھیں جو کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے　　خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ　　جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ
کوئی نہیں دل کا بہلاوا　　آ نہیں چکتا میرا بلاوا
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا　　کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
تھک گئی میں دکھ سہتے سہتے　　تھم گئے آنسو بہتے بہتے
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر　　گھل گئی جان اندر ہی اندر
دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے　　جان کو پھونکا دل کی لگی نے
دبی تھی بھوبھل میں چنگاری　　لی نہ کسی نے خبر ہماری
قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی　　شہر میں وہ دھومیں ساہوں کی
آئے دن تیوہاروں کا آنا　　اور سب کا تیوہار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں　　وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں　　وہ ارمان بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں　　خیر، کٹیں جس طور سے کاٹیں
چاؤ کے اور خوشیوں کے ہمیں سب　　آتے ہیں خوش، کل جان کو ہو جب
رنج میں ہیں سامان خوشی کے　　اور جلانے والے جی کے

گھر برکھا اور پیا بدیسی   آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
دن یہ جوانی کے کٹے ایسے   باغ میں پنچھی قید ہو جیسے
رُت گئی ساری سر ٹکراتے   اُڑ نہ سکے پر ہوتے ساتے
ہوگی کسی نے کچھ کل پائی   مجھے تو شادی راس نہ آئی
آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ   پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ
رہ گیا دے کر چاند دکھائی   چاند ہوا پر عید نہ آئی
رت بدلی پر ہوئی نہ برکھا   بادل گرجا اور نہ برسا
پھل کی خاطر برچھی کھائی   پھل نہ ملا اور جان گنوائی
ریت میں ذرے دیکھ چمکتے   دوڑ پڑی میں جھیل سمجھ کے
چاروں کھونٹ نظر دوڑائی   پر پانی کی بوند نہ پائی

***

اے دین اور دنیا کے مالک   راجا اور پرجا کے مالک
بے پر اور پردار کے والی   اے سارے سنسار کے والی
پورب، پچھّم، دکھن، اتر   بخشش تیری عام ہے گھر گھر
پیاؤ لگی ہے سب کے لیے یاں   خواہ ہوں ہندو خواہ مسلماں
ہو نہ اگر قسمت نے کمی کی   کی نہیں بندی تو نے کسی کی
چیونٹا، کیڑا، مچھر، بھنگا   کچھوا، مینڈک، سیپ اور گھونگا
سارے پنچھی اور پکھیرو   مور، پپیہا، سارس، پیرو
بھیڑ اور بکری، شیر اور چیتے   تیرے جلائے سب ہیں جیتے
سب پہ کھلا ہے در رحمت کا   برس رہا ہے مینہ نعمت کا
خاک سے تو نے بیج اُگائے   پھر پودے پروان چڑھائے
سیپ کو بخشی تو نے دولت   اور بخشا مکھی کو امرت
لکڑی میں پھل تو نے لگائے   اور کوڑے پر پھول کھلائے

ہیرا بخشا کان کو تو نے
مشک دیا حیوان کو تو نے

جگنو کو بجلی کی چمک دی
ذرے کو کندن کی دمک دی

دین سے تیری اے مرے مولا
سب ہیں نہال ادنیٰ اور اعلیٰ

عام ہے سب پر تیری رحمت
ہیں محروم مگر بد قسمت

پیڑ ہوں چھوٹے یا کہ بڑے یاں
فیض ہوا کا سب پہ ہے یکساں

پھلتے ہیں جو ہیں پھلنے والے
جلتے ہیں جو ہیں جلنے والے

جب اپنی ہی زمیں ہو کلر
پھر الزام نہیں کچھ مینہ پر

سب کو ترے انعام تھے شامل
میں ہی نہ تھی انعام کے قابل

گر کچھ آتا بانٹ میں میری
سب کچھ تھا سرکار میں میری

تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں
نون کو ترسی میں سانبھر میں

راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی
سدا برت سے چلی ہوں بھوکی

پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں
آئی تھی کیوں اس نگری میں؟

ہونے سے میرے فائدہ کیا تھا؟
کس لیے پیدا مجھ کو کیا تھا؟

آن کے آخر میں نے لیا کیا؟
مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا؟

نین دیے اور کچھ نہ دکھایا
دانت دیے اور کچھ نہ چکھایا

جندڑی [4] دی اور خوشی نہ بخشی
دل بخشا، دل لگی نہ بخشی

رہی اکیلی بھری سبھا میں
پیاسی رہی بھری گنگا میں

چین سے جاگی اور نہ سوئی
میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی

آ کے خوشی سی چیز نہ پائی
جیسی آئی ویسی نہ آئی

کھایا تو کچھ مزا نہ آیا
سوئی تو کچھ چین نہ پایا

پھول ہمیشہ آنکھ میں کھٹکے
اور پھل سدا گلے میں اٹکے

ہو نہ سکی کچھ دل سے عبادت
اور نہ جمی کاموں پہ طبیعت

کام سنوارا کوئی نہ یاں کا
اور نہ کیا دھندا کوئی واں کا

کام آیا یاں کوئی نہ میرے	اور نہ میں کام آئی کسی کے
قسمت نے جب سے منہ موڑا	آدمیوں کا ہو گیا توڑا
باپ اور بھائی، چچا بھتیجے	سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے
پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا	جس کو ہو میری جان کی پروا
ناتیوں میں شفقت نہیں پاتی	اپنوں میں اپنایت نہیں پاتی
گھر ہے یہ اک حیرت کا نمونا	سو گھر والے اور گھر سونا
جس نے خدا کا خوف کیا کچھ	آ کے کبھی یاں پوچھ لیا کچھ
سو یہ خوشی کا دل کی ہے سودا	زور کسی پر اب نہیں اپنا
اس میں شکایت کیا ہے پرائی	اپنی ہی قسمت کی ہے برائی
چین گر اپنی بانٹ میں آتا	کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے	کیوں ہوتے اوروں کے حوالے
آٹھ پہر کیوں دکھ یہ اُٹھاتے	جیتے ہی جی کیوں مر جاتے
دکھ میں نہیں یاں کوئی کسی کا	باپ نہ ماں، بھائی نہ بھتیجا
سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی	''سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی''

***

تیرے سوا اے رحم کے بانی	کون سنے یہ رام کہانی
ایک کہانی ہو تو کہوں میں	ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
حال نہ ہو دشمن کا ایسا	میرا نازک حال ہے جیسا
کوئی نہیں لاگو اب میرا	باپ نہ بھائی، ساس نہ سسرا
آنکھ میں ایک اک کے ہوں کھٹکتی	پر اپنے بس مر نہیں سکتی
ماں اور باپ عزیز اور پیارے	بے کل ہیں جینے سے ہمارے
روکے پلک نم کر نہیں سکتی	ہنس کے غلط غم کر نہیں سکتی
رویئے تو سب روتے ہیں گھر کے	رونے نہیں دیتے جی بھر کے

ہنسیے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو　　کیونکہ الٰہی کاٹیے غم کو
گر سسرال میں جاتی ہوں میں　　نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جس وقت ہوں آتی　　رو رو کر ہوں سب کو رلاتی
جب سے یہ دن قسمت نے دکھائے　　تکتے ہیں جو ہیں اپنے پرائے
میرا سدا ہنسنا اور رونا　　بیٹھنا، اٹھنا، جاگنا، سونا
سوچ میں میرے سارا گھر ہے　　میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی　　پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی
جانتی ہوں نازک ہے زمانا　　بات ہے اک یاں عیب لگانا
موتی کی سی آب ہے عزت　　جا کے نہیں آتی پھر حرمت
مہندی میں نے لگانی چھوڑی　　پٹی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی　　عطر نہیں میں بھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی　　بال نہیں برسوں گندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی　　اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی
کان میں پتے ہاتھ میں کنگن　　پہن چکی سب جب تھی سہاگن
پہنچیوں کا ارمان نہیں اب　　چوڑیوں کا کچھ دھیان نہیں اب
اُڑ گئیں دل کی سب وہ ترنگیں　　چاؤ رہے باقی نہ اُمنگیں
آپ کو یاں تک میں نے مٹایا　　پر دنیا کو صبر نہ آیا
وہم نے ہے ایک ایک کو گھیرا　　جب دیکھو تب ذکر ہے میرا
کھینچ چکا ہے میرا مقدر　　داغ بدی کا میری جبیں پر
مل جاؤں گر خاک میں بھی میں　　بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں
سچ اگلے لوگوں نے کہا ہے　　"بد اچھا بدنام برا ہے"
جینے سے گھبرا گئی ہوں میں　　اس دم سے تنگ آ گئی ہوں میں
یوں نہ بری اس جان پہ بنتی　　ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی

رہتے ہم انجان بلا سے — دنیا مجھ سے، میں دنیا سے
اے بے آسروں کے رکھویّا! — اے ڈوبے بیڑوں کے کھویّا!
کی جیو میری کشتی بانی — آ پہنچا ہے ڈباؤ پانی
اب تیرے گی ترائی تیری — ڈوبی ناؤ، دہائی تیری

***

اے امبر کے چمکتے تارو! — اے گھر کے در اور دیوارو!
اے جانی پہچانی راتو! — تنہائی کی ڈرانی راتو!
اے نیک اور بد کے دربانو! — دیکھتی آنکھو! سنتے کانو!
ایک دن اس گندی دنیا سے — جانا ہے مالک کے آگے
بوجھ ہیں واں سب تلنے والے — پترے سب کے کھلنے والے
جب واں پوچھ ہو تیری میری — تم سب دیجو گواہی میری
میں نیکی کا دم نہیں بھرتی — پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی
کیونکہ خطا سے بچ سکتا ہے — جس نے کچا دودھ پیا ہے
خواہ ولی ہو خواہ رشی ہو — اس سے رہائی نہیں کسی کو
گنوں اگر میں اپنی خطائیں — ہے یہ یقیں گنتی میں نہ آئیں
پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی — منہ پہ یہ آئے بن نہیں رہتی
خواہ بری تھی خواہ بھلی میں — بات سے اپنی نہیں ٹلی میں
پڑی تھی جس بے دید کے پالے — ہوئی تھی جس بیری کے حوالے
نام پہ دھونی اس کے رما کر — آن کو رکھا جان گنوا کر
ساتھ نہ قوم اور دیس کا چھوڑا — اور نہ خدا کے عہد کو توڑا
آئے اگر دنیا کو نہ باور — اب مجھے کچھ دنیا کا نہیں ڈر
میرا نگہباں اور رکھوالا — سب سے بڑا ہے جاننے والا

***

اے ایمان کے رکھنے والے　　اے نیت کے پرکھنے والے
میں نہیں رکھتی کام کسی سے　　چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پہ چلتی تیرے اگر میں　　چین سے کرتی عمر بسر میں
مانتی گر میں عقل کا کہنا　　مجھ کو نہ پڑتا رنج یہ سہنا
کچھ نہ عدالت کا تھا ڈراوا　　اور نہ مذہب کا اٹکاوا
ہے دستور یہی دنیا کا　　آپ سے اچھا نام خدا کا
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی　　مرضی غم خواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے　　قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی سے ہم کو ندامت　　ناک رہے کنبے کی سلامت
جان کسی کی جائے تو جائے　　آن میں اپنی فرق نہ آئے
دم پہ بنے جو اس کو سہوں میں　　لوٹتی انگاروں پہ رہوں میں
درد نہ وہ دل کا کہیں ظاہر　　چپکے ہی چپکے کام ہو آخر
مر مٹوں اور کچھ منہ پہ نہ لاؤں　　جل بجھوں اور اُف کرنے نہ پاؤں
گھٹ گھٹ کر دم اپنا گنوا دوں　　جل جل کر آپے کو بجھا دوں
تجھ پہ ہے روشن اے مرے مولا　　وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا
بیڑا تھا منجدھار میں میرا　　چار طرف چھایا تھا اندھیرا
تھاہ تھی پانی کی نہ کنارا　　تیرے سوا تھا کچھ نہ سہارا
شرم ادھر دنیا کی مجھے تھی　　فکر ادھر عقبیٰ کی مجھے تھی
روکتے تھے حملے مجھے دل کے　　تھا مجھے جینا خاک میں مل کے
نفس سے تھی دن رات لڑائی　　دور تھی نیکی پاس برائی
جان تھی میری آن کی دشمن　　آن تھی میری جان کی دشمن
آن سنبھالے جان تھی جاتی　　جان بچاتے آن تھی جاتی

طے کرنے تھے سات سمندر — حکم یہ تھا ہاں پاؤں نہ ہوں تر
کوئلا چاروں کھونٹ تھا پھیلا — حکم یہ تھا پلا [6] نہ ہو میلا
پیاس تھی لو تھی اور تھی کھر سا [7] — اور دریا سے گزرنا پیاسا
دھوپ کی تھی پالے پہ چڑھائی — آگ اور گندھک کی تھی لڑائی
درد اپنا کس سے کہوں کیا تھا — آ کے پہاڑ اک مجھ پہ گرا تھا
نفس سے ڈر تھا مجھ کو بدی کا — اس لیے ہر دم تھی یہ تمنا
مر جاؤں یا زندہ رہوں میں — تجھ سے مگر شرمندہ نہ ہوں میں
جان بلا سے جائے تو جائے — پر کہیں دینی بات نہ آئے
کی نہ کسی نے میری خوشی گو — میں نے کیا نا خوش نہ کسی کو
بات کسی کی میں نے نہ ڈالی — اپنے ہی دم پر سب کی بلا لی
جان نہ سمجھا جان کو اپنی — دیا نہ جانے آن کو اپنی
قول پہ اپنے جمی رہی میں — ہوئی نہ ڈانواں ڈول کبھی میں
دل تھاما آپے کو سنبھالا — سانس تلک منہ سے نہ نکالا
اور نہ اگر کرتی میں ایسا — کیوں کر کرتی اور کرتی کیا
بن نہیں آتی دیس سے بھاگے — کچھ نہیں چلتی دیس کے آگے
کہہ گئی سچ اک راج کماری — ''لا چاری پر پیت ہے بھاری''

***

اے اچھے اور برے کے بھیدی — کھوٹے اور کھرے کے بھیدی
چھپی ڈھکی کے کھولنے والے — بری بھلی کے تولنے والے
بھید دلوں کے جاننے والے — پاپ اور پن کے چھاننے والے
عیب اور گن سب تجھ پہ ہیں روشن — پاپ اور پن سب تجھ پہ ہیں روشن
عیب نہ اپنا تجھ کو جتانا — ہے دائی سے پیٹ چھپانا
میں نہیں آخر پاک بدی سے — بنی ہوں پانی اور مٹی سے

تو نے بنایا تھا مجھے جیسا
چاہیے تھا ہونا مجھے ویسا

بس ہمیں جتنا تو نے دیا ہے
اس سے سوا قدرت ہمیں کیا ہے

کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو
جن جن پر تھا یاں مجھے قابو

سب کو بدی سے میں نے بچایا
سب کو خودی سے میں نے مٹایا

اُٹھتے بیٹھتے روکا سب کو
سوتے جاگتے ٹوکا سب کو

ہاتھ کو ہلنے دیا نہ بے جا
پاؤں کو چلنے دیا نہ ٹیڑھا

آنکھ کو اٹھنے دیا نہ اتنا
جس سے کہ پیدا ہو کوئی فتنہ

کان کو رکھا دور بلا سے
اوپری آوازوں کی ہوا سے

روک کے یوں اور تھام کے آپا
میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا

ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا
تھا بے تاب جو اندر والا

حال کروں میں دل کا بیاں کیا
حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا

دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی
مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی

جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی
اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی

گو دم بھر اس دل کی لگی نے
ٹھنڈا پانی دیا نہ پینے

تو ہے مگر اس بات کا دانا
میں نے کہا دل کا نہیں مانا

زور تھا میرا دل پہ جہاں تک
میں نے سنبھالا دل کو وہاں تک

تھامنا دل کا کام تھا میرا
اور تھمانا کام تھا تیرا

پکڑے اگر تو دل کی خطا پر
میں راضی ہوں تیری رضا پر

رکھ تکلیف میں یا راحت میں
ڈال جہنم یا جنت میں

اب نہ مجھے جنت کی تمنا
اور نہ خطرہ کچھ دوزخ کا

آئے گی جنت راس کب اس کو
جلنے میں جس کی عمر کٹی ہو

ڈر دوزخ کا پھر اسے کیا ہو
جس نے رنڈاپا جھیل لیا ہو

پر تجھ سے اک عرض ہے میری
رد نہ ہو گر درگاہ میں تیری

جو قسمت نے مجھ کو دکھایا
خوش نا خوش سب میں نے اُٹھایا

مجھ ناچیز کی ہے کیا طاقت
جو منہ پر کچھ لاؤں شکایت

عمر بہت سی کاٹ چکی ہوں
یہ دن بھی کٹ جائیں گے جوں توں

اپنے لیے کچھ کہہ نہیں سکتی
پر یہ کہے بن رہ نہیں سکتی

میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا
پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا

بس کے بہت یاں اجڑ گئے گھر
بن کے ہزاروں بگڑ گئے گھر

جلیں کروڑوں اسی لپٹ میں
پدموں پھنکیں اسی مرگھٹ میں

بالیاں ایک اک ذات کی لاکھوں
بیاہیاں ایک اک رات کی لاکھوں

ہو گئیں آخر اسی الم میں
کاٹ گئیں عمریں اسی غم میں

سیکڑوں بے چاری مظلومیں
بھولی، نادانیں، معصومیں

بیاہ سے انجان اور منگنی سے
بنے سے واقف اور نہ بنی سے

ماؤں سے جو منہ دھلواتی تھیں
رو رو مانگ کے جو کھاتی تھیں

تھپک تھپک تھے جن کو سلاتے
گھڑک گھڑک تھے جن کو کھلاتے

جن کو نہ شادی کی تھی تمنا
اور نہ منگنی کا تھا تقاضا

جن کو نہ آپے کی تھی خبر کچھ
اور نہ رنڈاپے کی تھی خبر کچھ

بھلی سے واقف تھیں نہ بری سے
بد سے مطلب تھا نہ بدی سے

رخصت چالے اور چوتھی کو
کھیل تماشا جانتی تھیں جو

ہوش جنھیں تھا رات نہ دن کا
گڑیوں کا سا بیاہ تھا جن کا

دو دو دن رہ رہ کے سہاگن
جنم جنم کو ہوئیں بروگن

دولہا نے جانا نہ دلہن کو
دلہن نے پہچانا نہ سجن کو

دل نہ طبیعت، شوق نہ چاہت
مفت لگا لی بیاہ کی تہمت

شرط سے پہلے بازی ہاری
بیاہ ہوا اور رہیں کنواری

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے

پھول کھلے جس وقت چمن میں　　جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پتیم　　جب ہوئی پیت گنوایا پتیم
ہوش سے پہلے ہوئی میں بیوہ　　کب پہنچے گا پار یہ کھیوا
خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا　　دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہنچانی　　کاٹنی ہے بھر پور جوانی
شام کے مردے کا ہے یہ رونا　　ساری رات نہیں اب سونا
آئی نہیں دنیا میں الٰہی　　ایسی کسی بیڑے پہ تباہی
آئیں بلکتی گئیں سسکتی　　رہیں ترستی اور پھڑکتی
کوئی نہیں جو غور کرے اب　　نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب
دکھ ان کا آئے اور پوچھے　　روگ ان کا سمجھے اور بوجھے
چوٹ نہ جن کے دل پہ لگی ہو　　وہ کیا جانیں دل کی لگی کو
بے دردوں سے پڑا ہے پالا　　تو ہی اب ان کا ہے رکھوالا
اپنی بیتی ہے یہ کہانی　　اب یہ دھان رہے بن پانی

***

اے غم خوار ہر اک بے کس کے　　حامی ہر عاجز بے بس کے
ہے اپنے عاجز بندوں پر　　پیار ترا ماں باپ سے بڑھ کر
جس نے لگی میں تجھ کو پکارا　　سامنے تیرے ہاتھ پسارا
پھرا نہ خالی اس چوکھٹ سے　　گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے
کس کو زمانے نے ہے ستایا　　تو نہیں جس کے آڑے آیا
اُجڑے کھیڑے تو نے بسائے　　ڈوبے بیڑے تو نے ترائے
مظلوموں کی داد کو پہنچا　　قیدیوں کی فریاد کو پہنچا
بنجر ملک آباد کرائے　　اور بردے آزاد کرائے
عام تری رحمت جب ٹھہری　　دور ہے پھر رحمت سے تیری

داد ہر اک مظلوم کی دے تو
اور رانڈوں کی خبر نہ لے تو
عورت ذات کا تنہا جینا
ہر دم خون جگر کا پینا
گھر بسنے کی آس نہ رہنی
ساری عمر جدائی سہنی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے
بپتا ہے جو کہی نہ جائے
قدر اس کی یا تو پہچانے
یا جس پر گزری ہو وہ جانے

***

اے خاوند خداوندوں کے
مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خاوندی کا
صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو
کسی کو بے وارث مت کیجو
کیجو جو کچھ تیری خوشی ہو
رانڈ مگر کیجو نہ کسی کو
مسند تکیہ عزت حرمت
نوکر چاکر دولت حشمت
چاندی سونا نقدی غلا
گہنا پاتا ٹوم اور چھلا
سائیں بن جو چیز ہے گھر میں
خاک ہے سب عورت کی نظر میں
دل کی خوشی اک آس پہ تھی سب
سو وہ ہزاروں کوس گئی اب
پھول کچھ اب کانٹوں سے نہیں کم
جنت بھی ہو تو ہے جہنم
باغ نظر میں اس کی خزاں ہے
آنکھ میں تاریک اس کی جہاں ہے
عیش ہے اس کے واسطے ماتم
عید ہے اس کے حق میں محرم
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا
کر اسے تو پیوند زمیں کا
یا عورت کو پہلے بلا لے
یا دونوں کو ساتھ اُٹھا لے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی
جس سے گئی ہے پریت یہاں کی
جس سے ہوئے دل سیکڑوں بسمل
جس نے ہزاروں کو دیے گھائل
جس نے کلیجے آگ میں بھونے
جس نے بھرے گھر کر دیے سونے
خوف دلوں سے کھو دیا جس نے
شرم سے دے دے دھو دیے جس نے

قوم کی جس بن آن ہے جاتی　　دیس کی جس پر جان ہے جاتی
جس نے کیے دل رحم سے خالی　　ریت ہے جو دنیا سے نرالی
قوم سے تو یہ ریت چھڑا دے　　بندیوں کی بیڑی یہ تڑا دے
سہل اور مشکل تجھ کو ہے یکساں　　ہم کو ہے مشکل تجھ کو ہے آساں
رنج اور دکھ قبضے میں ہے تیرے　　چین اور سکھ قبضے میں ہے تیرے
ہلتے ہیں پتے تیرے ہلائے　　کھلتے ہیں غنچے تیرے کھلائے
مٹھی میں ہیں تیری ہوائیں　　قابو میں ہیں تیرے گھٹائیں
تجھ سے ہے دریاؤں کی روانی　　تیرے بہائے بہتے ہیں پانی
جھیل، سمندر، پربت، رائی　　کہنے میں ہے سب تیرے خدائی
ناتا، رشتہ، نسبت، شادی　　سوگ، رنڈاپا، قید، آزادی
قوم کی ریتیں، دیس کی رسمیں　　کیا ہے وہ جو تیرے نہیں بس میں
کام کوئی مشکل نہیں تجھ کو　　ایک یہ کیا، گر تیری خوشی ہو
سوت لگے پتھر سے نکلنے　　ناؤ لگے ریتی میں چلنے

***

اے عزت اور عظمت والے　　رحمت اور عدالت والے
دکھڑا تجھ سے کہنا دل کا　　اک بشریت کا ہے تقاضا
دل پہ ہے جب برچھی کوئی چلتی　　آہ کلیجے سے ہے نکلتی
جب کوئی دکھ یاد آ جاتا ہے　　جی بے ساختہ بھر آتا ہے
ورنہ ہے اس دنیا میں دھرا کیا　　خواب کا سا اک ہے یہ تماشا
دکھ سے ہے یاں کے گھبرانا کیا　　سکھ پہ ہے یاں کے اترانا کیا
عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی　　سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی
آنی جانی چیز ہیں خوشیاں　　چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں
منگنی، بیاہ، برات اور رخصت　　میل ملاپ، سہاگ اور سنگت

ہیں دو دن کے سب بہلاوے   آگے چل کر ہیں پچھتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دنیا   اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
بجلی جیسی چمک ہے اس کی   پل دو پل کی جھلک ہے اس کی
پانی کا سا ہے یہ پچارا   جگنو کا سا ہے چمکارا
آج ہے یاں جنگل میں منگل   کل سنسان پڑا ہے جنگل
آج ہے میلا ہر دم دونا   اور کل گاؤں پڑا ہے سونا
آج ہے رہنے کی تیاری   اور کل ہے چلنے کی باری
آج ہے پانا کل ہے کھونا   آج ہے ہنسنا کل ہے رونا
کبھی ہے بادھا کبھی ہے گھاٹا   کبھی جوار اور کبھی ہے بھاٹا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے   اس نگری کی ریت یہی ہے
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا   ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
خوشی میں غم یاں ملا ہوا ہے   امرت میں بس گھلا ہوا ہے
سیر کو جو اس باغ میں آئیں   دیکھ کے پھل کو ہاتھ لگائیں
یاں ہر پھل اندرائن کا ہے   دیکھنے سے چکھنے میں برا ہے
عیش جنھوں نے سدا اڑائے   وہ بھی ہیں آخر کو پچھتائے
رہے ہیں گر کر چڑھے ہیں جو یاں   گھٹے ہیں آخر بڑھے ہیں جو یاں
جو بیاہے وہ ہیں پچھتاتے   بن بیاہے ہیں بیاہ مناتے
اس پھل کا ہے یہی پریکھا   جو نہیں چکھا وہی ہے میٹھا
خوش نہ ہوں خوشیوں کے متوالے   ہیں یہ نشے سب اترنے والے
غم کی گھٹا آتی ہے گرجتی   گھڑی میں یاں گھڑیال ہے بجتی
رہگیروں کا بندھا ہے تانتا   ایک آتا ہے ایک ہے جاتا
جو آئے ہیں ان کو ہے جانا   جو گئے ان کو پھر نہیں آنا
خواہ ہوں رانڈ اور خواہ سہاگن   موت ہے سب کی جان کی دشمن

ایک ہے گو آج ایک سے بہتر — مر گئیں جب دونوں ہیں برابر
اور کوئی گر انصاف سے دیکھے — مر کے اسے نسبت نہیں اس سے
عیش گئی وہ چھوڑ کے یاں کے — قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے
اس کو پڑی کل اس کی گئی کل — یہ گئی ہلکی وہ گئی بوجھل
اس کا دل اس دنیا سے اُٹھانا — ہے ناخن سے گوشت چھٹانا
جان یہ آساں دیتی ہے ایسے — بو ہے نکلتی پھول سے جیسے
غم ہو غرض یا عیش ہو کچھ ہو — ہے ہمیں جانا چھوڑ کے سب کو
تیرے سوا یاں اے مرے مولا! — کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا
پڑی تھی سونی جب یہ نگریا — تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا
پھر یہ نگریا اجڑ کے ساری — تیری ہی رہ جائے گی اٹاری
تھا نہ کچھ آگے تیرے سوا یاں — اور رہے گا کچھ نہ سدا یاں
یاں کوئی دن دکھ پایا تو کیا — اور کوئی دم سکھ پایا تو کیا
اب نہ مجھے کچھ رنج کی پروا — اور نہ آسائش کی تمنا
چاہتی ہوں اک تیری محبت — اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے — تیرے سوا جو سب کو بھلا دے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں — کوئی رہے ارمان نہ جی میں
فکر ہو اچھی کی نہ بری کی — تیرے سوا دھن ہو نہ کسی کی
کوئی جگہ اس دل میں نہ پائے — یاد کوئی بھولے سے نہ آئے
سینہ یہ تجھ سے بھرا ہوا سارا — میت سمائے اس میں نہ پیارا
دل نے بہت یاں مجھ کو ستایا — موت کا برسوں مزا چکھایا
خواب میں دیکھ اک سوانگ نرالا — آگ میں جیتے جی مجھے ڈالا
میرا اور اپنا چین گنوایا — آپ جلا اور مجھ کو جلایا
اٹھ نہیں سکتے مجھ سے اب اک دم — یہ دنیا کے ناشدنی غم

دل میں لگن بس اپنی لگا دے — سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
غیر کے رشتے توڑ دے سارے — دل کے پھپھولے پھوڑ دے سارے
جب مجھے تنہا کیا ہے پیدا — تو مجھے بندھوا کر نہ کسی کا
واں سے اکیلی آئی ہوں جیسی — ویسی ہی یاں سے جاؤں اکیلی
ساتھ کوئی غم لے کے نہ جاؤں — تیرے سوا کھو دوں جسے پاؤں
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکا — کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشان پیاروں کا مٹا دوں — پیار کے منہ کو آگ لگا دوں
تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر — مار کے جاؤں لات جہاں پر
پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر — خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

2 چپ کی داد

(سنہ تصنیف: 1905، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: مخزن لاہور)[8]

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہی، قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن، تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ستونتیو! لے دے کے اب ست تم سے ہے
مونس ہو خاوندوں کی تم، غم خوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب، گھر بھر کی برکت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم بے کار کی
دولت ہو تم نادار کی، عسرت میں عشرت تم سے ہے
آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

***

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں، ماؤں کی تابعدار تم
دن بھر پکانا ریندھنا، سینا، پرونا، ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا اور ہوئیں بیدار تم
سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہاں نا خوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر، سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثل خار تم

پالا بروں سے گر پڑے، بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو، گو دل میں ہو بے زار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر

***

شادی کے بعد ایک ایک کو تھی آرزو اولاد کی
تم پھنس گئیں جنجال میں خالق نے جب اولاد دی
دردوں کے دکھ تم نے سہے، جاپے9 کی جھیلیں سختیاں
جب موت کا چکھا مزا تب تم کو یہ دولت ملی
میکے میں اور سسرال میں سب کے ہوئے دل باغ باغ
گھر میں اُجالا تو ہوا پر تم پہ بپتا پڑ گئی
کھانا پہننا اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم
بچوں کے دھندے میں تمھیں اپنی نہ کچھ سدھ بدھ رہی
تب تک بھی سمجھو خیر تھی جب تک بھلے چنگے تھے سب
پر سامنا آفت کا تھا گر ہو گیا ماندہ کوئی
سولی پہ دن کٹنے لگے راتوں کی نیندیں اڑ گئیں
اک اک برس کی ہو گئی اک ایک پل اک اک گھڑی
بچوں کی سیوا میں تمھیں گزرے ہیں جیسے دس برس
قدر اس کی جانے گا وہی دم پر ہو جس کے یوں بنی
کی ہے مہم جو تم نے سر، مردوں کو اس کی کیا خبر
جانے پرائی پیڑ وہ جس کی بوائی ہو پھٹی 10
تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دکھیاریو خدمت تمھارے سر پڑی

پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

***

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر چھٹپن میں یاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
یہ گوشت کا اک لوتھڑا پروان چڑھتا کس طرح
چھاتی سے لپٹائے نہ ہر دم رکھتی گر بچے کو ماں
وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ اور پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دنیا میں نورِ حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں
وہ شاہِ کشور گیر اسکندر کہ جس کی دھاک سے
تھے بید کی مانند لرزاں تاج دارانِ جہاں
وہ فخر شاہانِ عجم کسریٰ کہ جس کے عدل کی
مشرق سے تا مغرب زبانوں پر ہے جاری داستاں
کیا پھول پھل یہ سب انہی کمزور پودوں کے نہ تھے
سینچا تھا ماؤں نے جنھیں خونِ جگر سے اپنے یاں
کیا صوفیانِ با صفا، کیا عارفانِ با خدا
کیا اولیا کیا انبیا، کیا غوث کیا قطبِ زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

***

افسوس! دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
اکثر تمھارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تا کہ تم کو یک قلم خود لوحِ ہستی سے مٹا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمھارا تھا مگر کوئی نہ جز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اس وقت تم، جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمھیں ماں باپ نے اے بے زبانو اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری امید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائیگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا کہلائیں پھر بھی بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں

***

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گزر
زیبا ہے گر کہیے تمھیں فخرِ بنی نوعِ بشر
جو سنگ دل سفاک پیاسے تھے تمھارے خون کے
ان کی تو ہیں بے رحمیاں مشہور عالم میں مگر

تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ
شوہر ہوں اس میں یا پدر، یا ہوں برادر یا پسر
الفت تمھاری کر گئی گھر دل میں جس بے دید کے
وہ بد گماں تم سے رہا اے بد نصیبوں عمر بھر
گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی، نہ دنیا کو تمھاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہو گا ان حق تلفیوں کا واں جواب

***

گزرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں
تھا منحرف تم سے فلک، برگشتہ تھی تم سے زمیں
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں
یاں تک تمھاری ہجو کے گائے گئے دنیا میں راگ
تم کو بھی دنیا کی کہن کا آ گیا آخر یقیں

علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہو گئیں مایوس تم
سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہ تھیں
جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لیے
وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کے
تم بے وفا کہلائیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں
آخر تمھاری چپ دلوں میں اہلِ دل کے چبھ گئی
سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
بارے زمانہ نیند کے ماروں کو لایا ہوش میں
آیا تمھارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں

***

نوبت تمھاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمھارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سدا سچائی کی
پر فتح جب پائی ہے سچائی نے آخر پائی ہے
اے بے زبانوں کی زبانو، بے بسوں کے بازوؤ
تعلیمِ نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے
یہ مرحلہ آیا ہے تم سے پہلے جن قوموں کو پیش
منزل پہ گاڑی ان کی استقلال نے پہنچائی ہے
ہے رائی بھی پربت اگر دل میں نہیں عزمِ درست
پر ٹھان لی جب جی میں پھر پربت بھی ہو تو رائی ہے

یہ جیت بھی کیا کم ہے خود حق ہے تمھاری پشت پر
جو حق پہ منہ آیا ہے آخر اس نے منہ کی کھائی ہے
جو حق کے جانب دار ہیں بس ان کے بیڑے پار ہیں
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے
ہے جو مہم در پیش دستِ غیب ہے اس میں نہاں
تائید حق کا ہے نشاں امدادِ سلطانِ جہاں [11]

3 شکوہ ہند

(سنہ تصنیف: 1888، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)[8]

1

رخصت اے ہندوستاں! اے بوستانِ بے خزاں! رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں
آج گو شکووں سے ہیں لبریز ہم اے خاکِ ہند ہیں مگر احسان اگلے تیرے سب خاطر نشان
تو نے بیگانوں کی خاطر کی یگانوں سے سوا میہمان تھے پر بنایا تو نے ہم کو میزباں
تیرے باغوں کی فضاؤں نے دے دل سے بھلا شعب بوّان[12] و سمرقند و دمشق و اصفہاں
یاد کچھ جیحوں رہا ہم کو، نہ دجلہ اور فرات تیرے گنگا جل نے جب سے تر کیے کام و زباں
تیری کاشی کی کشش نے کر دیے ہم سے جدا یثرب و بطحیٰ و صنعا و زبید و نہرواں
تیرے ذوقِ نیشکر نے کر دیے سب دل سے محو بصرہ و طائف کے نارستان اور خرماستان
فصلِ گل میں دیکھ کر جوبن مہابن کا ترے مرو اور شیراز کے بھولے چمن اور گلستاں
تیرے سرجیون پہاڑوں نے دیا جی سے اتار نہر رکینی اور گلگشت مصلیٰ کا سماں [13]
دعوتیں بھولیں سمرقندی و شیرازی تمام اس قدر الوانِ نعمت کے لگائے تو نے خواں
نقش ہیں دل پر ہمارے سب مداراتیں تری ہم نہ بھولیں گے کبھی دن تیرے اور راتیں تری

2

تھی ہماری قوم و ملت، رسم و عادت سب جدا رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ — تجھ سے ہم تھے اجنبی، اور ہم سے تو نا آشنا
ہم میں اے ہندوستان! گو بوئے جنسیت نہ تھی — تو نے لیکن اپنی آنکھوں پر لیا ہم کو بٹھا
تو نے سونپی مہر دولت ہم کو اور طبل و نشاں — تو نے بخشے قصر و ایواں ہم کو اور بستان سرا
تو نے ثروت دی، حکومت دی، ریاست دی ہمیں — شکر کس کس مہربانی کا کریں تیری ادا
نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطرداریاں — جو دیا تھا تو نے وہ آخر کو سب رکھوا لیا
خیر، اپنے مال کا تو ہر طرح تھا اختیار — جس سے چاہا لے لیا اور جس کو چاہا دے دیا
کھینچ لیں اپنی اسی دم اُٹھ کے گدی سے زباں — بھول کر بھی گر زباں پر اس کا آ جائے گلا
پر گلہ یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ — وہ بھی تو نے ہم سے لے کر کر دیا بالکل گدا
آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں — خاک میں آخر دیے اے ہند سب تو نے ملا
یاد ہوگا تجھ کو یاں آئے تھے ہم کس شان سے — تجھ کو سوگند اپنے ست جگ کی بتا ایمان سے

3

ترکمانی صولت اور مغلی جلادت ہم میں تھی — عزمِ کُردی ہم میں تھا، بدوی حمیت ہم میں تھی
ہاشمی آداب و عباسی فضائل ہم میں تھے — نطقِ اعرابی و عدنانی فصاحت ہم میں تھی
ضربِ کراری و حرب خالدی رکھتے تھے ہم — سطوتِ حمزی و فاروقی جلالت ہم میں تھی
عِرقِ غیرت تھی دلیل اپنی شرافت کی، نہ مال — جھینپتی ہے جس سے دولت وہ شرافت کی، نہ مال
آج خاور تھا مقام اپنا توکل تھا باختر — عیش وعشرت کی نہ فرصت تھی نہ عادت ہم میں تھی
ننگ تھا ہم کو مشقت سے نہ مزدوری سے عار — جو بزرگی تھی مشقت کی بدولت ہم میں تھی
ہم شتربانی سے پہنچے تھے جہاں بانی تلک — اس لیے باقی شتربانوں کی خصلت ہم میں تھی
جو نشاں اقبال مندی کے ہیں وہ سب ہم میں تھے — حبِّ دینی ہم میں تھا، قومی مودّت ہم میں تھی
گھر ہمارے اور ہم سب وقف مہمانوں پہ تھے — یثربی مہماں نوازی و ضیافت ہم میں تھی
پھوٹ سے واقف نہ تھے ہم تری اے ہندوستاں — احمدی اخلاق و اسلامی اخوت ہم میں تھی
چھین لی سب ہم سے یاں شان عرب آن عجم — تو نے اے غارت گرِ اقوام و اکّال الامم

4

آئے تھے اے ہندیاں ایسے ہی ہم زار ونزار؟
ہے عرب کو جن سے ننگ اور ہے عجم کو جن سے عار

ہم انہی اسلاف کے معلوم ہوتے ہیں خلف؟
جن کی تھی محکوم نسلِ رستم و اسفندیار

ہم انہی باپوں کے بیٹے تجھ کو آتے ہیں نظر؟
جن کی جولاں گاہ تھی تاتار سے تازنجبار

ہیں ہمی اے آریاورت ان سواروں کے سپوت
جن کی دوڑوں سے ہیں واقف تیرے دشت وکہسار

ہم سدا سے خاکسار ایسے ہی تھے اے خاک ہند؟
اڑتی پھرتی تھی زمانے میں یہی مشتِ غبار؟

تھیں یہی شکلیں ہماری؟ تھا یہی رنگ اور روپ؟
تھی یہی سیرت ہماری؟ تھا یہی اپنا شعار؟

گر سلف دیکھیں ہمارے زندہ ہو کر اب ہمیں
آئے نسبت اور قرابت سے ہماری ان کو عار

سیرتیں تو نے بدل دیں، مسخ کر دیں صورتیں
آبرو تو نے ڈبو دی، کھو دیا تو نے وقار

کر دیا شیروں کو تو نے گوسفند اے خاکِ ہند
جو شکار افگن تھے آ کر ہو گئے یاں خود شکار

نکبتیں یہ سب جبھی سے ہم کو آتی تھیں نظر
آئے تھے یاں جب کہ اپنا چھوڑ کر ملک ودیار

تھا یقیں ہم کو کہ شامت رفتہ رفتہ آئے گی
ہم کو تو اے خاکِ ہند آخر یونہی کھا جائے گی

5

دیکھتے ہیں اب وہی آنکھوں سے صبح وشام ہم
جو مداراتوں کا سمجھے تھے تری انجام ہم

توڑ ڈالے جلد تو نے عہد اور پیمان سب
بے وفا سنتے تھے سچ اے ہند تیرا نام ہم

''دیر تک رہتا ہے جو انساں نہیں رہتا عزیز''
سنتے ہیں دیوار و در سے تیرے یہ پیغام ہم

عیب جو دنیا میں ہیں وہ ہم پہ تھپ جاتے ہیں سب
کیا زمانے میں ہمیشہ یونہی تھے بدنام ہم؟

سب کو ہو جاتا ہے ناکامی کا پہلے ہی یقیں
اٹھتے ہیں کرنے کو جب ہمت کا کوئی کام ہم

تو نے دیکھا تھا کبھی اسلامیوں کا حال یہ؟
کیا عرب سے لے کر نکلے تھے یہی اسلام ہم؟

بس، زیادہ پیسنے سے اپنے کیا حاصل تجھے
پس چکے اے آسیاے گردشِ ایام ہم

شکوہ قسمت کا ہے جو یاں کھینچ کر لائی ہمیں
تجھ کو اے ہندوستاں کس منہ سے دیں الزام ہم

پھر گئی سرحد سے تیری فوجِ یوناں جس طرح
کاش پھر جاتے یونہی در سے ترے ناکام ہم

رہتے قانع اپنی محنت اور مزدوری پہ کاش
آ کے یاں پاتے نہ ذوقِ راحت و آرام ہم

دشمن اپنا ہو گیا سودائے مال و جاہ حیف!
حرص نے طمعے کی شیروں کو کیا روباہ حیف!

وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں سبقت کیا ہوئی؟
وہ حجازی غیرت اور ملّی حمیت کیا ہوئی؟

ہم مسلمانوں سے ہے اے ہند ننگ اسلام کو
تھا لقب خیر الامم جس کا وہ امت کیا ہوئی؟

جی کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں
دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی؟

دین و دولت، علم و دانش، ہم میں کچھ باقی نہیں
حق نے پوری کی تھی جو ہم پر، وہ نعمت کیا ہوئی[14]

ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی
جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی؟

قریہ قریہ تیرے علم و فضل سے معمور تھا
اب وہ اے اسلام تیری خیر و برکت کیا ہوئی؟

جس نے مغرب کو کیا مشرق وہ سورج کیا ہوا[15]
جس سے گھر گھر بن گیا یوناں وہ حکمت کیا ہوئی؟

کوہ و دریا جن کے ہوتے تھے نہ ہرگز سدِّ راہ
وہ ارادے کیا ہوئے اور وہ عزیمت کیا ہوئی؟

کوئی مشکل ہم کو میداں سے ہٹا سکتی نہ تھی
وہ ثبات اور پائیداری اور وہ ہمت کیا ہوئی؟

ہو گی اے ہندوستان! آمد ہماری تجھ کو یاد
وہ مسلمانوں کی ہیئت اور وہ صورت کیا ہوئی؟

وہ بر و دوش اور وہ سینے پہلوانی کیا ہوئے؟
وہ قد و بالا، وہ چہرے ارغوانی کیا ہوئے؟

6

جب تک اے ہندوستاں ہندی نہ کہلاتے تھے ہم
کچھ ادائیں آپ میں سب سے جدا پاتے تھے ہم

اپنی خود کرتے تھے عزت گر نہ کرتا تھا کوئی
سر پر اک فرعون کے آگے نہ نہوڑاتے تھے ہم

حاجتیں ہوتی تھیں جو اپنی روا کرتے تھے آپ
ہاتھ آگے میر و سلطاں کے نہ پھیلاتے تھے ہم

تھے اسے نعمائے سلطانی سے بہتر جانتے
اپنی محنت سے اگر نانِ جویں کھاتے تھے ہم

تھے نہ کرگس اور زغن کی طرح ہم مردار خوار
تھا وہی قوت اپنا جو خود مار کر لاتے تھے ہم

تھی اولوالعزمی و ہمت اپنی مفتاحِ ظفر
چار سو راہیں معیشت کی کھلی پاتے تھے ہم

جب کبھی، جس کام کی خاطر، جدھر منہ اٹھ گیا
پھر پلٹ کر واں سے خالی ہاتھ کم آتے تھے ہم

جی چراتے تھے نہ مکروہاتِ عالم سے کبھی
اور خلافِ چرخِ دوراں سے نہ گھبراتے تھے ہم

اسپ تازی کی طرح تھی قوم تازی بھی غیور
جب کوئی بڑھتا تھا ہم سے تلملا جاتے تھے ہم

ہے حمیت کو ہماری اک زمانہ جانتا
سرد ہو جاتے تھے سب جس وقت گرماتے تھے ہم

حال اپنا سخت عبرت ناک تو نے کر دیا
آگ تھے اے ہند ہم کو خاک تو نے کر دیا[16]

7

کھا کے نعمت دل ہمارا شادماں ہوتا نہ تھا ساتھ دستر خوان پر گر میہماں ہوتا نہ تھا
کرتے تھے مہماں ہمارے ماحضر پر اکتفا تنگ دل مہماں سے کوئی میزباں ہوتا نہ تھا
ہم کو پہنچی تھی خلیل اللہ سے خواں گستری عسرت اور تنگی میں بھی طے اپنا خواں ہوتا نہ تھا
رکھتے تھے بچوں کو بھوکا اپنے مہماں کے لیے خرچ سے گھر کے سوا کھانا جہاں ہوتا نہ تھا
تھا مسافر کے لیے ایک ایک گھر مہماں سرا ہم کو کچھ غربت میں فکرِ آب و ناں ہوتا نہ تھا
میہمانوں کو تھے اپنے گھر کی برکت جانتے ٹھہرنا مہماں کا برسوں تک گراں ہوتا نہ تھا
جانتے تھے ہم کہ ہے اس پر خدا نا مہرباں جو کہ ہمسائے پہ اپنے مہرباں ہوتا نہ تھا
ہم ہر اک آفت میں ہمسایوں کی رہتے تھے سپر دشمنوں سے اپنے ان کو خوف جاں ہوتا نہ تھا
چپکے چپکے حاجتیں کرتے تھے سب ان کی روا فقر و فاقہ ان کا خلقت پر عیاں ہوتا نہ تھا
پیٹ بھر لیں اپنا اور ہمسایہ فاقے سے رہے اتفاق آ گے یہ اے ہندوستاں ہوتا نہ تھا
یوں نہ ہم جنسوں سے کرتی تھیں یہ آنکھیں چوریاں تو نے اپنی سی سکھا دیں ہم کو تنہا خوریاں

8

جس سے کرتے تھے محبت، بے ریا کرتے تھے ہم جس سے ہوتی تھی شکایت، برملا کرتے تھے ہم
شکوہ ہوتا تھا تو اکثر منہ پہ کہہ دیتے تھے ہم شکر کرتے تھے تو غیبت میں سوا کرتے تھے ہم
دوست بن جاتے تھے جس کے اس سے کرتے تھے نباہ عہد کرتے تھے تو عہدوں کو وفا کرتے تھے ہم
جن کے ہو جاتے تھے ساتھی ان کا ہم دیتے تھے ساتھ رنج و راحت میں شریک ان کے رہا کرتے تھے ہم
کرتے تھے عسرت میں ان کے واسطے فکر معاش ان کی بیماری میں تدبیر اور دوا کرتے تھے ہم
کام میں یاروں کے اپنے کام سب دیتے تھے چھوڑ اس میں روزے اور نمازیں تک قضا کرتے تھے ہم
یار کوئی مر کے اپنے سے بچھڑ جاتا تھا جب یار کی اولاد پر جانیں فدا کرتے تھے ہم
سنتے تھے اپنے بڑوں کا جن سے پیار اور اتحاد ان کی نسلوں سے وہی رسمیں ادا کرتے تھے ہم
دشمنوں کی زَد میں دیتے تھے نہ آنے ہم کو دوست ٹوک دیتے تھے ہمیں، جب کچھ خطا کرتے تھے ہم
آج وہ کام آئے اپنے کل ہم ان کے آئے کام بارہا باہم سلوک ایسا کیا کرتے تھے ہم
تو نے اے ہندوستاں کھو دیں کہاں وہ یاریاں یاریاں ہم میں رہیں باقی نہ وہ غم خواریاں

9

تیرے سایے سے رہے اے ہند جب تک دور ہم
اپنی یک رنگی رہی ضرب المثل بین الامم
مل گیا جو ہم میں آ کر پھر نہ تھے ہم پوچھتے
روم ہے یا ترک، ارمن ہے، عرب ہے یا عجم
ملتِ بیضا نے قوموں کی مٹا دی تھی تمیز
تھے بلال و جعفر و سلماں برابر محترم
ایک رنگت میں اخوت کی تھے سب رنگے ہوئے
اسود و احمر تھے جو اسلام کے زیرِ علم
زنگی و خوارزمی و تاتاری و ماژندری
ایک دسترخوان پر کھاتے تھے سب مل کر بہم
گو سدا آپس میں لڑتے اور جھگڑتے تھے مگر
وقت جب پڑتا تھا آ کر ایک ہو جاتے تھے ہم
فرق رکھا تھا کہہ و مہہ میں نہ کچھ اسلام نے
تھے برابر نفقہ و کسوت میں آقا اور خدم
حق خلیفہ کا نہ تھا اس میں رعیت سے سوا
جمع بیت المال میں ہوتی تھی جو آ کر رقم
ٹوک دیتا تھا سرِ دربار بڑھ کر اک غلام
گر کہیں بے راہ اٹھ جاتا تھا حاکم کا قدم
شوکتِ دیں کے سوا، شوکت نہ تھی کوئی پسند
ملک جم، لے کر نہ پاس آتا تھا اپنے کبرِ جم

10

راست بازی میں ہماری لوگ دیتے تھے نظیر
فرد تھے پاسِ سخن میں قوم کے برنا و پیر
دوست دشمن کو ہمارے قول پر تھا اعتماد
دے چکے جب ہم زباں، پھر تھی وہ پتھر کی لکیر
تھے ثقہ بھی ہم میں، بد اطوار بھی، اوباش بھی
تھا سخن کا اپنے لیکن پاس سب کو ناگزیر
کوئی بدعہدی سے بڑھ کر تھا نہ عیب ان کے لیے
حق جنھیں کرتا تھا ہم میں وارثِ تاج و سریر
جیسے رہ زن اور لٹیرے تھے ہمارے راست باز
رہ نماؤں میں نہیں پاتے ہم آج ان کی نظیر
دل میں کچھ ہے اور زباں پر کچھ، یہ خاصیت نہ تھی
خاک میں اس سرزمیں کی جس سے تھا اپنا خمیر
جنگ تھی تو برملا تھی، صلح تھی تو بے ریا
ہم کو زہر آتا نہ تھا دینا بنا کر جامِ شیر
منہ سے جو کہہ بیٹھتے تھے کر دکھاتے تھے وہی
ہے گرج کر پھر برستا جس طرح ابرِ مطیر
چھاؤں میں ہم جا کے تلواروں کی کہہ آتے تھے حق
غالب آتا تھا نہ ہم پر خوف سلطان و امیر
پر بنایا جب سے ہم نے ملجا و ماویٰ تجھے
راست بازی ہو گئی اے ہند ہم سے گوشہ گیر
کر دیے تو نے تمام اسلام کے ارکان سست
ہو گئے بودے ہمارے عہد اور پیمان سست

11

شرق سے تا غرب جب عالم میں تھا قحط الرجال
تھی ہماری قوم میں ارزانیِ اہلِ کمال

علم و حکمت نے ہماری آن کر لی تھی پناہ
روم اور یونان پر جب چھا گیا جہل و ضلال

جاہلوں کا تھا ہماری قوم میں گھاٹا یونہی
جیسے اب لکھے پڑھے ملتے ہیں ہم میں خال خال

منع استدلال یا توجیہ یا تحقیقِ حق
تھی یہی اکثر ہماری مجلسوں میں قیل و قال

ترک میں وحشت رہی تھی اور نہ جہلِ اعراب میں
دینِ بیضا نے دیا تھا آ کے کانٹا سا نکال

علم بھی جاتا تھا، جاتے تھے جہاں ہم، ساتھ ساتھ
علم نے اسلام سے باندھا تھا پیمانِ وصال

سیم و زر کم چھوڑ کر جاتے تھے ہم میراث میں
تھی کتاب اپنی بضاعت اور ادب تھا اپنا مال

خلق کرتی تھی ہماری ریس رسم و راہ میں
کر دیا تھا علم نے سب کے لیے ہم کو مثال

آج جس علم و ہنر سے ہے چراغاں بزمِ دہر
ہم نے بنیاد اس کی دی تھی بیش تر دنیا میں ڈال

تھی ہماری دولت، اے ہندوستاں! فضل و ہنر
آ گیا تیری بدولت اپنی دولت کو زوال

ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کر دیا
تو نے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کر دیا؟

12

ہم نے یہ مانا کہ جب گلشن میں ہو فصلِ خزاں
بے محل ہے چھیڑنی واں عہدِ گل کی داستاں

ہو خلف پر ابر جب چھایا ہوا ادبار کا
پھر سلف کی شان و شوکت کیجیے کس منہ سے بیاں

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیوں کر کوئی
بھول جائے رات کا سب صبح ہوتے ہی سماں

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گزری بہت
اٹھ رہا ہے گل سے شمعِ بزم کے اب تک دھواں

کہہ رہے ہیں نقشِ پائے رہرواں، اے خاکِ ہند
یاں سے گزرا ہے ابھی اک با تجمل کارواں

گو یقیں ہے رفتہ رفتہ یاد ایامِ سلف
دل سے چھوڑے گی مٹا کر گردشِ دورِ زماں

بھول جائیں گے کہ تھے کن ڈالیوں کے ہم ثمر
ٹوٹ کر آئے کہاں سے اور بکے جا کر کہاں؟

پر زمانے میں رہیں گے تا قیامت یادگار
جو کیے برتاؤ تو نے ہم سے اے ہندوستاں!

ماجرا ہو گا ہمارا عبرت اوروں کے لیے
چیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستاں

سانپ سے جس طرح رہتا ہے سپیرا دور دور
حکمراں تیرے یونہی تجھ سے رہیں گے برکراں

برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہم سے پائیں گے بہت

حواشی

1 شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں: ''مناجات بیوہ 1886 یا 1887 کی تصنیف ہے'' (تذکرہ حالی ص: 99) لیکن 'حالی کا ذہنی ارتقا' (ص: 94) اور 'حالی بحیثیت شاعر' (ص: 86) میں اس نظم کا سنہ تصنیف 1884 درج ہے۔ (ا ص)

2 لاگو: (1) دشمن یا در پے رہنے والا (2) ساتھی، لگاؤ رکھنے والا، آرزومند۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

3 یہ لفظ عام تلفظ کے مطابق باندھا گیا ہے۔ اصلا سے (سنسکرت، ہندی) اردو میں سے، سما، سماں، کئی صورتوں میں مستعمل ہے۔ مختلف معانی میں آتا ہے: (1) وقت، موسم۔ (2) کیفیت، حالت۔ (3) خوش حالی کا زمانہ، بہتات و فراوانی کا موسم۔ یہاں آخری معنی مراد ہیں۔ (ا ص)

4 جنڈری: جان کی تصغیر بالتحقیر، عورتوں کا محاورہ (بحوالہ نور اللغات)۔ عوامی بولی میں زندگی سے بگڑ کر 'جندڑی' ہو گیا۔

5 آپا: اپنی ذات، اپنے آپ کو (آپا تجنا یا آپا بسرانا: اپنے آپ کو قربان کر دینا، خود فراموشی)

6 پلا یا پلو: کنارا یا سرا

7 کھرسا: تپش، گرم موسم، خشک سالی

8 ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اس نظم کا سنہ تصنیف 1906 متعین کیا ہے (حالی کا ذہنی ارتقا، ص: 213) ڈاکٹر شجاعت علی بھی اس رائے سے متفق ہیں (حالی بحیثیت شاعر، ص: 91) مولانا حالی آخر دسمبر 1905 میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ جہاں وسط جون 1906 تک قیام فرما رہے۔ اسی دوران میں انھوں نے مہاراجہ سر کشن پرشاد کے زیر صدارت ایک بہت بڑے جلسے میں یہ نظم سنائی تھی۔ فاضل محققین کے قیاس کی بنیاد غالباً یہی واقعہ ہے۔ مرتب نے بھی 'ترجمہ حالی' کے تتمے (مشمولہ کلیات جلد اول) میں اسی رائے کا اعادہ کیا ہے لیکن حیدرآباد کے جلسے میں نظم خوانی، سنہ تصنیف کے بارے میں کوئی قطعی دلیل نہیں۔ درحقیقت یہ نظم سفر حیدرآباد سے قبل لکھی جا چکی تھی اور رسالہ 'خاتون' (علی گڑھ) کے شمارہ بابت ماہ دسمبر 1905 میں شائع ہوئی تھی، پھر فروری 1906 کے مخزن میں رسالہ 'خاتون' سے منقول ہوئی۔ (ا ص)

9 جاپا: زچگی۔

10 بوائی پھٹنا: ایڑی پھٹنے یا ایڑی میں خراش پڑنے کی تکلیف۔ ضرب المثل: جس کی پھٹی نہ ہو بوائی، کیا جانے پیڑ پرائی۔

11 مرادنواب سلطان جہاں بیگم، والیہ ریاست بھوپال جوتحریک۔تعلیم نسواں کی سب سے بڑی سرپرست تھیں اور بھوپال کے باہر بھی خواتین کی اصلاح وتعلیم پر توجہ فرماتی رہیں۔نظم کے آخری بند میں شاعر نے ان دشواریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام مخالفت کی وجہ سے اس تحریک کے علم برداروں کی راہ میں حائل تھیں۔ بالآخر ڈاکٹر شیخ عبداللہ اوران کے رفقا کی کوششوں سے علی گڑھ میں ایک گرلز ہائی اسکول قائم ہوا۔ 1905 میں اس تحریک کی اشاعت کی غرض سے رسالہ 'خاتون' (علی گڑھ) جاری کیا گیا۔ 1906 میں نواب سلطان جہاں بیگم کی مالی امداد سے مسلمان طالبات کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس بھی تعمیر ہوگیا۔(ا ص)

12 شعب بوان: نواح شیراز میں ایک وسیع قطعۂ زمین جو نہایت خوش منظر تفریح گاہ تھا۔اسی طرح سمرقند کے قریب 'صغد' کی سیرگاہ، دمشق کے قریب نزہت گاہ 'غوطہ' اور نواح بصرہ میں 'نہر ابلہ' کی سیرگاہ بھی بہت مشہور تھی۔ یہ چاروں سیرگاہیں ''چار بہشت'' کہی جاتی تھیں۔

13 خواجہ حافظ کے مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را (ا ص)

14 سورۃ المائدہ کی ایک آیۃ کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ ہے: الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی (3:5) (آج ہم نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی)

15 یہاں تین صنعتوں (تضاد، ایہام، مراعات النظیر) کا برجستہ استعمال، استعارے (سورج) کی خیال افروزی اور پورے مصرعے کی معنویت و بلاغت قابل توجہ ہے۔

16 اس مصرعے میں میر کا فیضان نمایاں ہے:

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب ہوئے خاک انتہا یہ ہے!

باب سوم

تعلیمی اور اصلاحی نظمیں

1 مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ[1]

(سنہ تصنیف: 1880، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخ رو آفاق میں وہ رہ نما مینار ہیں روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

***

ہم نے ان عالی بناؤں سے کیا اکثر سوال آشکارا جن سے ان کے بانیوں کا ہے جلال
شان و شوکت کی تمھاری دھوم ہے آفاق میں دور سے آ آ کے تم کو دیکھتے ہیں باکمال
قوم کو اس شان و شوکت سے تمھاری کیا ملا دو جواب اس کا اگر رکھتے ہو یارائے مقال
سرنگوں ہو کر وہ سب بولیں زبانِ حال سے ہو سکا ہم سے نہ کچھ، الانفعال الانفعال
بانیوں نے تھا بنایا اس لیے گویا ہمیں ہم کو جب دیکھیں خلف اسلام کو رویا کریں

***

شوق سے اس نے بنایا مقبرہ اک شان دار اور چھوڑا اس نے اک ایوانِ عالی یادگار
ایک نے دنیا کے پودے باغ میں اپنے لگائے ایک نے چھوڑے دفینے سیم و زر کے بے شمار

اک محب قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے — قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار
ہو گی عالم میں کہو سرسبز یہ پچھلی مراد — یا وہ اگلوں کی امیدیں لائیں گی کچھ برگ و بار
چشمہ سرجیون ہے جو بہتا رہے گا یاں وہی — سب اتر جائیں گی چڑھ چڑھ کر ندیاں برسات کی

***

دور سے امید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے — ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے[2]
قوم کے پیر و جواں سب ہو گئے تھے مردہ دل — دردمندی جوش میں چند اہلِ دل کو لائی ہے
پاؤ گے تاریخ میں ہرگز نہ تم اس کی مثال — سلطنت نے قوم کی جو یاں مدد فرمائی ہے
غیر قوموں نے بھی کی ہے شرطِ ہمدردی ادا — یہ بنا چلتی ہوا تک کو بھی دل سے بھائی ہے
آؤ ہم بھی اے عزیزو مغتنم سمجھیں اسے — اک ضروری کام اپنا کم سے کم سمجھیں اسے

***

یہ مبارک گھر، نزولِ خیر و برکت ہے جہاں — جس کی پیشانی سے ظاہر ہیں سعادت کے نشاں
یہ نہالِ تازہ جس کو اک زمینِ شور میں — خرّم و سرسبز کرنا چاہتے ہیں باغباں
یہ مسیحائی علاج اس دردِ بے درماں کا ہے — لا دوا ٹھہرا چکے جس کو اطبائے زماں
یہ نمونہ اس عزیزِ مصر کا جس نے سمّ — جن کے ہاتھوں سے سہے، دی قحط میں ان کو اماں
عہد و پیماں اے عزیزو! تم سے کچھ لینے کو ہے — قوم کو پھر برکتیں بے انتہا دینے کو ہے

***

آ رہی ہے اس مکاں کے گوشے گوشے سے صدا — قوم اگر سمجھے تو ہوں میں قوم کا حاجت روا
ہے کوئی اکسیر دنیا میں تو ہوں اکسیر میں — اور اصلِ کیمیا کچھ ہے، تو میں ہوں کیمیا
ہاتھ آ جاتا سکندر کو اگر میرا سراغ — چھوڑ دیتا جستجوئے چشمۂ آبِ بقا
میرے جو حامی ہیں ان کی یوں پھلیں گی کوششیں — ایک دانے سے ہوں خوشے جس طرح بے انتہا
ہے عبث گر قوم نے بے وقت پہچانا مجھے — برکتیں ان پر جنھوں نے وقت پر جانا مجھے

***

ان سے کہہ دو قوم میں ہیں جو کہ عالی خانداں — یا جنھیں جاگیر و منصب پر ہے نازِ بے کراں

کیا لیے بیٹھے ہو فخرِ منصب و جاگیر کو   منصب و جاگیر ہیں سب کوئی دن کے میہماں
تم نہیں رہتے میں بڑھ کر تغلق و تیمور سے   تنگ ہے آج ان کی نسلوں پر زمین و آسماں
چھوڑ جاؤ واسطے اولاد کے کوئی سپر   ورنہ وار اپنا کرے گی گردشِ دورِ زماں
آؤ باندھو عہد مجھ سے اور میرا ساتھ دو   میرا سودا نقد ہے، اس ہاتھ لو اس ہاتھ دو

***

میں تمھیں پستی سے پہنچاؤں گا تا اوجِ کمال   میں تمھیں دیکھوں گا جب گرتا ہوا،لوں گا سنبھال
میں بناؤں گا تمھارے کام سب بگڑے ہوئے   میں سُجھاؤں گا زمانے کی تمھیں سب چال ڈھال
جو کریں گے آج میری دست و بازو سے مدد   میں سدا کرتا رہوں گا ان کی نسلوں کو نہال
قوم کا حامی ہوں اور اسلام کا یاور ہوں میں   چاہو دارالکفر سمجھو مجھ کو یا دارالضلال
میں دکھا دوں گا کہ جو دشمن تھے میرے نام کے   تھے حقیقت میں وہ دشمن قوم اور اسلام کے

***

ملک میں عزت سے رہنا میں سکھاؤں گا تمھیں   سلطنت کا معتمد بننا بتاؤں گا تمھیں
قابلیت تم میں بڑھنے کی ہے دیکھوں کس قدر   بڑھ سکو گے جس قدر اتنا بڑھاؤں گا تمھیں
تب یہ سمجھو گے کہ ہم سوتے تھے کب کے بےخبر   دفعتاً جب خوابِ غفلت سے جگاؤں گا تمھیں
یاد ہو گا تم کو وہ کھویا ہوا اپنا خطاب   پھر مخاطب 'خیر اُمت' کا بناؤں گا تمھیں
مجھ کو دیکھو گر مرے دعووں میں ہو کچھ اشتباہ   روزِ روشن آپ اپنی روشنی پر ہے گواہ

***

بارک اللہ، اے ریاضِ علم اے عین الحیات   ہے ہمارے بخت و دولت کی عناں اب تیرے ہات
ہو تو ہو اب روشنی تیری دلیلِ کارواں   چارسو کالی گھٹا چھائی ہے اور کالی ہے رات
قوم سے تو بھی یونہی جہل اور تعصب کو مٹا   جس طرح دینِ حنفی سے مٹے لات و منات
چھوڑ جائیں گے جہاں میں جو کہ تجھ جیسے نشاں   چھوڑ جائیں گے وہی کچھ باقیات الصالحات
ایک باہمت جماعت جب سے تیرے ساتھ ہے   ہم سمجھتے ہیں ترے سر پر خدا کا ہاتھ ہے

***

تو سدا آباد رہ اے قوم کی امیدگاہ   اے یگانوں اور بےگانوں کے یکساں خیرخواہ

دیکھتے ہیں غیر حیرت اور تعجب سے تجھے　　قوم نے اب بھی اگر سمجھا نہ تجھ کو آہ آہ!
اپنے حامی آپ پیدا کر کہ کوہِ سربلند　　اپنی پونجی سے ہے آپ اپنے لیے پشتِ پناہ
خیر کی امید رکھنی ہے عبث اس قوم سے　　آپ کو جس نے کیا ہو اپنے ہاتھوں سے تباہ
چارہ آخر کچھ نہیں حالی بجز صبر و سکون　　کر دعا اب 'اهد قومی انهم لا یعلمون'[3]

2 ننگِ خدمت

(سنہ تصنیف: 1887، ہیئت: مسدس، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

یادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں　　دستِ مشّاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں
گلِ خودرو سے بسا تھا چمنِ کون و مکاں　　چار سو حسنِ خداداد کا سکہ تھا رواں
وضعِ عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خطِ قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

طفلِ معصوم کی مانند تھا یہ عالمِ پیر　　تھے ہم اک صنعت بے چون و چرا کی تصویر
ملکِ فطرت میں نہ تھی سلطنتِ نفسِ شریر　　طبع نے مملکتِ روح نہ کی تھی تسخیر
خوابِ غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

مال و دولت کی ہوس میں نہ گرفتار تھے ہم　　نہ بلندی کے، نہ رفعت کے طلب گار تھے ہم
آپ ہی اپنے ہر اک رنج میں غم خوار تھے ہم　　مددِ غیر سے اصلا نہ خبردار تھے ہم
جو سبق آئے تھے استادِ ازل سے لے کر
وہ ہر منزل و ہر راہ میں تھا یاں رہبر

اصل سے دور بہت ہونے نہ پائے تھے ابھی　　دیس سے چھوٹ کے پردیس میں آئے تھے ابھی
دن جدائی کے نصیبوں نے دکھائے تھے ابھی　　ڈال سے توڑ کے بازار میں لائے تھے ابھی
عرصہ گزرا تھا مسافر کو نہ غربت میں بہت
جی لگا تھا نہ ابھی غیروں کی صحبت میں بہت

صاف آئینۂ دل میں نظر آتا تھا کوئی   روبہروجس کے جگہ دل میں نہ پاتا تھا کوئی
جی وہ جی تھا کہ نہ جس جی کو لبھاتا تھا کوئی   آنکھ وہ آنکھ تھی جس میں نہ سماتا تھا کوئی
روح تھی بادۂ دوشینہ سے اپنی بدمست
تھا ترقی پہ ابھی نشۂ صہبائے الست

اس قدرِ عمرِ دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم   عیش وعشرت کے طلسموں سے بہت دور تھے ہم
کسی محنت سے، مشقت سے نہ معذور تھے ہم   آپ ہی راج تھے اور آپ ہی مزدور تھے ہم
تھے غلام آپ ہی اور آپ ہی آقا اپنے
خود ہی بیمار تھے اور خود ہی مسیحا اپنے

خود نمائی و خود آرائی کا کچھ دھیان نہ تھا   کبر و پندار کا جاری کہیں فرمان نہ تھا
گھر میں سامان نہ تھا، در پہ نگہبان نہ تھا   جی میں فرعونِ زماں بننے کا ارمان نہ تھا
آ کے دنیا میں بہت پاؤں نہ پھیلاتے تھے
اک مسافر کی طرح رہ کے چلے جاتے تھے

خاک کو نرم بچھونوں سے سوا جانتے تھے   روکھ کی چھاؤں کو ہم ظلِ ہما جانتے تھے
مل گیا جو اسے انعامِ خدا جانتے تھے   نہ برا جانتے تھے اور نہ بھلا جانتے تھے
طاعتِ نفسِ فرومایہ سے آزاد تھے ہم
ساگ اور پات پہ گزران تھی اور شاد تھے ہم

تھی سفر میں نہ سواری کی ضرورت زنہار   طے انہی قدموں سے کرتے تھے ہر اک راہ گزار
کھانے پینے کو نہ تھے ظرفِ بلوریں درکار   انہی ہاتھوں پہ خور و نوش کا تھا اپنے مدار
شرم آتی تھی نہ ہل جوت کے کھانے سے ہمیں
عیب لگتا تھا نہ کچھ ڈھور چرانے سے ہمیں

تھک کے محنت سے جو ہم بھوک میں کھاتے تھے طعام   دیتے تھے کلۂ بریاں کا مزا گندمِ خام
دست و بازو کی بدولت تھا ہمیں عیش مدام   خوب کٹتے تھے مشقت میں ہمارے ایام
پیٹ کے مارے کہیں سر نہ جھکاتے ہم تھے
آبرو نفس کی خاطر نہ گنواتے ہم تھے

کرنے پڑتے تھے ضیافت میں نہ بے جا ساماں　　نانِ جو کھاتے تھے خوش ہو کے ہمارے مہماں
تھا بناوٹ کا پتا اور نہ تکلف کا نشاں　　ایک قانون کے پابند تھے دل اور زباں
طبل ظاہر کی نمائش کے نہ بجتے تھے وہاں
جو برستے تھے زیادہ، نہ گرجتے تھے وہاں

آمدِ موسمِ گل میں تھا عجب لطفِ ہوا　　آندھیوں نے کیے انجام کو طوفاں برپا
چشمہ نزدیک تھا منبع سے تو تھا عینِ صفا　　جتنا بڑھتا گیا، ہوتا گیا پانی گدلا
مٹتے مٹتے اثرِ صدق و صفا کچھ نہ رہا
آخری دور میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہا

اے جہاں اے روشیں تازہ بدلنے والے　　نت نئی چال، نئی ڈھال سے چلنے والے
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنے والے　　روز اک سانگ[4] نیا بھر کے نکلنے والے
آج کچھ اور ہے، کل اور تھی کچھ شان تری
ایک سے ایک نہیں ملتی کہیں آن تری

اک زمانہ تھا کہ ہم وزن تھے سب خورد و کلاں　　لہلہاتی تھی بنی نوع کی کھیتی یکساں
ایک اسلوب پہ تھی گردشِ پرکارِ زماں　　شہر و ویرانہ و آباد میں تھا ایک سماں
قدر و قیمت میں نہ تھا فرق کسی کا اصلا
کوئی پلہ تھا ترازو کا نہ اونچا نیچا

ایک سے ایک نہ کم تھا نہ زیادہ سرِ مُو　　سب تھے ہم ایک ترائی کے درختِ خودرو
حاجتیں لے کے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو　　نہ زمیں بوس کی عادت تھی نہ تسلیم کی خُو
دستِ قدرت کے سوا سر پہ کوئی ہات نہ تھا
ایک قبلہ تھا، کوئی قبلۂ حاجات نہ تھا

ناگہاں جور و تغلب[5] کا اک اٹھا طوفاں　　جس کے صدمے سے ہوئی زیر و زبر نظمِ جہاں
اقویا ہاتھ ضعیفوں پہ لگے کرنے رواں　　بکریوں کو نہ رہی بھیڑیوں سے جائے اماں
تیز دنداں ہوئے جنگل میں غزالوں پہ پلنگ
مچھلیوں پر لگے منہ کھولنے دریا میں نہنگ

حق نے شائستۂ ہر باب بنایا تھا ہمیں ایک ہی دام میں پھنسنا نہ سکھایا تھا ہمیں
رستہ ہر کوچہ و منزل کا بتایا تھا ہمیں زینہ ہر بام پہ چڑھنے کا دکھایا تھا ہمیں
ایسا کچھ بادۂ غفلت نے کیا متوالا
طوق خدمت کا لیا اور گلے میں ڈالا
درِ مخلوق کو ہم ملجا و ماویٰ سمجھے طاعتِ خلق کو اعزاز کا تمغا سمجھے
پیشہ و حرفہ کو اجلاف کا شیوہ سمجھے ننگِ خدمت کو شرافت کا تقاضا سمجھے
عیب لگنے لگے نجاری و حدادی کو
بیچتے پھرنے لگے جوہرِ آزادی کو
نوکری ٹھہری ہے لے دے کے اب اوقات اپنی پیشہ سمجھے تھے جسے، ہو گئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی
ہاتھ اپنے دلِ آزاد سے ہم دھو بیٹھے
ایک دولت تھی ہماری سو اسے کھو بیٹھے
کرتے ہیں قصدِ تجارت تو گرہ میں نہیں دام دست کاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کارِ عوام
نہیں ہل جوتنے میں راحت و آرام کا نام بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے ایک اک کے غلام
نظر آتی نہیں مطلب کی کوئی گھات ہمیں
وہ پڑا نقشہ کہ ہر چال میں ہے مات ہمیں
ایک آقا ہو تو خدمت کا ہو حق اس کی ادا ایک آقا ہو تو حکم اس کا کوئی لائے بجا
زید کی رائے جدا، عمرو کی تجویز جدا ایک بندے کو بھگتنے کئی پڑتے ہیں خدا
بھاگو خدمت سے کہ اچھا نہیں انجام اس کا
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ لے نام اس کا
کہیں بہتان کا اندیشہ کہیں بیمِ گناہ کہیں غماز کا دھڑکا، کہیں خوفِ بدخواہ
جھیلنے روز وہ افسر کہ نہ ہو جن سے نباہ خدمت اک بارِ گراں ہے کہ عیاذاً باللہ
پڑے پتھر پہ تو پتھر میں گرانی نہ رہے
گرے دریا پہ تو دریا میں روانی نہ رہے

آتی ہیں نوکروں کے سر پہ بلائیں اکثر　　بے سبب ان پہ گزرتی ہیں جفائیں اکثر
ماننی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر　　سامنے جاتے ہیں پڑھ پڑھ کے دعائیں اکثر
غیرت آئی جنھیں وہ ٹھہرنے پاتے نہیں یاں
جو کہ عاقل ہیں، کبھی کان ہلاتے نہیں یاں

کیجیے فرض کہ ہے زید بڑا منصب دار　　اور عمرو اس کا ہے اک بندۂ فرماں بردار
فرق دونوں میں نہیں اس کے سوا کچھ زنہار　　کہ یہ میلا ہے وہ اُجلا، یہ پیادہ وہ سوار
ورنہ انصاف سے دیکھو تو ہیں نوکر دونوں
قید میں، عجز میں، ذلت میں برابر دونوں

عمرو کرتا ہے اگر اس کا ادب اور تعظیم　　کرنی پڑتی ہے اسے بھی کہیں جھک کر تسلیم
زید کی جھڑکیوں سے گر ہے دلِ عمرو دونیم　　جا کے سنتا ہے کہیں زید بھی الفاظِ سقیم
پاجی، احمق، اسے کہنے کا اگر ہے دستور
’ڈیم فول‘ اس کو بھی سننا کہیں پڑتا ہے ضرور

رکھتے ہیں حضرتِ انساں جو بڑائی میں قدم　　گاؤخران سے ہیں کیا جانیے کس بات میں کم
مالکوں کے انھیں گر جھیلنے پڑتے ہیں ستم　　ذلتیں ان کے لیے بھی ہیں مہیا ہر دم
ننگِ خدمت کی حقیقت کو بشر گر سمجھے
چاکروں کو گدھے اور بیل سے بدتر سمجھے

کھیت سے اپنے بچھڑنے کا ہے گران کو ملال　　مدتیں گزریں کہ لوٹا گیا یاں عیشِ وصال
نوکری نے جونہی دکھلایا طلسمِ اقبال　　چھوڑ کر شہر و وطن کو ہوے جویاے محال
گھر چھٹا، یار چھٹے، خویش و یگانہ چھوٹا
ایک ذلت ملی اور سارا زمانہ چھوٹا

ان کی گردن میں اگر قید کی رسی ہے پڑی　　اپنی بے بال و پری کی بھی کہانی ہے بڑی
تازہ حکموں کی لگی رہتی ہے ہر وقت جھڑی　　نہیں خالی کوئی ساعت، کوئی پل، کوئی گھڑی
مرغِ بے پر کی طرح قیدیِ صیاد ہیں ہم
کہیے پھر کون سی حجت سے کہ آزاد ہیں ہم

ہوتے ہیں فرطِ مشقت سے اگر وہ رنجور　　مالک ان کی نگرانی میں نہیں کرتے قصور
دیکھ لیتے نہیں جب تک کہ ہوئے روگ سے دور　　رکھتے ہیں محنت و تکلیف سے ان کو معذور
جانتے ہیں یہی دھن ہے، یہی دولت اپنی
دم سے وابستہ انہی کے ہے معیشت اپنی

اپنی گر جان پہ بن جائے مشقت سے یہاں　　نہیں اُمید کہ گزرے کسی خاطر پہ گراں
مطمئن ہیں کہ ہے مزدوروں کا دنیا میں سماں　　نہ ہوا ایک تو رکتی نہیں تعمیرِ مکاں
پھرتے ہیں پیٹ کی یاں دیتے دہائی لاکھوں
گر نہیں آپ تو ہیں آپ کے بھائی لاکھوں

حق کسی کا نہیں ماتحت ہو یا ہو افسر　　ایک سے کام لیا، ایک کو سونپا دفتر
یہی کھُسر بدلیاں رہتی ہیں یہاں شام وسحر　　فی المثل ایک کرایے کی دکاں ہے نوکر
رہے، جب تک کسی بنیاد میں آیا نہ خلل
جب لگی بیٹھنے لی جا کے کہیں اور بدل

نوکروں سے ہیں بہایم کہیں رتبے میں سوا　　کہ نہیں خدمتِ ہم جنس کا ان پر دھبّا
گائے ہو، بیل ہو، گھوڑا ہو کہ اس میں ہو گدھا　　ایک کا ایک کو تابع کہیں دیکھا نہ سنا
کسی مخلوق کو رتبہ نہ خدا نے بخشا
جو غلاموں کو شرف عقلِ رسا نے بخشا

اس سے بڑھ کر نہیں ذلت کی کوئی شان یہاں　　کہ ہو ہم جنس کی ہم جنس کے قبضے میں عناں
ایک گلے میں کوئی بھیڑ ہو اور کوئی شباں　　نسلِ آدم میں کوئی ڈھور ہو کوئی انساں
ناتواں ٹھہرے کوئی، کوئی تنومند بنے
ایک نوکر بنے اور ایک خداوند بنے

ایک ہی تخم سے پیلو بھی ہو شمشاد بھی ہو　　ایک ہی اصل سے خسرو بھی ہو فرہاد بھی ہو
ایک ہی ڈار میں آہو بھی ہو صیاد بھی ہو　　ایک ہی نسل سے بندہ بھی ہو آزاد بھی ہو
ایک ہی سبزۂ جو تازہ بھی ہو، خشک بھی ہو
ایک ہی قطرۂ خوں ریم بھی ہو مشک بھی ہو

ایک وہ ہیں کہ نہیں غیر کے فرماں بردار اپنی ہر بات کے ہر کام کے خود ہیں مختار
نہیں سرکار سے دربار سے ان کو سروکار جس جگہ بیٹھ گئے ہے وہی ان کا دربار
گر تونگر ہیں تو دس بیس ہیں ان کے محکوم
ورنہ خادم ہیں کسی کے نہ کسی کے مخدوم
حکم سے کوئی نہیں ان کا بلانے والا جبر سے کوئی نہیں ان کا دبانے والا
بیٹھ جائیں تو نہیں کوئی اُٹھانے والا سو رہیں جب تو نہیں کوئی جگانے والا
اٹھ کے چل دیں تو نہیں روکنے والا کوئی
اُلٹے پھر جائیں جو ہو ٹوکنے والا کوئی
ایک وہ ہیں کہ زمانہ کرے انصاف اگر اور کھل جائیں کمالات بھی ان کے سب پر
جوہری جو ہیں وہ سب ان کے پرکھ لیں جوہر کامیابی نہیں ان کے لیے اس سے بڑھ کر
کہ سدا قید رہیں مرغِ خوش الحاں کی طرح
جا کے بک جائیں کہیں یوسفِ کنعاں کی طرح
دیکھ لیں جب انھیں ہر علم و ہنر میں یکتا شرفِ ذات میں اور اصل و گہر میں یکتا
زورِ بازو میں بلندیِ نظر میں یکتا الغرض جملہ کمالاتِ بشر میں یکتا
اور پھر اس پہ مدد طالعِ بیدار کی ہو
تب نصیب ان کو غلامی کسی سرکار کی ہو
ورنہ دن رات پھریں ٹھوکریں کھاتے در در سندیں، چٹھیاں، پروانے دکھاتے در در
چاپلوسی سے دل ایک اک کا لبھاتے در در ذائقہ نفس کو ذلت کا چکھاتے در در
تا کہ ذلت سے بسر کرنے کی عادت ہو جائے
نفس جس طرح بنے لائقِ خدمت ہو جائے
کوئی دفتر نہیں اور کوئی کچہری ایسی کہ جہاں گزری ہو ایک آدھ نہ عرضی ان کی
سنتے مشرق میں ہیں گر کوئی اسامی خالی قافلے ہوتے ہیں مغرب سے اسی دم راہی
برسوں اس پر بھی گزر جاتے ہیں بے نیلِ مرام
کوئی آقا نہیں ملتا کہ بنیں اس کے غلام

تنگ ہوتے ہیں تو تقدیر کا کرتے ہیں گلا کبھی ٹھہراتے ہیں گردش کو زمانے کی برا
کبھی سرکار کو کہتے ہیں کہ ہے بے پروا کبھی فرماتے ہیں یہ ہو کے مشیت سے خفا
وعدۂ رزق میں سنتے تھے کہ ہوتی نہیں دیر
پھر جو نوکر نہیں ہوتے تو یہ ہے کیا اندھیر

جانتے ہیں کہ ہے جس رزق کا ہم سے وعدہ اس کا حیلہ نہیں یاں کوئی غلامی کے سوا
اور دروازے ہوئے بند سب ان پر گویا اب فلک پر انھیں ملجا نہیں زمیں پر ماویٰ
کام ہوتا کوئی اور ان سے سرانجام نہیں
جس طرح بیل کو جُتنے کے سوا کام نہیں

جن کے اسلاف نے تھا قوم کا دیکھا اقبال یاد کرتے ہیں جب اسلاف کا وہ جاہ وجلال
پاتے ہیں ان کو عنایات سے شاہوں کی نہال مال و دولت سے انھیں دیکھتے ہیں مالا مال
ایک کی ایک سے پاتے ہیں فزوں تر توقیر
کوئی بخشی کوئی دیوان کوئی صدرِ کبیر

دیکھتے جب ہیں کہ دم ساز تھے ان سے ایام بادۂ عیش سے لبریز تھا جام ان کا مدام
کہتے ہیں خدمتِ سلطاں میں ہے اعزاز تمام اس لیے ہم نے لیا پیشۂ آبائے کرام
دیکھیں منہ ڈال کے گر اپنے گریبان میں وہ
عمر برباد کریں پھر نہ اس ارمان میں وہ

ہنس کی چال حماقت سے چلا جو کوا اپنی بھی چال گیا بھول بہ قولِ حکما
پیروی کرتے ہیں اسلاف کی اب جو حمقا وہ نہیں جانتے رنگ آج زمانے کا ہے کیا
اپنا کیا حال ہے اسلاف کی حالت کیا تھی
اپنی توقیر ہے کیا ان کی وجاہت کیا تھی

سلطنت کے وہی اعضا تھے وہی تھے ارکاں ان سے ہر حال میں دربار کو تھا اطمیناں
رتق اور فتق کی ہاتھوں میں انہی کے تھی عناں طبل و نقارہ انہی کا تھا، انہی کا تھا نشاں
تھے وہی قائدِ لشکر وہی دفتر کے دبیر
تھے وہی شرع کے مفتی وہی دولت کے مشیر

مشورت ان سے ہر اک بات میں لی جاتی تھی　　جستجو ان کی مہمات میں کی جاتی تھی
رخصتِ خلوت و جلوت انھیں دی جاتی تھی　　سب چھپی اور ڈھکی ان سے کہی جاتی تھی
ڈھونڈ ڈھونڈ ان کو بلاتے تھے حکومت کے لیے
خدمت ان کے لیے تھی اور وہ خدمت کے لیے

ان کی نسلوں کی بھی کیا آج یہی ہے توقیر　　نوکری کے لیے پھرتے ہیں جو کرتے تدبیر
کاش سوجھے انھیں جو پیٹ رہے ہیں وہ لکیر　　کاش سمجھیں کہ ہیں کس وہم کے پھندے میں اسیر
بھاگوان آیا تھا جو قوم پہ وہ سال گیا
گئے منصب بھی، جہاں قوم کا اقبال گیا

اب حسب اور نسب کچھ نہیں نازش کا محل　　گردشِ دہر نے دی صورتِ احوال بدل
خاندانوں کی نجیبوں کے گئی ٹھیک نکل　　کسی قابل نہ رہے شیخ نہ سید نہ مغل
گر گئے جو مئے پندار کے تھے متوالے
بڑھ گئے پیشہ و مزدوری و محنت والے

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں　　چاہیے سعی و مشقت سے نہ وہ عار کریں
ہو میسر جنھیں وہ خدمتِ سرکار کریں　　ورنہ مزدوری و محنت سرِ بازار کریں
آبرو اس میں ہے شان اس میں ہے عزت اس میں
فخر اس میں ہے شرف اس میں شرافت اس میں

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں　　کشت کاری کریں آئینِ فلاحت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آدابِ سیاحت سیکھیں　　الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں
کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

بیٹا عمران کا وہ فخرِ بنی اسرائیل　　ہم سخن جس سے ہوا طور پہ خود ربِ جلیل
جس نے فرعون کے لشکر کو کیا خوار و ذلیل　　جس کے خود دست و عصا میں تھی رسالت کی دلیل
گلہ بانی کے لیے پایا جو ایمائے شعیب
بکریاں اس نے چرانے میں نہ کچھ سمجھا عیب

انبیا پیشے پہ گزران سدا کرتے رہے | اولیا خلق کی طاعت سے ابا کرتے رہے
خدمتِ جنس سے نفرت حکما کرتے رہے | حاجتیں آپ ہی سب اپنی روا کرتے رہے
اپنے ہاتھوں سے ہر اک کام نبیڑا اپنا
کھینچ کر لے گئے خود موج سے بیڑا اپنا

کی ہے مردوں نے اسی طرح سے دنیا میں گزر | ہوئی تکلیف سے یا چین سے اوقات بسر
نہ ہوئے غیر کے تا زیست کبھی دست نگر | جب پڑی اپنے ہی بازو پہ پڑی جا کے نظر
گئے دل جمع یہاں سے کہ پریشان گئے
پر زمانے کے نہ شرمندۂ احسان گئے

ہوں گے حالی سے نہ دنیا میں کہیں ہرزہ سرا | خود ہیں گم راہ مگر قوم کے ہیں راہ نما
جھکتے جھکتے ہوئی پشت آپ کی خدمت میں دونا | اس پہ ہے خیر سے آزادہ روی کا دعویٰ
بات کہنی وہی زیبا ہے کہ ہو جس میں اثر
ورنہ بے صرفہ نصیحت سے خموشی بہتر

3 مسلمانوں کی تعلیم [6]

(سنہ تصنیف: 1889، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

زمانہ دیر سے چلّا رہا ہے اے مسلمانو! | کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
سنے ہوں گر نہ معنیٰ 'لَا تَسُبُّوا الدَّھرَ' [7] کے تم نے | تو اب سن لو کہ ہوں میں شانِ ربانی مجھے مانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے | اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو
مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو | خبر تم کو بھی ہے کچھ، اے مری چالوں سے بیگانو!
گئے وہ دن کہ نفریں کرتے تھے دیں دار دنیا پر | بقائے دین و ملت منحصر دنیا پہ اب جانو
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے | بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ، اے تن آسانو!
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے | ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل، مری جانو!
مٹے ہو جس ہنر اور فن پہ تم وہ مٹنے والے ہیں | یہ سودا کب تک اے شمعِ سحر گاہی کے پروانو

بھرا سمجھے ہو جس گھر کو نہیں دیّار واں کوئی   کہاں بیٹھے ہو تم اے خانۂ ویراں کے دربانو
نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ   پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

***

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری   جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ ان کو   کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں   نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر   تجارت کی نہ ہو گی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئے گی پسند ان نوکروں کی خدمت و طاعت   جنھیں پائیں گے آقا زیورِ تعلیم سے عاری
اگر چاہیں گے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی   تو دینا ہو گا ان کو امتحانِ علمِ بیطاری
نہ مستغنی بکاول علم سے ہے اب، نہ باورچی   ہوا ہے مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری
یقیں جانو کہ آئندہ ملے گی درس گاہوں میں   گر آٹا پیسنے کو چاہیے گی اک پسنہاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز   نہ فصّادی، نہ جرّاحی، نہ کحّالی، نہ عطّاری
جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے   جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

***

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا زیور   ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا   نہ زرگر اور نہ آہن گر، نہ بازی گر، نہ سوداگر
مہندس چاہیے مزدور اب اور راج اقلیدس   بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور
نہ پہنے گا کوئی جاہل کی شاید سی ہوئی جوتی   بس اب موچی فلاطوں سے یونہی کچھ ہوں تو ہوں کمتر
جہاں داری میں آج ایک ایک عامل ہے جم و کسریٰ   جہاں گیری میں ہے اک اک سپاہی طغرل و سنجر
گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے   برابر تھا بیے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا   جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اس سے اعلیٰ تر
کوئی دن میں خسارہ سب سے بڑھ کر اس کو سمجھیں گے   کہ دو دن آدمی ٹھہرا رہے یاں ایک حالت پر

نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان وحیواں میں　　دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آ کر
زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا　　کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام ان کا مٹا دوں گا

***

ہمارے شکر سے اے قوم! احساں اس کا بالا ہے　　کہ جس نے قوم کی تعلیم کا یاں ڈول ڈالا ہے
خدا کی برکت ورحمت ہو نازل تجھ پہ اے سید　　کہ تو نے بھائیوں کا ڈوبتا بیڑا سنبھالا ہے
فدائی قوم کے تجھ سے ہی گزرے ہوں گے دنیا میں　　کہ دل سوزی کا جن کی آج قوموں میں اُجالا ہے
بھلائی کا تری احسان مانیں یا نہ مانیں ہم　　بھلائی کرنے والوں کا ہمیشہ بول بالا ہے
کریں کیا گر نہ ابنائے زماں ہوں بدگماں تجھ سے　　کہ دردِ دل کی کیفیت سمجھ سے ان کی بالا ہے
نمونہ کوئی ہمدردی کا دیکھا تھا نہ یاروں نے　　ترے کاموں نے ان کو اس لیے حیرت میں ڈالا ہے
کیا ہے کام جو تو نے نہ ڈر انجام سے اس کے　　کہ نیکی کا نشاں قائم خدا خود رکھنے والا ہے
کیا گو تو نے سب کچھ پر بہت کچھ ہے ابھی کرنا　　ہے آخر قوم کی تعلیم یا منہ کا نوالا ہے
جسے احباب اک قصرِ رفیع الشان سمجھے ہیں　　نہ ہو تو اس کا پشتی باں تو اک مکڑی کا جالا ہے
عزیزوں کو خدا وہ نامبارک دن نہ دکھلائے　　کہ سایہ تیری ہمدردی کا ان کے سر سے اُٹھ جائے

***

ترے احسان رہ رہ کر سدا یاد آئیں گے ان کو　　کریں گے ذکر ہر مجلس میں اور دہرائیں گے ان کو
تری کوشش پہ تیری زندگی میں جو کہ ہنستے ہیں　　نتائج اس کے تیرے بعد خوں رلوائیں گے ان کو
تری رایوں کو جو منسوب کرتے ہیں ضلالت سے　　زمانے کے حوائج جلد تری شرمائیں گے ان کو
ترے کاموں کو خود کامی پہ جو محمول کرتے ہیں　　دل ان کے کوئی دن جاتا ہے خود جھٹلائیں گے ان کو
انھوں نے خود غرض شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید　　وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم دکھلائیں گے ان کو
بہت مشکل ہے جانی سرد مہری قوم کے دل سے　　مگر تیرے ہی دل کے داغ کچھ گرمائیں گے ان کو
اگر ہیں بھی کہیں کچھ کچھ دبی چنگاریاں باقی　　لگائیں گی وہ گھر میں آگ جب سلگائیں گے ان کو
بہت ہیں مدعی ہمدردیِ اسلام کے لیکن　　ٹٹولیں گے انھیں جب یار خالی پائیں گے ان کو

کبھی تسبیح کو ان کی ملی فرصت وظائف سے   تو تیری خدمتیں اسلام کی گنوائیں گے ان کو

ملا گو قوم سے اب تک نہیں اصلا صلہ تجھ کو   نہیں اُمید پر تجھ سے کہ ہو اس کا گلہ تجھ کو

***

جنھوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے   انھوں نے پھل سدا محنت کا کم دنیا میں پایا ہے

یہ تیری خوش نصیبی ہے کہ ثمرہ تیری کوشش کا   خدا نے زندگانی میں تری تجھ کو دکھایا ہے

بہت جھکڑ چلے اور آئیں اکثر آندھیاں لیکن   رہا گلزار ہو کر باغ جو تو نے لگایا ہے

دیا ہے ساتھ بھی تیرا ہزاروں نے دل وجاں سے   اگر دو چار نے کچھ کہہ کے دل تیرا دکھایا ہے

ادھر پورب سے پچھم تک ادھر اتر سے دکھن تک   مددگار اپنا جس گوشے میں ڈھونڈا تو نے پایا ہے

اودھ سے سندھ تک کشمیر سے راس کماری تک   دلوں میں تو نے سکہ شہر شہر اپنا بٹھایا ہے

دکن میں تیرے یاور ہیں دوآبے میں ترے ساتھی   ترا مداح ملکوں میں ہر اک اپنا پرایا ہے

خصوصاً وہ مبارک ملک جس نے ہند میں اوّل   رکاب اسلام کی تھامی اور اس پر سر جھکایا ہے

خدا کی برکتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر   جنھوں نے ہر سفر میں تجھ کو آنکھوں پر بٹھایا ہے

جنھوں نے قوم کا ہمدرد دل سے تجھ کو مانا ہے   تری نصرت میں اخلاصِ مسلمانی دکھایا ہے

نہ ہو افسردہ دل اور قوم پر فیض اپنا رکھ جاری   کہ اک ہمت سے تیری بندھ رہی ہیں ہمتیں ساری

***

ہوئے ہیں سرد دل یاروں کے، تو ڈھارس بندھاتا رہ   امیدیں ان کی استقلال سے اپنے بڑھاتا رہ

ہوا پُروا ہو یا پچھوا، نہ کر تو اس کی کچھ پَروا   لگایا ہے چمن تو نے تو پود اس میں لگاتا رہ

اُمیدیں ہیں بہت وابستہ تیری زندگانی سے   دعائیں قوم کی لے لے کے عمر اپنی بڑھاتا رہ

ابھی سیراب کم ہیں اور بہت ہیں تشنہ لب باقی   سبیل آخر لگائی ہے تو پیاسوں کو پلاتا رہ

نہیں تعلیم بے علموں کی کم احیاے موتیٰ سے   جہاں تک تجھ میں دم باقی ہے مردوں کو جلاتا رہ

زبانیں تو نے گر اپنے پہ کھلوائی ہیں حق کہہ کر   تو خاموشی سے اپنی، نکتہ چینوں کو تھکاتا رہ

فرو ہوتی نہیں آتش سے جب آتش بھڑکتی ہے   ہر اک شعلے کو آبِ بردباری سے بجھاتا رہ

کیا ہے زندہ قوموں کو سدا قوموں کے کشتوں نے   مہم گر فتح کرنی ہے تو چوٹیں دل پہ کھاتا رہ

شدائد میں تحمل خاص میراث انبیا کی ہے
جو تو آلِ محمدؐ ہے تو سب صدمے اُٹھاتا رہ
کوئی دن اور اس دارالمحن میں رنج سہنا ہے
پھر اس کے بعد تجھ کو زندۂ جاوید رہنا ہے

***

عزیزو، حق کی رحمت ہے یہ پیرِ ناتواں ہم میں
پھر ایسا پیر ہے ہم میں، نہ ہے کوئی جواں ہم میں
ہزاروں ہم میں ہوں گے بیچلر اور ماسٹر پیدا
مگر اے قوم پھر یہ صورتیں پیدا کہاں ہم میں
ہو ہم میں قوم کا ہمدرد، یہ قدرت خدا کی ہے
نہیں رشتہ کوئی مدت سے باقی درمیاں ہم میں
ہمارے تفرقوں نے کر دیے تحلیل سب اجزا
نہ پاؤ گے کہیں ترکیبِ قومی کا نشاں ہم میں
ابھی اٹھ کر فلاحِ قوم پر کوئی کمر باندھے
ہزاروں اس سے ہو جائیں گے پیدا بدگماں ہم میں
ابھی سن لیں کسی قومی جماعت میں شکر رنجی
ہزاروں ہوں گے یہ بدفال سن کر شادماں ہم میں
بن آئے قوم کی خدمت تو کیوں کر ہم سے بن آئے
نہ دور اندیشیاں ہم میں، نہ خیر اندیشیاں ہم میں
اگر بوجھ اس پہیلی کی نہ سید ہم کو بتلاتا
تو اسلامی اخوت تھی فقط اک چیستاں ہم میں
نہ کی سیّد کے منصوبوں کی گر تائید یاروں نے
تو پھر ہرگز سنبھلنے کی نہیں تاب و تواں ہم میں
بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے منزل کا نشاں یارو
پہنچنے دو سلامت تا بہ منزل کارواں یارو

***

رہو جیسے رہے ہو قوم کے غم خوار و یار اب تک
کرو دھندلا نہ اس رستے کو جو ہے بے غبار اب تک
جماعت کو تمھاری دیکھتے ہیں لوگ حیرت سے
تمھارے دم سے ہے کچھ قوم کا باقی وقار اب تک
تمھاری کوشش اور ہمت کا ہے چرچا زمانے میں
تمھاری خدمتوں کی قوم ہے منت گزار اب تک
جو کام انجام کرنا ہے تو سید کے رہو حامی
کہ قومی کامیابی کا اسی پر ہے مدار اب تک
وگرنہ دوستو! سن لو کہ ہے آپس کی ان بن کا
وہی انجام جو ہوتا رہا ہے آشکار اب تک
پڑے ہیں جا بجا بکھرے ہوئے اطرافِ عالم میں
کھنڈر لاکھوں، ہمارے تفرقوں کی یادگار اب تک
ہزاروں باغ ویراں ہو گئے آپس کے جھگڑوں میں
پلٹ کر پھر نہیں آئی جہاں فصلِ بہار اب تک
سفینے غرق لاکھوں کر دیے بادِ مخالف نے
زمانے کو نہیں معلوم خود جن کا شمار اب تک
نہ سمجھو یہ کہ فارغ ہو گئے ہم خاک میں مل کر
ہماری گھات میں ہے انقلابِ روزگار اب تک

نظر آتا نہیں یاں حملۂ دوراں سے بچنے کو — سوا اک درس گاہِ قوم کے کوئی حصار اب تک
کرو پورا حصارِ قوم کو سر جوڑ کر یارو! — ہٹاؤ حملۂ دوراں کو سب جی توڑ کر یارو!

***

یہ دار العلم سدِّ راہِ آسیبِ زماں ہو گا — اسی دار الشفا میں بختِ پیر اپنا جواں ہو گا
نہیں صورت اُبھرنے کی ہمارے کوئی پستی سے — اگر ہو گا اسی گھر سے بلند اپنا نشاں ہو گا
کمی نے کر دیا ہے علم کی ہم کو سبک سب سے — اسی پاسنگ سے ہو گا تو یہ پلہ گراں ہو گا
یہ بیت العلم روز افزوں ترقی کا ہے سرچشمہ — اسی چشمے سے دیکھو گے تو اک دریا رواں ہوگا
اگر راس آ گئی آب و ہوا اس کھیت کی ہم کو — تو جو اُٹھے گا پودا اس زمیں سے آسماں ہو گا
یقیں ہے ٹہنیاں پھیلیں گی طوبیٰ سے سوا اس کی — ہمارے واسطے دنیا میں یہ باغِ جناں ہو گا
اگر اسلام میں باقی ہے خصلت حق شناسی کی — تو ایک اک نونہال اس باغ کا خود باغباں ہوگا
جو حق نے عالمِ اسباب دنیا کو بنایا ہے — تو جو نکلے گا یاں سے کامیاب و کامراں ہو گا
بہت مدت سے ہے قحط الرجال اے قوم امت میں — اسی کھیتی سے اس میں جنسِ مردم کا سماں ہو گا
بنا اسلام کی کہتے ہیں یہ تعلیم ڈھا دے گی — نہ ڈھینے دے گا حق اسلام پر گر مہرباں ہو گا
کسوٹی ہے یہ دار العلم اسلامی اخوت کی — ہم اس سے بدگماں ہوں گے جو اس سے بدگماں ہوگا
کبھی یاں آ کے کچھ دیکھا بھی ہے اے نکتہ چیں یارو؟ — برا کہنا گھروں میں بیٹھ کر اچھا نہیں یارو!

***

اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں، آ کر یہ چمن دیکھیں — ریاضِ قوم کا فصلِ خزاں میں بانکپن دیکھیں
وطن کو جو سمجھتے ہیں کہ ہے ترجیح غربت پر — وہ آ کر شامِ غربت بہتر از صبحِ وطن دیکھیں
ہوئے ہیں جمع یاں جو نونہال اطراف سے آ کر — بہم سب کو شریکِ شادی و رنج و محن دیکھیں
محبت ان میں جب دیکھیں تو سمجھیں بھائی ماں جائے — وطن پوچھیں تو ہند و سند و پنجاب و دکن دیکھیں
اگر غیبت میں پوچھیں ایک کا حال ایک سے آ کر — تو ہر طفل و جواں میں حفظِ عیب و حسنِ ظن دیکھیں
تکلف سے بری ایک اک کو دیکھیں اور بناوٹ سے — سخن میں راستی دیکھیں بیاں میں سادہ پن دیکھیں
تواضع منعموں کی دیکھیں اور غیرت غریبوں کی — ادب بچوں کا دیکھیں، نوجوانوں کا چلن دیکھیں

تامل رائے میں دیکھیں تو دیکھیں کام میں پھرتی — لڑائی فیلڈ[8] میں دیکھیں کلب میں یونین[9] دیکھیں
اطاعت سلطنت کی، احترامِ اہلِ حکومت کا — وفاداری کی گردن میں بندھی سب کے رسن دیکھیں
نہ بوان میں غلامی کی، نہ بے باکی کی خُو ان میں — ادب اور معتدل آزادگی ان کا چلن دیکھیں
زباں سے قیصرِ ہندوستان کا نام لے کوئی — تو اک دریا محبت کا دلوں میں موج زن دیکھیں
سلف پر فخر دیکھیں اور تأسف اپنی حالت پر — لگن اسلام کی اور قوم کی دل میں چبھن دیکھیں
نمازوں کی تقیّد دیکھیں اور روزوں کی پابندی — اجازت نیک کرداری کی اور ہر کام کی بندی

***

کلب میں آ کے گر احباب رنگِ انجمن دیکھیں — تو زیبِ کرسیِ صدر اک مجسم یونین دیکھیں
نہ دیکھی ہوں جنھوں نے شفقت وطاعت کی تصویریں — وہ بیک اور اس کے شاگردوں کو مصروفِ سخن دیکھیں
تأسف کرتے ہیں جو ہند کی نااتفاقی پر — کلب میں ہندیوں کے آئیں وہ اور یونین دیکھیں
اگر باور نہ ہو اخلاص سنی اور شیعی کا — بہم شیر وشکریاں چار یار و پنج تن دیکھیں
نہ دیکھا ہو جنھوں نے پیار ہندو اور مسلماں میں — وہ آ کر مسلم و ہندو کو یک جان و دو تن دیکھیں
مسیحی پوششیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کی — مسیحی کو مسلمانی قبا زیبِ بدن دیکھیں
مجسم دیکھنی ہو شکلِ مہرِ مادری جن کو — وہ بچوں سے سلوکِ آرنلڈ و ماریسن دیکھیں
اگر ہو دیکھنی تقریر میں تصویر معنی کی — تو والس کا بہ وقتِ درس اندازِ سخن دیکھیں
اگر اسکول میں چاہیں کہ دیکھیں ہورسٹ کو آ کر — فرائض میں تمام اوقات اس کے مرتہن دیکھیں
دمِ تدریس دیکھیں چکرورتی[10] کو اگر برسوں — نہ پیشانی پہ بل دیکھیں، نہ ابرو میں شکن دیکھیں
ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن — تو شبلی سا وحیدِ عصر و یکتائے زمن دیکھیں
سخن کوتاہ، دار العلم پر ہوں قوم کے نازاں — جو آ کر اس کا ایک اک دُرِّ مکنوں مِن وعَن دیکھیں
پھر ان کے بعد گر دیکھیں مربی اپنے بچوں کا — تو اک بچوں سے بڑھ کر زندہ دل پیرِ کہن دیکھیں
خوشی میں رنج میں صحت میں بیماری میں دکھ سکھ میں — اسے جب آ کے دیکھیں قوم کی دھن میں مگن دیکھیں
رہیں چپ کس طرح ہم باغباں کی مدح وتحسیں سے — جب ایسا حیرت افزا آنکھ سے اپنی چمن دیکھیں
نہ سمجھیں یہ کہ ہے اس کو ہماری مدح کی پروا — اگر سیّد کا استحقاق اہلِ انجمن دیکھیں

محبِ قوم سنتا ہے در و دیوار سے تحسیں　　جنھیں باور نہ آئے وہ محبِ قوم بن دیکھیں
ادا سیّد کا حق تو ہم سے ہوسکتا ہے کیا حالی　　مگر ہاں ہم کو اپنا فرض کرنا تھا ادا حالی

4 ترکیب بند (’قوم کا متوسط طبقہ‘) [11]

(سنہ تصنیف: 1891، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیوں کر زباں　　تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں
جب ہوئے بھوکے تو بخشی تو نے نان و نانخورش　　پر نہ اتنی معدہ و احشا پہ جو گزرے گراں
جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک　　پر نہ ایسا ہو صراحی جس کی یاروں سے نہاں
ڈھانکنا چاہا بدن جب تو دیا تو نے لباس　　پر نہ ایسا جس کو حسرت سے تکیں خورد و کلاں
کھانے پینے کو کیے برتن ہمیں تو نے عطا　　پر نہ ایسے ٹوٹنے سے جن کے ہو خوفِ زیاں
سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں　　پر نہ ایسا جس سے اٹھنا ہو طبیعت پر گراں
رہنے سہنے کو دیے گھر تو نے ہم کو ہر جگہ　　پر نہ ایسے ہو تعلق جن سے مثلِ جسم و جاں
آنے جانے کو دیے دو پاؤں یاں تو نے ہمیں　　جن سے ڈر لے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں
راہ اور بے راہ یکساں جن کو ہنگامِ خرام　　کوہ سدِّ راہ جن کا اور نہ خندق اور کنواں
کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر　　پر نہ ایسی تختِ فرعونی کا ہو جس پر گماں
سیم و زر وقتِ ضرورت ہم کو تو دیتا رہا　　پر نہ اتنا ہو نگہبانی میں جس کی بیمِ جاں
آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز　　پر نہ ایسی جس سے ہوں محسودِ ابنائے زماں
نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دی　　تا کہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہم پر عیاں
راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد　　تا کہ کھو بیٹھیں نہ ہم ان راحتوں کو رائیگاں
وقت پر کرتا رہا بارانِ رحمت سے نہال　　قحط اور طوفان دونوں سے بچایا بال بال

***

الحذر، اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر　　لومڑی جاتے ہیں بن جس کی بدولت شیرِ نر
چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیر　　ناکسوں کے نازِ بے جا سہتے ہیں اہلِ ہنر

وزن میں علم و فضیلت جن کے ہے ہم سنگِ کوہ　　وہ سبک تر دانۂ خردل سے آتے ہیں نظر
فقر و حاجت میں نہ ہو انساں کو جب صبر و شکیب　　پھر نہیں کوئی برائی فقر و حاجت سے بتر
بھیک منگوائے، جوا کھلوائے، یہ چوری کرائے　　پت گنوائے، آبرو کھوئے، پھرائے دربدر
ہو سکے محتاج سے طاعت نہ یاد اللہ کی　　لے سکے محتاج جورو کی، نہ بچوں کی خبر
گہ زباں آلودہ اس کی شکوۂ تقدیر سے　　اور کبھی بوچھار اس کی آسمانِ پیر پر
گر بخیلوں کی مذمت پر کبھی آ جائے وہ　　ہو نہ سب و شتم سے سیری اسے دو دو پہر
اُگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ　　کھول دے غیبت کا دفتر اہل دولت کی اگر
گہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے　　تا کہ دولت مند بھی کچھ دن رہیں آسیمہ گر
اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب　　تا کہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر
بے حلاوت اس کی دنیا اور مذبذب اس کا دیں　　خوف ناک اس کا ارادہ، نیت اس کی پرخطر
رات اس کی حسرت آگیں اور دن اندوہ گیں　　شام اس کی پرنحوست اور شوم اس کی سحر
گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا　　تھا مگر ثروت میں اس سے بھی زیادہ شور و شر
فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں　　پر نہ دی ثروت سوا اس کے شکر کی طاقت نہیں

***

نشۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں رہنا محال　　اس مئے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال
نفسِ امارہ اور اس پر چھیڑ مال و جاہ کی　　ڈھیر ہے بارود کا، دیجے پتنگا جس میں ڈال
بادِ صرصر آگ کو اس طرح بھڑکاتی نہیں　　جس طرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال
ہضم کرنا اور بچانا مال و دولت کا ہے بس　　نفسِ انساں میں اگر بالفرض ہے کوئی کمال
ورنہ مال و جاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم　　اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال
عقل ٹھہراتی ہے جو افعال انساں پر حرام　　کر دیے اس کے لیے سب مال و دولت نے حلال
فقر میں تھا نفسِ دوں واماندہ جس پرواز سے　　آ کے ثروت نے دیے پر واسطے اس کے نکال
خواہشیں یوں نفس میں اب دم بہ دم بڑھنے لگیں　　مغز میں جس طرح دیوانے کے گوناگوں خیال
آپ کو گننے لگا بالاتر از ابنائے جنس　　چیونٹیوں میں ایک نے گویا نکالے پر و بال

مسرفِ بے زر ہو جیسے قرض خواہوں میں گھرا　　خواہشوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے بال بال
جھک پڑی طبعِ دنی گر بخل و خست کی طرف　　ہو گئی فرزند و زن پر زندگی اس کی وبال
اور اگر بھوت اس کے سر پر چڑھ گیا اسراف کا　　پھر نہیں گنجینۂ قاروں کچھ آگے اس کے مال
آ گیا غالب طبیعت پر گر استسقاے حرص　　ہے سمندر سے بھی اس کی پیاس کا بجھنا محال
باڑھ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اس قدر　　جس قدر ثروت میں ہے دشوار پاسِ اعتدال
گلشن دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر　　دیکھا اے روباہِ نفسِ دوں حذر، ان سے حذر

***

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی　　فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری
چین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہے　　یہ جو ہے برزخ میانِ مکنت و دستِ تہی
فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ و جنت اگر　　مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی
دخل شیطاں کا ہو جس میں ایسی جنت کو سلام　　منزلِ اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی
اس کٹھن منزل میں ہے بٹیا یہی اک بے خطر　　ہیں ادھر کھڈ اور چڑھائی ہے اُدھر البرز کی
رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین　　ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مہلک سے بری
اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک　　دیکھ کر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل دہی
سن کے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و ناز　　مل کے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر خنّاً کبھی
لذتِ فقر و غنا دونوں سے ہیں وہ آشنا　　اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی
جو گزرتی ہے گدا پر اس سے ہیں وہ باخبر　　کیونکہ حالت گاہ گاہ ان پر بھی گزری ہے یہی
امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے　　کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی
اس لیے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابناے جنس　　جوش ہمدردی سے بے کل ان کا ہو جاتا ہے جی
اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا　　جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی از خود رفتگی
مست کی بے اختیار، تشنگی مخمور کی　　واردات اک ایک کی ہے سر بسر ان پر کھلی
جنت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر　　گندم اور زقوم دونوں ان کے ہیں پیشِ نظر

***

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت ان سے ہے
منتظم ہر قوم و ملت کی جماعت ان سے ہے

مشکلیں اکثر انہی سے قوم کی ہوتی ہیں حل
بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت ان سے ہے

ہے انہی کے دم سے جو ہے گرمیِ ہنگامہ آج
ساری قومی مجلسوں کی زیب و زینت ان سے ہے

ہے جہاں دولت، یہی ہیں نظمِ دولت کے کفیل
ملک کی دولت میں ہے جو خیر و برکت ان سے ہے

ہاتھ میں ان کے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام
عقل و دانش میں ہے جن ملکوں کی شہرت ان سے ہے

ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر
شاہ ہوں یا ہوں گدا دونوں کو قوت ان سے ہے

آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے
نوعِ انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے

یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں
رونقِ بازارِ جنسِ علم و حکمت ان سے ہے

پاؤ گے ان میں طبیب ان میں ادیب ان میں خطیب
ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے

پاؤ گے ان میں مہندس، پاؤ گے ان میں حکیم
آدمی مصداقِ رحمانی خلافت ان سے ہے

کرتے ہیں اخلاق ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے

ان میں قوموں کے ہیں مصلح ان میں ملکوں کے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت ان سے ہے

پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قوموں میں یک رنگی و وحدت ان سے ہے

دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

***

گر نہ ہو ہر حال میں ان کی مصالح پر نظر
ہیں مفاسد گرد و پیش ان کے فراہم سربسر

کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں
ہے انھیں بھی شر سے یاں بچ بچ کے رہنا عمر بھر

گھاٹیاں فقر و غنا کی ان کے ہیں دونوں طرف
اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر

ایک جانب پستیِ فطرت ہے اور دوں ہمتی
ایک جانب سستی و غفلت ہے اور کبر و بطر

جھک پڑے گر اس طرف تو مفت کھو بیٹھے انھیں
وہ جو اُڑنے کے لیے حق نے دیے تھے بال و پر

ڈھل گئے گر اس طرف سو اس بلا میں پھنس گئے
جس میں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر

برکتیں اللہ کی اس قوم پر جس قوم میں
رہ سپر یہ طبقۂ والا ہو سیدھی راہ پر

ہیں معطل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست
سب کی پڑتی ہے انہی کے دست و بازو پر نظر

جو قویٰ ان کو ملے ہیں کام میں لائیں انھیں   تا کہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی بسر
فرض ہیں جو ان کے ذمے خالق اور مخلوق کے   ان میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آٹھوں پہر
قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اسے   کیونکہ اس کے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر
گو نجات انساں کو مکروہاتِ دنیا سے نہیں   جن سے بچنا گوشت سے ناخن چھٹانا ہے، مگر
کام دنیا میں سنوارے ہیں جنھوں نے قوم کے   تھے نکموں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر
سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے کام   اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر
جس طرح اس انجمن کے رکن آئے ہیں تمام   قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام

***

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی   جس سے جاں آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
اتفاق قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل   رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی
مال و دولت نامبارک ہے نہ ہو گر اتفاق   قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی
یاں وکیل ایک اک ہے شہر اور ملک کا قائم مقام   دانے کو کرتی ہے جو خرمن، وہ برکت ہے یہی
رائیگاں جائے گا یاروں کا نہ یہ رنجِ سفر   راحتیں جس کی طفیلی ہیں وہ زحمت ہے یہی
فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں یاں سے مجتمع   ملتے ہیں جس کی بدولت دل وہ ملت ہے یہی
تم ہمارے کام آؤ، ہم تمھارے آئیں کام   جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی
قوم کی خدمت میں ہے مضمر ربوبیت کی شان   جو کہ پجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی
قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز   ملک میں عزت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی
سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار   جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی
کر رہا ہے قوم کے سرکل [12] کو یہ مجمع وسیع   جزر سے افزوں ہے مد جس کا وہ رجعت ہے یہی
اتفاقاً گر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد   ڈر نہیں اس کا کہ خود قانونِ قدرت ہے یہی
ہے کبھی افراطِ باراں اور کبھی ہے قحطِ آب   طینتِ عالم میں خاصیت ودیعت ہے یہی
کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس   جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلت ہے یہی
دیگ تو پکنی ہے یہ پکے گی دھیمی آنچ میں   کچھ اُبال آیا تو ہے اس میں غنیمت ہے یہی
انجمن ہے قوم کی ہنگامۂ شادی نہیں   ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں [13]

5 ترکیب بند ('جشنِ قومی')[14]

(سنہ تصنیف: 1892، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

یہ خاک، آج جس پر ہیں جمع اہل آرا   یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گزر چکی ہیں   آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا
کل جشنِ فتح تھا یاں، ہے آج جشنِ شادی   ہر دم عروج پر ہے اسلام کا ستارا
بلبن کے آج مہماں خاقاں ہیں اور سلاطیں   اصطخر ہے کہ دلی، بلبن ہے یا کہ دارا
فیروز شہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آمد آمد   دولہا بنا ہوا ہے تزئیں سے شہر سارا
تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل   بہرِ مدافعت ہے میدان میں صف آرا
مغلوں کے اڑ رہے ہیں کل جشنِ فتح ونصرت   تیمور سے زمانہ ہے برسرِ مدارا
کل سوریوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے   مغلوں کا آ رہا ہے گردش میں کچھ ستارا
ہے جشنِ فتح پھر آج چغتائیوں میں برپا   اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قول ہارا
جس دھوم سے ہے گھر گھر جشنِ جلوسِ اکبر   ہے گرد اس کے آگے جشن قباد و دارا
شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا   تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارا
تیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے   گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدہ[15] دوبارا
اطرافِ ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے   پا کر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا
ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر   بالائے تختِ طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا
وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں   پر جشن ان کے اب تک سب زیبِ داستاں ہیں

***

اے خاکِ پاکِ دہلی! اے تخت گاہ شاہاں!   پیش نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز وساماں
ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سو   پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یاں
تقریبِ جشن جس میں ہو کچھ نہ جز اخوّت   ملکوں سے جمع آ کر جس میں ہوئے ہوں اخواں
پائین وصدر کا ہو جس میں نہ کچھ تفاوت   خورد و بزرگ کی ہو جس میں نشست یکساں

جن کو نہ ہو بلاوا حاکم کا اور نہ قدغن
لایا ہو کھینچ کر دل ان کو، نہ حکم سلطاں
خادم ہوں جس قدر واں مخدومِ قوم کے ہوں
مخدوم جتنے ہوں واں سب قوم پر ہوں قرباں
خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ واں تواضع
ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں
ٹھہرائیں جس کو چاہیں وہ آپ میرِ مجلس
چاہیں جنھیں بنائیں وہ آپ میرِ ساماں
آئے ہوں اس غرض سے سب مل کے تاکہ سوچیں
دنیا میں کس طرح ہوں سرسبز پھر مسلماں
ہندوستاں میں کیوں کر باقی رہے نشانی
اس قوم کی کہ تھا کل جن کے وہ زیرِ فرماں
نکلیں تو کیوں کہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے
اعزاز نے تھا باندھا جن کے بڑوں سے پیماں
ان مدرسوں کا کیوں کر جاری رہے افاضہ
جن کے سبب ہے زندہ نامِ حدیث وقرآں
جو مسجدیں ہیں بہرِ ذکرِ خدائے واحد
محفوظ حادثوں سے کیوں کر ہوں ان کے ارکاں
جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر پر
اپنی طرف سے لیکن ہے سعی فرضِ انساں
اے شہ نشینِ اسلام، اے معدنِ سلاطیں
اے پائے تختِ سادات، اے دارِ ملکِ مغلاں
تو جشن گاہِ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے؟

***

شاہوں کے جشن تھے وہ، یہ جشن قوم کا ہے
شوکت میں وہ بڑے تھے، عظمت میں یہ بڑا ہے
دولت کے تھے وہ جلوے، ملت کا ہے یہ نقشہ
کاغذ کی تھیں وہ ناویں، بیڑا یہ نوحؑ کا ہے
بے روح تھے وہ قالب، ہے اس میں روحِ خویشی
موجِ سراب تھے وہ، یہ چشمۂ بقا ہے
میلے نہ وہ بچھڑتے روح ان میں گر یہ ہوتی
رہتا ہے آندھیوں میں روشن، یہ وہ دیا ہے
وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر
اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے
بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا
یہ چھت نہ سمجھو سر پر یہ سایۂ ہما ہے
گم گشتہ بخت جس کو پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہم
لگتا ہے کچھ تو اس کا لگتا یہیں پتا ہے
وہ مشکلیں کریں گے اب حل ہمی تمہی کچھ
جن مشکلوں کا ہم کو اور تم کو سامنا ہے
ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے
معذور ہیں وہ ان سے شکوہ نہ کچھ گلہ ہے
فوجِ کمک کو اکثر سمجھا ہے فوج دشمن
حملہ کمک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے

نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہوا ہے جب دن
انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے

قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہو گی ہم کو
اب تک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہے جان پر جب
لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بے خبر ہیں
پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہے ناخدا جب

***

گلشن میں فصلِ گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی
بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں

فضل و کمال ان کے کچھ تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو، اٹھتی جوانیاں ہیں

تم سے تھمے تو تھامو عزت کو قوم کی کچھ
اپنے تو قافلے سب پا در رکاب یاں ہیں

اک خضر رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں

خدمت میں ان کی حالی کہتا ہے یہ ادب سے
اس وقت رونق افزا یاں جتنے مہرباں ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں

عرصہ ہوا کہ ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں
قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

گھڑیال اور مگرمچھ، ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو، وگرنہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گُم نام و بے نشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روزِ بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ نہ جائیں

***

6 صدائے گدایانِ قوم[16]

(سنہ تصنیف: 1893، ہیئت: قطعہ، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

ڈھونڈھنے خضرِ مبارک پے کو یاں آئے ہیں ہم
چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم
ڈر ہے جو خوش دل ہیں وہ سن کر نہ ہوں پژمردہ دل
سخت عبرت خیز لے کر داستاں آئے ہیں ہم
ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن
لے کے اس کا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم [17]
علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے [18]
آج اس در پر اسی کے نوحہ خواں آئے ہیں ہم
قوم کھو بیٹھی ہے جو عباسیوں کی یادگار
جستجو میں اس کی مشعل لے کے یاں آئے ہیں ہم
تا کہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اس لیے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم
خودغرض ٹھہرائیں یا مکار ہم کو یا گدا
ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم
فخر سب بے جا ہیں ان کے، قوم ہے جن کی ذلیل
فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم
ہے بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل
اس لیے یاں بن بلائے میہماں آئے ہیں ہم
تشنگی اپنی بجھانی ہو گی اے آبِ حیات!
لے کے منہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

7 حاضرینِ کانفرنس سے خطاب

(سنہ تصنیف: 1898، ہیئت: قطعہ، ماخذ: جواہرات حالی)

اے خاصگانِ ملت و اے یاورانِ قوم!
اے زمرۂ معارف و اے طبقۂ کرام!
بندھتی ہے بہتری کی تمھیں دیکھ کر اُمید
ورنہ دلوں پہ چھائی ہیں مایوسیاں تمام
تم آ کے مردہ قوم میں دیتے ہو جان ڈال
ورنہ تمام اس کا بس اب ہو چکا ہے کام
قومی خوشی کے ہیں یہی گویا کہ چار دن
پھر سال بھر وہی غم و اندوہ صبح و شام
جس جوش میں کہ آتے ہو یاں دور دور سے
گر سال بھر رہے یونہی اس جوش کو قیام
پھر جائیں دن یقیں ہے بہت جلد قوم کے
پا جائیں جلد قوم کے سب زخم التیام
دعوے یہ حبِ قوم کے سب بے دلیل ہیں
جب تک نہ کر کے ہاتھ سے دکھلاؤ کوئی کام

میلہ نہ سمجھو، جلسۂ قومی ہے دوستو
آنا ہے دل لگی کی غرض سے یہاں حرام

سیّد کو دو سہارا کہ غفلت سے قوم کی
اب تک پڑے ہیں کام بہت اس کے ناتمام

سر اپنے دھر لیا ہے اسے ایک فرد نے
ہے یارو چھے کروڑ کے کرنے کا جو کہ کام

انصاف سے بعید ہے ساتھ اس کا چھوڑنا
گھلتا تمھاری فکر میں ہے جو کہ صبح و شام

خواہش ہے جس کی یہ کہ ہو دنیا میں تم عزیز
جو چاہتا ہے یہ کہ رہو تم بہ احترام

عزت تمھاری دیکھ کے بڑھتا ہے جس کا خوں
جو تم کو شاد دیکھ کے ہوتا ہے شاد کام

خدمت میں قوم کی جسے 'کافر' لقب ملا
پشتی میں پایا دین کی 'بے دین' جس نے نام

پر سر سے اس کے قوم کا سودا نہ کم ہوا
سب کچھ سنا پہ کام کا چھوڑا نہ التزام

بڑھتا گیا دم اس کا ہوئی جس قدر لتاڑ
کوڑے تھے حق میں اس کے وہ سب طعنہ وملام

ہے اک چراغِ آخرِ شب ٹمٹما رہا
یہ بجھ گیا تو بزم ہے تاریک پھر تمام

ایسا نمونہ جب کہ ہو آنکھوں کے سامنے
پھر حیف ہے کہ ہو نہ سکے تم سے کوئی کام

کرنا ہے کچھ تو کرلو کہ باقی ہے وقت ابھی
پھر آگے دانت پینے کے دن ہیں، والسلام

8 علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے؟

(سنہ تصنیف: 1898، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: جواہرات حالی)

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے
سہارا غیر کا چھوڑیں یہ ایک اک کو سجھاتا ہے

نہ چھوڑیں دین کا دامن، رہیں دنیا میں عزت سے
سبق سب قوم کے بچوں کو یہ دونوں پڑھاتا ہے

نہیں پاتا کبھی عزت کی خواہش سے کوئی عزت
معزز کس طرح بنتے ہیں؟ گر اس کے بتاتا ہے

خدا نے کر دیا ہے حکمراں جس قوم کو ہم پر
خلوص اور دوستی اس قوم کی دل میں بٹھاتا ہے

رعیت کو برابر حق دیے ہیں جو حکومت نے
طلب سے پہلے ان کا مستحق بننا بتاتا ہے

زمانہ قوم نے غفلت میں جو پہلے گزارا ہے
ڈرانی صورتوں میں بار بار اس کو دکھاتا ہے

یہ باہم مذہبی فرقوں کو ہے شیر و شکر کرتا
یہ روٹھوں کو مناتا ہے، یہ بچھڑوں کو ملاتا ہے

کھلاتا ہے یہ کھانا ایک دسترخوان پر سب کو
نمازیں پنجگانہ ایک مسجد میں پڑھاتا ہے

مسلمانوں کو گڈ سبجکٹ [19] بننا یہ سکھاتا ہے
وفا کا بیج بوتا ہے، تعصب دل سے کھوتا ہے
خدا کی برکتیں ان پر جو اس کالج کے ہیں حامی
نہ چھوڑے گا یہ باقی قوم میں دیکھے گا جو خامی

9 شکریہ حضور نظام

(سنہ تصنیف: 1898، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: جواہرات حالی)

یہ اک میدان تھا سنسان، وحشت جس پہ تھی چھائی
نہ سایہ تھا درختوں کا، نہ یہ پانی کی سرسائی
مکیں ہوتا اگر کوئی تو یاں کوئی مکاں ہوتا
پڑے تھے کچھ کھنڈر، جن پر جمی تھی جابجا کائی
خبر کس کو تھی برپا ہو گا اک دارالعلوم اس جا
زمیں پر جس کو حیرت سے تکے گا چرخِ مینائی
جسے دیکھیں گے اعیان و ملوک آ کر تمنا سے
جہاں آفاق سے سیکھیں گے آ کر علم و دانائی
یہ تھی اُمید کس کو پر خدا نے اپنی قدرت کا
دیا جلوہ دکھا، ہے جس کا اک عالم تماشائی
نہ تھی خود قوم راضی اور مخالف اک زمانہ تھا
گھٹا مایوسیوں کی بانیوں کے دل پہ تھی چھائی
مگر سید کے استقلال نے منوا دیا سب کو
کہ پربت ہو تو ہو جاتا ہے استقلال سے رائی
رعیت نے مدد کی سلطنت نے سرپرستی کی
بہت جلد اپنی نادانی سے آخر قوم پچھتائی
مگر سچ پوچھیے تو قالبِ بے روح تھا کالج
نہ کی ہوتی اگر سرکارِ عالی نے مسیحائی
جب آئی پیش مشکل، جب پڑا کالج پہ وقت آ کر
مدد پر کی مدد، امداد پر امداد فرمائی
رہے گا قوم میں تعلیم کا باقی نشاں جب تک
رہیں گے شکرِ آصف جاہ میں رطب اللساں تب تک

10 شکریہ والیِ رام پور [20]

(سنہ تصنیف: 1900، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: معارف پانی پت)

صاحبو! سمجھو نہ اس جلسے کو ہرگز سرسری
ہیں مرادیں اور امیدیں کوٹ کوٹ اس میں بھری
جب تک اس جھاڑو کی سینکوں کا کوئی بندھن نہ تھا
جہل سے لڑنے کو تھی اک فوج لیکن بے سری
اہلِ ملک و جاہ جو ہیں قوم کی اُمیدگاہ
سب نظر آتے تھے ہمدردی کی تہمت سے بری
دور ہی دور ابرِ دریا دل برستا تھا سدا
قوم کی کھیتی نظر آتی نہ تھی ہوتی ہری

سر میں کچھ سودا تھا جن کے قوم کی تعلیم کا
تھیں فقط دینے کو ان کے پاس اسپیچیں نری

گو فصاحت اور بلاغت ان کی تھی ضرب المثل
گو کہ اسپیچیں تھیں ان کی سربسر جادو بھری

سننے والوں پر مگر چلتا نہ تھا ان کا فسوں
کوئی کافر جانتا تھا ان کو، کوئی نیچری

قوم کی تعلیم کا عقدہ تھا لاینحل ہوا
پیش جاتی تھی نہ کچھ تدبیر کی کاریگری

جان و دل ہز ہائینس حامد علی خاں پر نثار
جو ہوا ہے اک متاعِ کس مخر کا مشتری

آج سے وہ سب مسلمانوں کے سر کا تاج ہے
دے رہی ہے یہ شہادت قوم کی مجلس بھری

جان لی ہے قوم کی اس نے اگر درماندگی
مان لی ہے قوم نے بھی دل سے اس کی سروری

پہلے سر جھکتے تھے در پر اس کے، اب دل جھک گئے
شہریاری ہے وہی جس میں ہو شانِ دلبری

ایسے کچھ خوش خوش نظر آتے ہیں آج افرادِ قوم
مل گئی گویا سلیماں کی انھیں انگشتری

آج کا جلسہ ہے حق میں قوم کے اک نیک فال
موج زن جس دل میں دیکھو ہے اُمیدِ بہتری

اتفاق اور ایسے پیش آ جائیں گر دو چار اب
قوم کی تعلیم کا ہوتا ہے بیڑا پار اب

***

لی ہے کروٹ ایک مدت سے زمانے نے بدل
راس تھا اگلوں کو جو موسم، گیا کب کا نکل

جو تمدن کی عمارت تھے، گئے اسلاف چھوڑ
آ گیا ہے اس کی بنیادوں میں سرتا سر خلل

کام کے ہیں اب نہ دنیا میں ہنر ان کے، نہ فن
اور بکار آمد زمانے میں ہے کس ان کا نہ بل

ہیں نئی رسمیں، نئے آئیں، نئی ہے چال ڈھال
اور نئے علم و ہنر کا ہے جدھر دیکھو عمل

ہے نئی گویا زمیں، ہے آسماں گویا نیا
کینچلی گویا کہ لی ہے زالِ دنیا نے بدل

بڑھ رہے ہیں جو ہوا کا رخ ہیں یاں پہچانتے
مل رہے ہیں اپنی دور اندیشیوں کے ان کو پھل

مٹ رہے ہیں جو ہیں اپنی آن پر مچلے ہوئے
آج گزری خیریت سے تو نہیں خیر ان کی کل

ساتھ انھیں دینا پڑے گا یاں زمانے کا ضرور
ورنہ رہنا ہو گا دنیا میں بحالِ مبتذل

زندگی ہے قوم کی اب منحصر تعلیم پر
ورنہ سن لو قوم کی نزدیک آ پہنچی اجل

سلطنت ہو یا ریاست، قوم ہو یا خانداں
جو نہیں تعلیم پر مائل، وہ سب جائیں سنبھل

جس کو کہتے ہیں زمانہ، ہے وہ شانِ کبریا
اس کے وعدے ہیں اَنمٹ، اس کی وعیدیں ہیں اٹل

جو چلے منزل گہِ دنیا میں چال اس کے خلاف رفتہ رفتہ اس کی چالوں نے دیا ان کو کچل
ہاتھ ملتی ہیں وہ قومیں اپنی نادانی پہ آج ہاتھ سے جن کے گیا، تعلیم کا پہلو نکل
جب یہ حالت ہے تو بتلاؤ کہ کیا کرنا ہے اب ملک میں عزت سے جینا ہے کہ بس مرنا ہے اب

***

یاد ہے اے رام پور اپنا تجھے عہدِ کہن جب کہ تھا ایک اک جواں یاں رشک گیو و تہمتن
خاک سے سانونت اگتے تھے تری اور سورما تیری یہ بانسی نہ تھی گویا کہ تھا شیروں کا بن
معرکوں سے ان کے رنگیں ہیں ورق تاریخ کے شاد سے جن کو بھلا سکتا نہیں طولِ زمن
پر وہ اب دم خم رہا تجھ میں، نہ وہ کس بل رہا کر دیے گردش نے دوراں کی نشے سارے ہرن
ملک سے رخصت ہوئے دن جنگ اور پیکار کے لے لیا فتنوں سے ہجرت کا زمانے نے بچن
شیر بکری آج کل پیتے ہیں پانی ایک گھاٹ چین سے ہیں پاؤں سب پھیلا کے سوتے مرد و زن
عام ہے اس عہدِ فرّخ فال میں امن و اماں شرق سے تا غرب اور اُتّر سے لے کر تا دکن
پر دلیروں کے لیے میدان خالی ہیں بہت گر سلف کا ان کے دل گردوں میں کچھ باقی ہے کن
اک قوی دشمن کا ہے درپیش ان کو سامنا جس کی روندن میں ہزاروں ہو گئے ویراں چمن
روک دی دریا کی رو حملے سے جو اس کے بچا کر دیا پربت کو رائی جس نے جیتا اس سے رن
نام ہے اس کا تعصب اور جہالت ہے لقب کج روی کا ہے وہ رہبر، راستی کا راہ زن
یہ وہ دشمن ہے کہ غالب آ گیا جس قوم پر ہو گئی وہ قوم آنکھوں دیکھتے زیر و زبر

***

سہل مت سمجھو تعصب کو بری ہے یہ بلا کر دیا ہے اس نے قوموں اور گھرانوں کو فنا
حکم ہے اس کا کہ فاقہ ہے تو فاقے میں مرو اور جو ذلت ہے تو ذلت پر رہو قانع سدا
حکم ہے اس کا کہ کوئی قوم جس حالت میں ہے بس وہی ہے اس کی عزت اور شرف کی انتہا
باپ دادا جو گئے ہیں چھوڑ یاں رسم و رواج ناخلف ہے ایک انچ اس سے اگر آگے بڑھا
آدم و حوا نے گر پتوں سے ڈھانکا تھا بدن نسل میں ان کی وہی پوشش رہے جاری سدا
نوح کی کشتی میں تختے تھے اگر ان گھڑ لگے ہوں جہاز اب بھی اسی کینڈے کے بے چون و چرا

آدمی کا گھر ہو ایسا ہی پرانی چال کا
لومڑی کا جیسے بھٹ ہے اور بئے کا گھونسلا
ایک کا نام آدمی ہو، ایک کا ہو جانور
آدمی اور جانور میں ہو نہ فرق اس کے سوا
باپ دادا کے لیے بیٹھے ہو کیا رسم و رواج
وہ گئے اور دم کے ساتھ ان کا دمامہ بھی گیا
دیکھو تم گرتے چلے جاتے ہو پستی کی طرف
آگے آتا ہے گڑھا، بعد اس کے ہے تحت الثریٰ
گر کرو زیر ایسے دشمن کو تو ہے مردانگی
جو ابھرنے کی نہیں دیتا تمھیں پروانگی

11 گدایانِ قوم[21]

(سنہ تصنیف: 1901، ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

جن کو ہے حب الوطنی کا خیال
بحث میں لاتے ہیں یہ اکثر سوال
مانگتے پھرتے ہیں جو اکثر گدا
دینا ہے کچھ ان کو بھلا یا برا؟
فرقہ ہے 'کنسرویٹو'[22] ان میں جو ایک
کہتا ہے دینا ہے بہرحال نیک
مانگنے کی گو کہ ہے عادت بری
اس سے بھی ہے بخل کی خصلت بری
رد نہ سوالِ فقرا کیجیے
جان بھی مانگیں تو فدا کیجیے
داد و دہش کے ہیں نتائج بڑے
اہلِ سخا کے ہیں مدارج بڑے
خیر کے کام آج جنھوں نے کیے
کوثر و جنت ہے کل ان کے لیے
ان کے لیے وقف ہے دارالسلام
ان کا ہے فردوس میں اعلیٰ مقام
پر 'لبرل'[23] کی ہے خلاف ان کے رائے
جس میں بہ ظاہر نہیں حجت کی جائے
کہتے ہیں وہ، دیتے ہیں سائل کو جو
دونوں جہاں سے اسے دیتے ہیں کھو
رہتا ہے دنیا کا، نہ وہ دین کا
شرع کا پابند، نہ آئین کا
اس کو نہ غیرت، نہ حمیّت ہے کچھ
اور نہ ڈھٹائی سے ندامت ہے کچھ
قوتیں جو اس کو ہوئی تھیں عطا
سب کو دیا خاک میں اس نے ملا
جانتا ہے مانگنے کو ہے زباں
'دعوت' کی صدا سننے کی خاطر ہیں کاں
سونگھنے کو ناک ہے بوے طعام
دیکھنے کو آنکھ ہے خوانِ کرام

پاؤں ہیں پھرنے کے لیے در بدر جوڑنے کو ہاتھ ہیں پیشِ بشر
دیتے ہیں جو بھیک انھیں صبح و شام وہ کوئی نیکی کا نہیں کرتے کام
جو کہ سوال ان کا نہیں کرتے رد ملک میں پھیلاتے ہیں اخلاقِ بد
مانگنا خود ان کو سکھاتے ہیں وہ حوصلہ دے دے کے بڑھاتے ہیں وہ
بعضوں کو اس بات میں یاں تک ہے کد روکیے قانون سے یہ رسمِ بد
کیجیے سرکار سے فریاد و داد تا کہ کرے مانگنے کا انسداد
ایسا وہ قانون بنائے کوئی بھیک نہ پھر مانگنے پائے کوئی
ہے لبرل کی یہی کوشش اگر لائے گی آخر کو یہ کوشش ثمر
ایک دن ایسا بھی ضرور آئے گا مانگنا اک جرم ٹھہر جائے گا
مانگتے پھرتے ہیں جو اب در بدر آئے گی پرچھائیں نہ ان کی نظر
ہے مگر اک فرقہ سوا ان کے اور مانگنے کے جن کے نرالے ہیں طور
جتنے بھکاری کہ ہیں نزدیک و دور کان پکڑتے ہیں سب ان کے حضور
چور رہیں ان سے اچھوتے، نہ شاہ مانگتا ہے ان سے زمانہ پناہ
مل کے صدا سارے لگاتے ہیں جب انگلیاں دے لیتے ہیں کانوں میں سب
وضع اگر دیکھیے تو سربسر آتے ہیں خاصے بھلے مانس نظر
شکلیں ثقہ، داڑھیاں اکثر سفید باتیں مؤثر کہ کریں دل میں چھید
ہے کوئی شمس العلماء، کوئی سر خان بہادر ہے، کوئی ڈاکٹر
ملک کا مشہور ہے محسن کوئی کوئی مسن ہے تو ہے کم سن کوئی
ہے کوئی شاعر تو ہے کوئی حکیم رکھتا ہے دیکھو جسے شانِ عظیم
جن کے یہ درجے ہیں، یہ رتبے، یہ شان جوگیوں کے کترے انھوں نے ہیں کان
در پہ الکھ آ کے جگاتے ہیں جب سن کے گھروں سے نکل آتے ہیں سب
مانگنے پر پھر جو اُترتے ہیں شیر ہوتے ہیں لاکھوں نہ ہزاروں سے سیر
ایسوں کو بتلاؤ بھلا دیجے کیا؟ دیجے تو پھر اس کے عوض لیجے کیا؟

دیتے ہیں مسکین کو خیرات جب
دیتے ہیں اُمید پہ عقبیٰ کی سب

ایک اگر دیتا ہے انسان یاں
رکھتا ہے ہفتاد کی اُمید واں

پر یہ دلاتے نہیں کوئی اُمید
دیتے بشارت ہیں، نہ کوئی نوید

وعدۂ عقبیٰ نہیں کرتے کبھی
خلد کی حامی نہیں بھرتے کبھی

کہتے ہیں یہ صاف بہ صد شد و مد
ہے وہ بیع جس میں ہو داد وستد

کہتے ہیں دینے سے رکھو کام تم
لینے کا زنہار نہ لو نام تم

داد و دہش ورنہ اکارت ہے یہ
یہ نہیں خیرات، تجارت ہے یہ

ہیں یہ دلیلیں مگر ان کی فضول
نیچریوں کے سے ہیں سارے اصول

ہم انھیں معقول نہیں جانتے
ایسی دلیلوں کو نہیں مانتے

پر نہیں اک بات کا ان کی جواب
سن کے جسے زہرہ ہو پتھر کا آب

کہتے ہیں انسان اٹھاتا ہے جو
اپنے حوائج میں زر و سیم کو

اس کی ہو عقبیٰ میں اگر کچھ جزا
قوم کی امداد کا بھی ہو صلہ

کھانے کی ہے جیسے ضرورت اسے
پانی کی جس طرح ہے حاجت اسے

چاہیے جس طرح کہ رہنے کو گھر
زادِ سفر چاہیے بہرِ سفر

چاہیے نفقہ پئے فرزند و زن
چاہیے آرام پئے جان و تن

فرض اسی طرح ہے امدادِ قوم
یاد خدا پہلے ہے، پھر یادِ قوم

کہتے ہیں دنیا سے ہے جب تک لگاؤ
دل میں بشر کے ہے اُمنگ اور چاؤ

بھاگتے جب تک کہ ہیں ذلت سے سب
رہنا ہیں یاں چاہتے عزت سے سب

جب تلک انساں میں ہے غیرت کی شان
پُتلے میں اس خاک کے باقی ہے آن

قوم کی طاقت کا بڑھانا ہے فرض
قوم کا قرضہ یہ چکانا ہے فرض

فرض یہ محسوس ہوا ہے جنھیں
کل نہیں اس فرض سے دم بھر انھیں

قوم کی رفعت کے ہیں طالب سدا
ہو سکے تو اس کو اُدھر لیں اٹھا

جانتے ہیں اپنی یہی برتری
قوم کی کوئی نہ کرے ہم سری

اپنی سمجھتے ہیں بڑائی یہی ۔۔۔ قوم ہو آفاق میں ان کی بڑی
قوم شریک ان کی کمائی میں ہے ۔۔۔ قوم کی جیت ان کی بھلائی میں ہے
ان کی ہر اک راہ میں ساتھی ہے قوم ۔۔۔ جان میں اور مال میں ساجھی ہے قوم
رکھتے ہیں سب پیر ہوں یا ہوں جواں ۔۔۔ قوم کی ایک ایک ضرورت کا دھیاں
تاکہ رہے یاد زمانِ سلف ۔۔۔ مٹنے نہیں دیتے نشانِ سلف
مردہ زبانوں کو جلاتے ہیں وہ ۔۔۔ خفتہ طبابت کو جگاتے ہیں وہ
ہم کہ زبانیں ہیں ہماری تمام ۔۔۔ زندہ، جنھیں بولتے ہیں خاص و عام
پر ہمیں پروا نہیں ان کی ذرا ۔۔۔ دے کوئی دنیا سے گر ان کو مٹا
زندہ طبابت ہے ہماری ابھی ۔۔۔ فیض کا چشمہ ہے یہ جاری ابھی
ہند میں اسلام کی ہے یادگار ۔۔۔ اس کا ہے پبلک میں وہی اعتبار
ملک میں ہے اس کی ضرورت بہت ۔۔۔ قوم کو ہے اس سے عقیدت بہت
جانتے ہیں اس کو پسندیدہ سب ۔۔۔ اس کے علاجوں کے ہیں گرویدہ سب
یہ بھی ہے معلوم کہ دنیا میں آج ۔۔۔ سب سے سوا ہم میں ہے اس کا رواج
اس کے مصنف ہیں مسلماں تمام ۔۔۔ غیر کا تم ان میں نہ پاؤ گے نام
اس نے جنم خواہ کہیں ہو لیا ۔۔۔ پرورش اسلام نے اس کو کیا
عہد سے عباسیوں کے آج تک ۔۔۔ فن یہ ہمارا تھا نہیں اس میں شک
پر نظر آتی نہیں اب اس کی خیر ۔۔۔ روز بروز اس کا ہے اب حال غیر
جاتا ہمارے ہی نہیں ہاتھ سے ۔۔۔ ڈر ہے کہ دنیا سے نہ وہ چل بسے
حاذق الملک[24] اس کا مربی تھا جو ۔۔۔ کنجِ لحد میں وہ رہا جا کے سو
اب نہ رہا اس کا سہارا کوئی ۔۔۔ اس کے چمن کا چمن آرا کوئی
چاہیے اب قوم سنبھالے اسے ۔۔۔ نزع کی حالت سے نکالے اسے
طب کو گر اپنی نہ سنبھالیں گے ہم ۔۔۔ اک بڑی دولت کو گنوا دیں گے ہم

12 تحفۃ الاخوان[25]

(سنہ تصنیف: 1902، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: کلیات حالی جلد دوم، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل)

دوستو! انکار اگر تم کو بداہت کا نہیں   عالم اسباب ہے دنیا، اسے جانو یقیں
کاہ سے لے کوہ تک، ذرے سے لے تا آفتاب   سب کو ہے جکڑے ہوئے اسباب کی حبل المتیں
اک مرتّب سلسلہ پاؤ گے تم اسباب کا   دشت میں پتّا کھڑکتا تم اگر دیکھو کہیں
یوں خدا چاہے تو لے اسباب کی تاثیر چھین   لیکن اس قیومِ بے ہمتا کی یہ عادت نہیں
بھاپ اٹھے گی سمندر سے تو امڈے گی گھٹا   آسماں برسے گا جب، اگلے گی دولت تب زمیں
ہے یہی قانون محکم مالکِ مختار کا   جو کہ سطحِ خاک سے نافذ ہے تا چرخِ بریں
وہ یہی قانون ہے جس سے لگا لیتے ہیں کھوج   وقت سے پہلے ہر اک انجام کا انجام بیں
جان لیتے ہیں کہ جس گھر کی ہے پانی پر بنا   کوئی دن میں وہ رہے گا ہو کے پیوندِ زمیں
بس کہ ہے ان کو قوانینِ الٰہی پر وثوق   اس لیے رکھتے ہیں اپنی پیش گوئی پر یقیں
دیکھتے ہیں روشنی وہ دن کی جب جاتی ہوئی   ان کو آنکھوں سے نظر آتی ہے رات آتی ہوئی

***

جب کہ قانونِ الٰہی کا یہ ٹھہرا مقتضا   وہ رہے گا ہو کے جو ہے مقتضا اسباب کا
دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس قوم کا ہوتا ہے حال   شاہراہِ عام سے ہے جس کی پگڈنڈی جدا
ساری قومیں دے رہی ہیں وقت کا ساتھ آج کل   اور ان کی چڑ ہے وہ جو وقت کا ہے مقتضا
ہیں رواں تیراک سب دریا کی رو کے ساتھ ساتھ   اور انھیں کد ہے کہ دیں دریا کی رو الٹی بہا
اور اپنے اپنے جوہر ہیں جہاں دکھلا رہے   یہ دکھاتے پھرتے ہیں جوہر سلف کے جا بہ جا
اور قومیں ہیں جہاں مالِ تجارت بیچتی   یہ وہاں گھر بار کے کرتے ہیں کوڑے برملا
جتنے ہیں اوروں میں کھاؤ، اتنے ہی واں ہیں کماؤ   یاں کماؤ ایک ہے تو کھانے والا قافلا
اور مفلس ہوں تو روزی کو پھریں کرتے تلاش   یہ جو مفلس ہوں تو قسمت کا پھریں کرتے گلا
اور ہیں سب سود لینے میں، یہ دینے میں دلیر   اور ہیں سب لوٹنے پر، یہ لٹانے پر فدا

جب کوئی اوروں میں ہو جاتا ہے دولت سے نہال — اپنی نسلوں میں وہ جڑ دولت کی جاتا ہے جما
اور تنگی سے گزارا کرتے ہیں آج اس لیے — تا کہ غیروں کی نہ کل کرنی پڑے کچھ التجا
یاں گیا بلی کے بھاگوں ٹوٹ اگر چھینکا کہیں — پڑ گئی پشتوں تلک واں فاقہ مستوں کی بنا
زندگی جس قوم کی دنیا میں گزرے اس طرح — وہ رہے گی قوم دنیا میں بتاؤ کس طرح

***

نیند غفلت کی ہے سر تاپا مسلط قوم پر — سب کی آنکھیں ہیں کھلی، سوتے ہیں لیکن بے خبر
مصر کی ممیاں ہیں سب گویا نہیں جن میں حیات — گو کہ جیتے جاگتے آتے ہیں ظاہر میں نظر
خاندانوں کو رہا ہے میٹ دورِ روزگار — آج بگڑا یہ گھرانا اور کل اُجڑا وہ گھر
پر نگاہِ بد کی جو زد میں نہیں آئے ابھی — جانتے ہیں دورِ گردوں کا نہیں ہم تک گزر
بھیڑیا نوبت بہ نوبت گوسفندوں کو شکار — کر رہا ہے اور نہیں کچھ گوسفندوں کو خبر
ہم جو بنتے ہیں بھی تو اکثر بگڑنے کے لیے — گرتے ہیں بانسوں، اچھلتے ہیں اگر بالشت بھر
قوم کو اپنے تنزل سے ابھرنے کی اُمید — اہلِ علم و اہلِ دولت سے بہت کچھ تھی مگر
اہلِ دولت کا ہے اس عالم سے اک عالم جدا — عالمِ بالا سے بھی ہے جو کئی منزل ادھر
جن دعاؤں کی پہنچ ہے عالمِ بالا تلک — ان دعاؤں کا نہیں ڈیوڑھی تلک ان کی گزر
اب رہے عالم تو ہو دنیا کی فکر ان کو کہاں — دین کا پھر کون ہے دنیا میں وہ الجھیں اگر
کون جا کر چین میں پھر دین کی دعوت کرے — کون گم راہوں کی لے جاپان میں جا کر خبر
حجتِ حق کون لندن میں کرے جا کر تمام — کون برلن میں کرے تبلیغِ قرآن و خبر
کون ہے ان کے سوا اسلام کے فرقوں کو جو — مل کے آپس میں نہ ہونے دے کبھی شیر و شکر
ان کی غفلت کا یہ عالم، ان کی فرصت کا یہ حال — ہو یہ بیڑا کیوں نہ پھر منجدھار میں زیر و زبر
ہیں یہی گر قوم کے ساتھ آج بے پروائیاں — تو یہ سن لو غافلو کل ہیں کھڑی رسوائیاں

***

پڑ رہی ہے چار سُو دوڑو بڑھو کی یاں پکار — نیند کے ماتو! نہیں اب وقتِ غفلت، ہوشیار!
ہو رہی ہے عرصہ آفاق میں قوموں کی دوڑ — بڑھ رہے پیادوں سے پیادے ہیں سواروں سے سوار

تھوڑی تھوڑی غفلتوں پر ہو رہی ہیں بازیاں
چال چوکا اور ہوئی گردن پہ ہار آ کر سوار

پولو اور گھڑ دوڑ کی سمجھو نہ ہار اس ہار کو
جو یہاں ہارا، ہوئی ذلت گلے کا اس کے ہار

قوم جو اس دوڑ میں ہاری، اسے سمجھو کہ وہ
ہو گئی زور آزمائی کا حریفوں کی شکار

سایے میں برگد کے جیسے جل کے رہ جاتی ہے گھاس
زور مندوں میں یونہی ہوتی ہے مٹی اس کی خوار

حق ہے غالب کا کہ کچلے اور دلے مغلوب کو
ہے یہی مغلوب ہونے کا مآل انجامِ کار

کرتے آئے ہیں سب اپنی اپنی باری میں یہی
اور یہی جاری رہے گا دور تا روزِ شمار

قوم کا درجے سے گر جانا ہے اپنے وہ گناہ
مرتکب جس کا نہیں بچتا سزا سے زینہار

یاد رکھو دوستو! سنت ہے یہ اللہ کی
جو نہ بدلی ہے نہ بدلے گی الیٰ یوم القرار

جو بڑھے گا، حوصلہ اس کا بڑھایا جائے گا
جو گرے گا، اپنے درجے سے گرایا جائے گا

***

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یار سب کھولے کمر
جو مہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر

قوم میں تعلیم پھیلانا تھی سو پھیلا چکے
ہو گیا، وہ بیج جو بویا تھا، نخلِ بارور

پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اسی منزل میں ہیں
باندھ کر اٹھے تھے جس منزل سے احرامِ سفر

روشنی تعلیم کی کچھ کچھ جو یاں پاتے ہو تم
سب یہ جگنو کے سے چمکارے ہیں اے اہلِ نظر

ہے جہالت کا اندھیرا ہم پہ جو چھایا ہوا
اس اندھیرے میں ہی آتے ہیں یہ سب جلوے نظر

سارے ہو جاتے ہیں چمکارے ابھی کافور یہ
اس اندھیرے سے ذرا نکلو اُجالے میں اگر

ہم نے یہ مانا کہ ہم جو تھے زمیں پکڑے ہوئے
اس سے آگے کچھ قدم ہم نے بڑھایا ہے مگر

دیکھنا ہی ہے کہ اوروں سے ہے کیا نسبت ہمیں
اور بڑھتے ہیں گزوں، بڑھتے ہیں ہم گر انچ بھر

جبکہ ٹھہری ہم میں اور اوروں میں یہ نسبت تو ہم
اتنے ہی یاں گھٹ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں جس قدر

پس ہے ہمسر سے جو اپنے، یہ سمجھا دو اسے
خاک ہے وہ گو کہ ہے پہنچا ہوا افلاک پر

اپنی پستی کے نشاں پاتے ہیں ہر منزل میں ہم
کیا تجارت، کیا صناعت اور کیا علم و ہنر

کھل رہے ہیں جو کلوں کے کارخانے ملک میں
جن کے مالک ہیں وطن کے اہلِ ہمت سر بسر

جو کہ ہیں ملکی ترقی کے لیے اک فالِ نیک
جن میں امیدیں ہیں مثلِ روزِ روشن جلوہ گر

قوم کا حصہ نہ واں پاؤ گے تم اس کے سوا
دن چھپے قلیوں کی اک فوج آئے گی تم کو نظر

کون سا پستی کا درجہ اب رہا ہے اس کے بعد
یہ وہ پستی ہے کہ بس تحت الثریٰ ہے اس کے بعد

***

ہم نے مانا ہے موافق جن سے دورِ ماہ و سال
بھاگوان ایسے بھی ہیں اس قوم میں پر خال خال

چند جانیں بچ رہی تھیں جو کہ قومِ نوح میں
ساٹھ ملیَن میں ہے وہ ان بھاگوانوں کی مثال

ان کی کیا عزت ہے یارو قوم ہے جن کی ذلیل
ان کو کیا راحت ہے جن کی قوم ہے سب خستہ حال

ہے وہ ایسا غول میں قلیوں کے جیسے ایک میٹ
ہے ہزاروں مفلسوں میں اک اگر آسودہ حال

شال گدڑی سے ہے واں سو مرتبہ بدتر، جہاں
ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کندھے پہ شال

یاد رکھو ہے بہت دامن فراخ اسلام کا
دی ہے بنیادِ اخوت اس نے کل امت میں ڈال

ہیں اسی امت میں جو ڈھوتے ہیں دن بھر ٹوکری
ہیں اسی امت میں جو ہیں دھونکتے دن رات کھال

ہیں انہی میں جن کے سپنے میں نہیں آیا سماں
جب سے آنکھ ان کی کھلی دیکھا ہے گھر میں اپنے کال

ہیں انہی میں جو کہ بہرِ نفقۂ فرزند و زن
سامنے اک اک کے پھیلاتے ہیں وہ دستِ سوال

ان عزیزوں کی اخوت سے جنھیں آتا ہو ننگ
نام لیں فہرست سے اسلام کی اپنا نکال

ورنہ ذلت سے نکالیں ان کو اور یہ جان لیں
ان کی ذلت میں انھیں عزت سے رہنا ہے محال

گھر میں اپنے بیٹھ کر جو چاہے سو بن لے کوئی
غیر قوموں میں نہیں حاصل اسے جز انفعال

کہتے ہیں غیر اس کو ہم جنسوں میں اپنے دیکھ کر
''یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال''

وہ یہی خطرہ ہے جس کے ڈر سے مال اور جان سب
کر رہے ہیں اپنی اپنی قوم پر قربان سب

***

وہ گئے دن جب کہ تھے مختارِ مطلق حکمراں
قسمتوں کی، قبضۂ قدرت میں تھی ان کے عناں

ہاتھ میں غسال کے مردہ ہو بے حس جس طرح
تھے جہاں بانوں کے ہاتھوں میں یونہی اہلِ جہاں

تھا رعیت کا کوئی ہمدرد تو تھا بادشاہ
اور مصلح تھا کوئی اس کا تو تھا خود حکمراں

تھی نہ اہلِ ملک کو قومی مقاصد سے غرض
تھا نہ قومیت کا قوموں میں کہیں باقی نشاں

خواہشیں سب کی جدا، اغراض تھیں سب کی الگ
اپنے اپنے راگ تھے اور اپنی اپنی ڈفلیاں

قوم اپنی حد سے آگے کوئی بڑھ سکتی نہ تھی   پیش قدمی سے رکے کب کے کھڑے تھے کارواں
بند تھے ناکے ترقی کے کہ آخر غیب سے   آیا اک سیلابِ آزادی کا ریلا ناگہاں
جس نے سب روکیں ہٹا کر کر دیا میدان صاف   غار یا ٹیلا رہا باقی نہ کوئی درمیاں
ایک قانونِ مُسلّم کی اطاعت کے سوا   ہو گئے ہر قید سے آزاد سب خورد و کلاں
کر دیے انصاف نے ہموار سب پست و بلند   آ گئے سب ایک لیول[26] پر قوی اور ناتواں
اب نہ قوموں کی ترقی میں ہے کوئی سدِّ راہ   اور نہ قوموں کے مدارج میں تفاوت درمیاں
سلطنت نے سب کو دے رکھے ہیں حق ڈنڈی کے تول   وزن میں پلڑا نہیں کوئی سبک، کوئی گراں
جن کو دعویٰ ہے کہ ہم بیٹے بڑے باپوں کے ہیں   ان کو کرنے ہوں گے اب جوہر عدالت کے عیاں
ورنہ لینے ہوں گے واپس اپنے سب دعوے انھیں   اور بھلانی ہوگی سب دل سے بڑوں کی داستاں
وہ گئے دن جب کہ کر دیتے تھے چھوٹوں کو بڑا   انقلاباتِ جہاں یا اتفاقاتِ زماں
اب بڑائی کا ہے استحقاق پر سارا مدار   ہو گا جو 'کرّار' اس کو مرحمت ہو گا نشاں
قسمتوں کی آزمائش کا زمانہ ہو چکا   ہے بس اب یاں ہمتوں اور غیرتوں کا امتحاں
ہے تمھاری اب تمھارے ہاتھ موت اور زندگی   ہو تمھی اپنے مسیحا اور تمھی ہو جاں ستاں
یا کرو کوشش کہ مردہ قوم میں پڑ جائے جاں   اور دکھا دو خلق کو اس راکھ سے اُٹھتا دھواں
یا رہو دنیا میں بھنگوں اور پسّوؤں کی طرح   جن کا ہے دنیا میں ہونا اور نہ ہونا ایک ساں
قوم گنتی میں ہو گو مور و ملخ سے بھی سوا   مر گئے جب قوم کے دل قوم میں پھر کیا رہا

13 فلسفۂ ترقی[27]

(سنہ تصنیف: 1903، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: جواہرات حالی)

اے عزیزو! تم بھی ہو آخر بنی نوعِ بشر   غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمھیں بھی ہے خبر
کر رہا ہے خاک کا پُتلا وہ جوہر آشکار   ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر
رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا وہاں   طائرِ وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر
اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخّر کر لیا   ابر و برق و باد سے تا بحر و برّ و دشت و در

حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا   دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر
تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز   ہو گئے تقویمِ پارینہ وہ سب علم و ہنر
کل کی تحقیقات نظروں سے اُتر جاتی ہے آج   بڑھ رہا ہے دم بہ دم یوں آج کل علمِ بشر
قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور   شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر
ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب   کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ در بدر
کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب   عرصہ آفاق میں ہو گی قیامت جلوہ گر
دوستو! شاید وہ نازک وقت آ پہنچا قریب   آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی   اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دست کاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی   علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی   غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

***

ہند میں بھی یارو آ پہنچا ہے اس رو کا قدم   جو ہیں ناقابل اب ان کا کھلنے والا ہے بھرم
ہے ترقی، پر تنزل بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ   یہ کسی کے حق میں امرت ہے کسی کے حق میں سم
پست کو بالا یہ کر دیتی ہے اور بالا کو پست   کر دیا زیر و زبر اس نے جہاں رکھا قدم
گل کھلایا اس نے جو اقصائے مشرق میں ابھی   اس کے لکھتے وقت ہاتھوں میں لرزتے ہیں قلم
چین جو وسعت میں کم اک براعظم سے نہ تھا   اک جزیرے کی لپیٹ[28] نے کر دیا اس کو بھسم
دیکھنا پیچھے نہ ہم چشموں سے رہ جانا کہیں   حق میں ہمسائے کے ہمسائے کا بڑھنا ہے ستم
جانتے ہو اے عزیزو ہے تنزل چیز کیا؟   اس پہ کر لینا قناعت مل گیا جو بیش و کم
گو کہ ہے افراد کے حق میں یہ خصلت کیمیا   حق میں لیکن قوم کے یارو یہی خصلت ہے سم
تن پہ تھا فاروقِ اعظمؓ کے پھٹا کرتا، مگر   قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملکِ جم
جیتے ہیں دنیا میں وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح   جن کو بڑھنے کی تمنا اور نہ کچھ گھٹنے کا غم
جس طرح موری کا کیڑا خوش ہے اپنے حال میں   گزرے جو حالت، اسی میں بس مگن رہتے ہیں ہم
پر زمانہ کہہ رہا ہے یہ بہ آوازِ بلند   ''یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہِ عدم''

بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آج کل وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

***

ہو نہ ہمدردی کا عنصر قوم میں یارو جہاں واں ترقی کے لیے سب کوششیں ہیں رائگاں
راس بیڑے کو ترقی کے نہیں کوئی ہوا جوشِ ہمدردی سے ہوتا ہے جہاز اس کا رواں
قوم تھی یونان کی دنیا میں اک محدود قوم ہو گئی حبِ وطن سے فخرِ اقوامِ جہاں
ایک کو کچھ ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں
قوم کس گنتی میں ہے وہ، دل نہ ہوں جس کے ملے گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیر لے سارا جہاں
ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا ہے وہ اک مقتل، لہو روتا ہے جس پر آسماں
یاد رکھو پڑ گئی جس ملک یا ملت میں پھوٹ ہیں وہ اس مہماں سرا میں کوئی دن کے میہماں
غزنوی، غوری، مغل، سادات، لودی اور غلام رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمراں
دن برے جب آئے اور باہم لگے سر پھوڑنے صفحۂ ہستی سے ان کا مٹ گیا نام و نشاں
دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام ہے مسلمانو! یہ ارشادِ رسولؐ انس و جاں[29]
ہیں نمازیں اور روزے اور حج بے کار سب سوزِ امت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں
جس کا تم بھرتے ہو کلمہ، جس پہ پڑھتے ہو درود نام پر جس کے عزیزو! تم فدا کرتے ہو جاں
جیتے جی اُمت کی لو دل کو رہی اس کے لگی وقتِ آخر اُمت اُمت اس کے تھا وردِ زباں
بھائی بھائی ہو گئے ہو دین کی برکت سے تم ہے غضب گر بھائیوں پر ہوں نہ بھائی مہرباں
کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کہتی ہے کیا "کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتحاں"[30]
دین کا دعویٰ اور اُمت کی خبر لیتے نہیں چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں

***

ان سے کہہ دو، ہے مسلمانی کا جن کو ادّعا قوم کی خدمت میں ہے پوشیدہ بھید اسلام کا
وہ یہی خدمت، یہی منصب ہے جس کے واسطے آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیا
قوم کی خدمت میں کر دیں اپنی جب عمریں تمام تب فرائض سے نبوت کے ہوئے عہدہ برآ
وہ رسولِ ہاشمی وہ رحمۃ للعالمین e پیروی کا جس کی دم بھرتے ہو تم صبح و مسا
جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اس کا سلوک؟ اس طرف سے تھی جفا اور اس طرف سے تھی دعا

کون سی تکلیف تھی جو قوم نے اس کو نہ دی
پر کبھی چاہا نہ اس نے قوم کا اپنی برا

جب اُحد میں ہو گیا دندانِ پاک اس کا شہید
قوم کے حق میں نہ نکلا منہ سے کچھ اس کے سوا

''کر ہدایت قوم کو یا رب کہ ہیں معذور یہ
ان کی عقلوں پر ہے پردہ جہل و غفلت کا پڑا''[31]

قوم کے حملے رہے جب تک کہ اس کی ذات پر
خندہ پیشانی سے سب ان کے سہے جور و جفا

پر لگی جب قوم سب مل کر مٹانے نامِ حق
اور خدا کا پوجنا بندوں کو مشکل ہو گیا

غیرتِ حق نے نہ دی پھر مہلت صبر و شکیب
دین کی آخر حمایت پر کھڑا ہونا پڑا

لشکرِ حق سے مگر جب ہو گئی مغلوب قوم
پھر وہی شفقت، وہی رحمت، وہی احسان تھا

تھی یہی وہ قوم، جس کے حق میں فرماتے تھے آپ
''ہے عرب کی دوستی جز دین اور ایمان کا''[32]

تھی یہی وہ قوم، تھا جس کے لیے ارشاد یہ
''قوم کا خادم ہے آقا سب کا، بے چون و چرا''[33]

قوم کے خادم رہے اور دوست جب تک اہلِ دیں
دین اور دنیا میں بول اسلام کا بالا رہا

پر دیے خودغرضیوں نے جبکہ دل اک اک کے پھاڑ
حکم جو مالک کا تھا بندوں کو وہ پورا ہوا

حکم تھا اس کا کہ جھگڑوں سے رہو تم برکنار
ورنہ کھو بیٹھو گے سب اپنا وقار اور اعتبار

***

سچ کسی دانا نے تھا یہ قوم سے اپنی کہا
''جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا''

دیکھ لو ممتاز دنیا میں وہی قومیں ہیں آج
قوم پر قربان ہے جن کا، ہر اک چھوٹا بڑا

یاں تلک پھیلا ہے اب قوموں میں قومیت کا درد
اپنے ایک اک فرد پر قوموں کی جانیں ہیں فدا

ملک سارا چھین کر بھی ان کو چین آتا نہیں
اپنے اک مقتول کا جب مانگتے ہیں خوں بہا

اختلافِ دین و مذہب گھل رہا تھا جس میں زہر
جس نے ملکوں میں دیے تھے خون کے دریا بہا

دم بہ دم وہ اختلاف اب بن رہا ہے اتفاق
زہر میں ہونے کو ہے پیدا اثر تریاق کا

کر رہا ہے جوشِ ہمدردی کی صورت میں ظہور
وہ تعصب جس نے باپوں سے کیے بیٹے جدا

دیتے ہیں وہ اپنے ذاتی فائدوں پر خاک ڈال
اپنے جب نقصان میں وہ قوم کا ان کی بھلا

وہ ہملٹن کی جواں مردی سنی ہو گی کہ جب
ہو گئی فرخ سیر کو ہاتھ سے اس کے شفا

قوم پر قربان کر دیں اپنی اُمیدیں تمام
آپ کچھ لینا نہ چاہا اپنی خدمت کا صلا

ہے اسی حبِ وطن کا اس کے یہ سارا ظہور
ہند پر ہے آج جو برطانیہ فرماں روا

ایک ماما جس کو دس ملتے ہیں ہفتے میں شلنگ
جس کے کنبے کا سب اس تنخواہ پر ہے آسرا

جاکے دے آتی ہے خوش خوش ایک ہفتے کی طلب
قوم کی خاطر کہیں سنتی ہے جب چندہ کھلا

ہے غرض چندے کی کیا، اس سے نہیں کچھ اس کو کام
قوم کا نام آیا اور قابو سے باہر دل ہوا

حق کو ہوتا ہے جنھیں دنیا میں کرنا سر بلند
خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

ان کے مفلس، قوم کی خاطر وہ کر جاتے ہیں کام
پست قوموں میں نہیں کر سکتے جو کام اغنیا

ہے انھی ہمدردیوں کا ان کی یہ ثمرہ کہ آج
اس کرہ کے گرد ہیں چھائی ہوئی مثلِ ہوا

لوہا مقناطیس کی جانب ہے کھنچتا جس طرح
اس طرف کھنچتی چلی جاتی ہے دنیا اس طرح

***

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں
خود تنزل میں ہے سرچشمہ ترقی کا نہاں

ایک کا ہے جو تنزل، دوسرے کا ہے عروج
اس کا بکتا ہے مکاں، تب اس کی چلتی ہے دکاں

کوئی یاں بنتا نہیں، جب تک نہ بگڑے دوسرا
گھاس کھد جاتی ہے جب، پڑتی ہے تب کھیتی میں جاں

ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اُڑنے لگی
تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرتِ باغِ جناں

چہچہے مرغِ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب
کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوش جاں

جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب
جب سنو یارو، بگڑتا کوئی گھر یا خانداں

آسماں سے بن کے خوان آتا نہیں اقبال کا
ہے وہی اک چیز کل مہماں یہاں تھی آج واں

میزباں کی دیکھتی ہے آنکھ جب بدلی ہوئی
واں سے اُٹھ کر دوسرا جا ڈھونڈتی ہے میزباں

جانے والا ہے مقرر ان کا گھر غیروں کے پاس
جو کمر باندھے ہوئے بیٹھے ہیں گھر کھونے پہ یاں

قصر و ایواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو!
عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانماں

یاد رکھو، ہوں گے اب حق داران کے جانشیں
ہاتھ سے حق کھو دیے اپنے جنھوں نے رائگاں

ہوں گے مزدور اور کمیرے ان کے اب قائم مقام
پھرتے ہیں بے کار جن کے کودک و پیر و جواں

اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو!
تم کو رخصت ہے لٹاؤ وقت و دولت رائگاں

دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا، کرو اپنے پہ ناز
ہیں تمھارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں

مت کرو شکوہ مشیت کا، خدا ظالم نہیں — بلکہ ظالم ہیں تمھاری اپنی بداعمالیاں
ہے یہ قانونِ الٰہی، جو کبھی ٹلتا نہیں — گو جگہ سے اپنی ٹل جائے زمین و آسماں
چھٹتی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائیں گی — ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی، جھڑتی جائیں گی

14 انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور اور اس کے کام[34]

(سنہ تصنیف: 1904، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: جواہرات حالی)

1

دے خدا برکت جماعت میں تری اے انجمن! — کر دیا تو نے نیا اسلام کا عہدِ کہن
جس طرح اسلام کی بنیاد غربت میں پڑی — تو نے بھی غربت میں جھیلے مدتوں رنج و محن
جیسے گزرے سخت پہلے چند سال اسلام کے — تیرے یاور بھی یونہی تھے ابتدا میں چند تن
بدگماں اسلام سے جیسے رہے اول قریش — تیری نسبت بھی بہت کچھ تھے دلوں میں سُوءِ ظن
سلطنت پر یا رئیسوں پر نہ تھا تکیہ تجھے — جز خدا کوئی نہ تھا سر پر ترے سایہ فگن
تیری کوشش کی تھی بارانی زراعت کی مثال — ہو جسے ہر دم لگی تائید غیبی کی لگن
باغبانوں کے پسینے کے سوا رکھتا نہ تھا — آبیاری کا کہیں سے آسرا تیرا چمن
پر رہا دل تیرا ایسا اپنی ہمت سے قوی — گویا لشکر تھا خدا کا تیرے ساتھ اے انجمن
فتح پائی تو نے آخر اپنے استقلال سے — بج گیا ڈنکا ترا کابل سے لے کر تا دکن
سانچ کو جب تک نہیں اے انجمن دنیا میں آنچ — تیری پشتی پر رہے تائیدِ ربِ ذوالمنن
تجھ سے اُمیدیں ہیں وابستہ بہت احباب کی — قوم کی دایہ ہے تو، اور ماں ہے تو پنجاب کی

2

تو نے لی جس وقت لاوارث یتیموں کی خبر — قوم میں کوئی شفیق ان کا نہ آتا تھا نظر[35]
کہہ رہی تھی بے کسی ان کی زبانِ حال سے — دین پر تھی اپنے جو نازاں وہ اُمت ہے کدھر؟
ہو رہی ہے پود کب سے پائمال اسلام کی — اور کوئی کلمہ گو لیتا نہیں اس کی خبر
بھائیوں کے دل پہ اس سے میل تک آتا نہیں — جو مصیبت دیکھ کر غیروں کا جی آتا ہے بھر

کر رہے ہیں قحط کے دورے قیامت آشکار ۔۔۔ چھٹ رہی ہیں بیٹیاں ماؤں سے، باپوں سے پسر
ڈالتی ہیں کھیتیوں پر ٹڈیاں جس طرح لوٹ ۔۔۔ قحط سالی میں یونہی پڑتی ہے لوٹ اسلام پر
ناج آٹے کے عوض بکتا ہے یوں دینِ مبیں ۔۔۔ جس طرح بکتی ہے بازاروں میں جنسِ کس مخر
سب سے پہلے بے کسوں کی یہ صدا تو نے سنی ۔۔۔ دل گیا تیرا لرز ان کی تباہی دیکھ کر
تھا قساوت کا مسلمانوں پہ جو دھبّا اسے ۔۔۔ تو نے دھویا دھل سکا ہاتھوں سے تیرے جس قدر
پر یہ دھبّا قوم کے دامن سے چھٹ سکتا نہیں ۔۔۔ ہاتھ بٹوایا نہ مل کر قوم نے تیرا اگر
تک رہے ہیں تیری جانب قوم کے لاکھوں یتیم ۔۔۔ دور سے سن کر ترے دار الیتامیٰ کی خبر
ایک انار اور اس کو تکتے سیکڑوں بیمار ہیں ۔۔۔ لے گی کس کس کی خبر تو، قوم غافل ہے اگر؟
پائیں گے ڈھونڈھے نہ پھر اسلام کو دنیا میں یہ ۔۔۔ قحط کے دورے گئے دور چار اگر ان پر گزر
ہو گئے خالی ہزاروں گھر یونہی اسلام سے ۔۔۔ گونجتی رہتی تھیں تکبیریں جہاں شام و سحر
قوم کو پروا نہیں ان کی تو سن اے انجمن ۔۔۔ ہے پھر ان لاوارثوں کا ملجا و ماویٰ مشن

3

پرورش میں ان کی اپنی جاں کھپاتے ہیں جہاں ۔۔۔ ان کو شفقت سے کھلاتے اور پلاتے ہیں جہاں
عادتیں دیتے ہیں سب ان کی جہاں سانچے میں ڈھال ۔۔۔ جانور سے آدمی ان کو بناتے ہیں جہاں
رکھتے ہیں ماں باپ سے بڑھ کر جہاں ان کا خیال ۔۔۔ لاڈلوں کی طرح ناز ان کے اٹھاتے ہیں جہاں
کرتے ہیں لائق انھیں دنیا میں رہنے کے لیے ۔۔۔ صنعت و علم و ہنر ان کو سکھاتے ہیں جہاں
مینہ برستا ہے جہاں دولت کا ان کے واسطے ۔۔۔ رات دن امداد کے پیغام آتے ہیں جہاں
شیر خواروں کو جہاں رکھتے ہیں ماؤں کی طرح ۔۔۔ نرم نرم ان کو بچھونوں پر سلاتے ہیں جہاں
ان کی خدمت کے لیے، ان کی حفاظت کے لیے ۔۔۔ دائیاں، انّائیں، مامائیں بلاتے ہیں جہاں
ان کو جھولوں میں جھلاتے ہیں جہاں شام و سحر ۔۔۔ مثلِ فرزندوں کے ان کو رکھ رکھاتے ہیں جہاں
قوم میں پرسش نہیں ان کی تو واں پہنچیں گے وہ ۔۔۔ پتلیوں پر ان کو آنکھوں کی بٹھاتے ہیں جہاں
اب کہو حق دار ان کا ہے مشن یا انجمن؟ ۔۔۔ سال بھر میں تین دن لے دے کے آتے ہیں جہاں
جب کہ آ کر انجمن کی سنتے ہیں روداد ہم ۔۔۔ پھر کبھی کرتے نہیں بھولے سے اس کو یاد ہم

4

اس سے بڑھ کر ہوگی کیا اے قوم عبرت کی جگہ
ہو مشنِ اسلام کے پودوں کی خدمت کی جگہ

دل نہ اپنوں کا پسیجے اور کڑھے غیروں کا جی
ہے مسلمانو! یہ غیرت اور حمیت کی جگہ

کیا قیامت ہے کہ حامی جن کے بیگانے بنیں
وہ نہ پائیں قوم میں اپنی حمایت کی جگہ

کیا غضب ہے غیر آسائش کے ہوں جن کی کفیل
ان کو اپنوں میں ملے ڈھونڈے نہ راحت کی جگہ

ہمسری غیروں کی گر دولت میں کر سکتے نہیں
دین کی غیرت تو تم رکھتے ہو دولت کی جگہ

بےکسوں کا دین بھی جس سے بچے اور جان بھی
اس سے بڑھ کر کون سی ہوگی اعانت کی جگہ؟

ادعا ہے تم کو اسلامی حمیت کا اگر
اس سے بڑھ کر کون سی ہوگی حمیت کی جگہ؟

اپنے بچوں کو مشن میں دیکھیں اور ہم مر نہ جائیں
کون سی اس سے زیادہ ہوگی ذلت کی جگہ؟

اب سوا اس کے کہ ہم اپنے پہ خود نفریں کریں
رہ گئی ہے کون سی باقی ملامت کی جگہ؟

قحط نے یارو لیا ہے دیکھ گھر اسلام کا
گھر کو رکھنا ہے تو ہے یہ بذلِ ہمت کی جگہ

لوٹ سے قحطوں کی کچھ دن اور اگر غفلت رہی
گود خالی ایک دن ہو جائے گی اسلام کی

5

وہ گیا دورہ کہ تھے خلقت کے جتنے کاروبار
سب کا سلطانی اعانت پر تھا بس دار و مدار

راج کے ذمے تھی پرجا کی ہر اک بہبود و سود
آدمی اپنے فرائض کے نہ تھے خود ذمہ دار

اب زمانہ وہ ہے جس میں جز نظامِ مملکت
راج کے ذمے نہیں پرجا کا کوئی بوجھ بار

کر رہی ہیں اپنے اپنے بل پہ اب قومیں وہ کام
جو نہیں کر سکتے شاہنشاہ و شاہ و شہریار

پڑ رہا ہے آج دنیا میں یہی غل چار سو
خود خبر لو قوم کی، گر قوم کے ہو غم گسار

دین کا گر درد ہے تم کو، تو دو اس کو فروغ
اور کرو ہر نیک و بد پر حجتِ حق آشکار

علم وفن کی درس گاہیں ملک میں قائم کرو
بھائیوں کی گر جہالت دل پہ گزرے ناگوار

دیکھ کر حالت یتیموں کی اگر کڑھتا ہے جی
مال و دولت مل کے سب ان پر کرو یارو نثار

انجمن کو سمجھو اپنے حق میں اک انعامِ حق
کر رہی ہے جو ادا قومی فرائض بے شمار

انجمن کو، شکر کی جا ہے کہ ہے ہر دم فروغ
دن بدن بڑھتے چلے جاتے ہیں اس کے کاروبار

ہے تمنا یہ ترقی اس کی روز افزوں رہے
اس ترقی سے مگر رہنا عزیزو ہوشیار

ہو رہی ہے جو عمارت دم بہ دم یارو بلند
اس کو خطرہ ہے اگر بنیاد ہے نا استوار

اس سے کیا حاصل کہ تم نے جوت لی میلوں زمیں
آبپاشی کی بھی کچھ تدبیر کی ہے یا نہیں؟

6

اب نہیں وہ دن کہ کھو کر مال و دولت رائگاں
چند نا اہلوں میں ہوں مشہور فیّاضِ زماں

نام روشن باپ دادا کا کریں لے لے کے قرض
بیچ بیچ اسلاف کا ترکہ رچائیں شادیاں

ایک مونڈن یا کہ بسم اللہ کی تقریب میں [36]
ہوں بہت ممنون گر رکھ لے کوئی گروی مکاں

لیں نہ کچھ اس کی خبر مفلس کوئی بھائی ہو گر
پر ہوں دسترخوان پر دس بیس حاضر میہماں

در سے خالی ہاتھ کوئی مانگنے والا نہ جائے
گو کہ فاقے سے ہوں ہمسائے کے بچے نیم جاں

ساری یہ فیاضیاں نبھ سکتی تھیں یارو جبھی
قوم کے سر پر نہ تھا جب قوم کا بارِ گراں

اب عزیزو جزرسی کا اور کفایت کا ہے وقت
ہے تمہارا میہماں لوٹا ہوا اک کارواں

آج کل ہے بس یونہی امداد کی محتاج قوم
قحط میں پانی کی بھوکی جیسی یارو کھیتیاں

اغنیا غافل ہیں اور ماوشما سب تنگ دست
پونجیاں اوچھی ہیں اور درپیش ہے خرچِ گراں

ناؤ ان ہاتھوں سے اس امت کی کھینی ہے تمھیں
تھا کھویّا جس کے بیڑے کا رسولؐ انس و جاں

جس کی عزت درحقیقت عزتِ اسلام ہے
جس کی ذلت خود تمھاری ذلتوں کا نام ہے

15 ترغیبِ امدادِ یتیماں [37]

(سنہ تصنیف: 1905، ہیئت: قطعہ، ماخذ: جواہرات حالی)

اسلام بہت دن سے یہ کرتا تھا منادی
اے غافلو، اے بے خبرو! ہوش میں آؤ

فارغ غمِ اُمت سے اور اسلام کا دعویٰ
دنیا کو بس اب دین پہ اپنے نہ ہنساؤ

گو دین کی صورت ہے پہ سیرت نہیں اس کی
یہ دین ہے یا دین کا ہے سانگ، بتاؤ؟

مقبول نہ حج ہیں، نہ نمازیں ہیں، نہ روزے
جب تک غمِ امت میں نہ جاں اپنی گھلاؤ

دعویٰ نہیں مسموع شہادت نہ ہو جب تک
ہے دین کا دعویٰ تو شہادت کوئی لاؤ

گر اپنے یتیموں کی خبر لے نہیں سکتے
تو دین سے تم قطعِ تعلق کرو، جاؤ

اعضا تو نمازوں میں بہت تم نے دُکھائے
دل کو بھی کبھی ہاتھ سے کچھ دے کے دُکھاؤ

دنیا میں جراحت، یہی عقبیٰ میں ہے راحت کل پھل کوئی کھانا ہے تو زخم آج اٹھاؤ
یہ قوم کے بچے جو پڑے پھرتے ہیں بے کس یہ پود ہے میری اسے دیکھو، نہ گنواؤ
شیریں ہے پھل ان پودوں کا اور سایہ ہے گھن کا سیوا کرو ان کی انھیں پروان چڑھاؤ
دیکھو نہ حقارت سے پھٹے کپڑوں کو ان کے ان گدڑوں میں جو لعل کہ گم ہیں انھیں پاؤ
سنولائے ہوئے چہروں میں نور ان کے ہے تاباں ان کوئلوں کو ہیرے جلا دے کے بناؤ
ہیں ان میں فقیہ، ان میں حکیم، ان میں محدث ان کی بری حالت پہ، بری گت پہ نہ جاؤ
جوان میں ہیں جوہر کہیں زنگ ان کو نہ کھا جائے گن دیکھنے ہیں ان کے تو زنگ ان کا چھٹاؤ
افواجِ مخالف ہیں تگ ودو میں چپ وراست رُند جائیں نہ یہ خاک سے، جلد ان کو اٹھاؤ
پھرتے ہیں بہت گھات میں یاں ان کے شکاری ان پنچھیوں کو موت کے چنگل سے بچاؤ
اے یارو! یہ بے غیرتی اور دین کا دعویٰ دیں داری کا اور دین کا بس منہ نہ چڑاؤ
امت کے یتیموں کو ہو انجیل کی تعلیم اور اپنی تم اولاد کو قرآن پڑھاؤ
تثلیث کی پاتے ہوئے دیکھو انھیں تلقین اور اپنے جگر گوشوں کو توحید سکھاؤ
گرجا میں حریف ان کو سکھائیں مری توہین اور کان نہ توہین پہ تم میری ہلاؤ
جن بچوں کو بیٹوں کی طرح چاہیے رکھنا ہاتھ آئیں تمھارے تو غلام ان کو بناؤ
کھانے کی بھی کپڑے کی بھی لیں ان کی خبر غیر اور تم نہ کبھی بھول کے آنکھ ان سے ملاؤ
اپنا تمھیں وہ جان کے گر راہ میں ٹھٹکیں تم غیروں کی مانند گزر پاس سے جاؤ
اسلامیو! بے مہریاں آخر یہ کہاں تک جو منہ کو تمھارے تکیں آنکھ ان سے چراؤ
بے کس نہ گنو ان کو یہ کنبا ہے خدا کا تم پھیر کے منہ ان سے خدا کو نہ رٹھاؤ
عبرت کی جگہ ہے، ڈرو گردش سے فلک کی اولاد کو اپنی نظرِ بد سے بچاؤ
بن باپ کے بنتے ہوئے لگتی نہیں کچھ دیر غیرت کو بس اللہ کی حرکت میں نہ لاؤ
اُمت میں ہو تم اس کی جو اُمت پہ فدا تھا لو تم بھی عزیزو اسی اُمت سے لگاؤ
وہ جیسا غریبوں کا، یتیموں کا تھا عاشق تم بھی انھیں آنکھوں پہ اسی طرح بٹھاؤ
جو خلق تھا ہر بے کس و ناچار سے اس کا اخلاق میں کچھ اس کی جھلک تم بھی دکھاؤ
کڑھتا تھا وہ جس طرح مصیبت پہ ہر اک کی جی تم بھی مصیبت پہ یونہی سب کی کڑھاؤ

ٹوٹے ہوئے دل ہیں یہ گزرگاہ خدا کی
ملنا ہے خدا سے تو اسی راہ سے جاؤ
مدت سے تھا یہ دے رہا اسلام دہائی
اور کہتی تھی غفلت نہ ادھر کان لگاؤ
بارے سنی احباب نے اسلام کی آواز
اور مل کے کیا عہد کہ کچھ کر کے دکھاؤ
جو نشہ غفلت میں ہیں چُور ان کو جھنجوڑو
اور نیند کے متوالے ہیں جو ان کو جگاؤ
بھولے ہوئے جو روزے نمازوں پہ ہیں اپنے
اسلام کی فریاد انھیں چل کے سناؤ
قبل اس کے کہ حج کا کریں کعبے کے ارادہ
حج ہند میں جو ان پہ ہے فرض ان کو جتاؤ
بن باپ کے بچوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے جو دل
کعبے کی طرح گرد طواف ان کے کراؤ
امداد پہ ان کی کرو کل قوم کو مجبور
دل دکھّے اگر اس میں کسی کا تو دکھاؤ
قائم کرو اک انجمن اخوانِ صفا کی
اور بیڑا یتیموں کی حمایت کا اٹھاؤ

***

صد شکر ہوئیں کوششیں احباب کی مشکور
پھل دیکھنے نیت کے ہوں گر ان کی تو آؤ
فیاضیاں جو قوم کے غم خواروں نے کی ہیں
دیکھو انھیں اور بھائیوں کو جا کے سناؤ
باقی ہیں ابھی قوم میں کچھ قوم کے غم خوار
اس شکر میں تم حمد خداوند کی گاؤ
اس وقت کہ نازک ہے بہت قوم پہ یہ وقت
جو قوم کا غم خوار ہو خیر اس کی مناؤ
ہے چار طرف قوم میں اب نفسی ہی نفسی
لو اس کے قدم خود غرضی جس میں نہ پاؤ
رحمت ہے خدا کی یہ عزیزوں کی جماعت
پر اس کی خوشی میں ابھی بغلیں نہ بجاؤ
دے قوم سہارا تو یہ ہے نوح کی کشتی
پر قوم نہ کھیوے تو یہ کاغذ کی ہے ناؤ
سرچشمے سے ہوتی نہیں پانی کی جب آمد
دم بھر میں اتر جاتا ہے دریا کا چڑھاؤ
جوتی ہے یہ یاروں نے بھروسے پہ تمھاری
کیوں کر چلے، جب تم ہی یہ گاڑی نہ چلاؤ
ہیں قوم کی غفلت نے بہت کھیل بگاڑے
تم اس کے جہاں چاہے نشاں دیکھ لو، جاؤ
یاروں کو ابھی کام بہت کرنے ہیں باقی
دو ان کو مدد کام میں اور ہاتھ بٹاؤ
مجلس کہیں جی چھوڑ نہ دے ہو کے ہراساں
اس ناؤ کو جس طرح بنے پار لنگھاؤ
دو چار کے، دس پانچ کے بس کا نہیں یہ کام
سر جوڑ کے اس کام میں سب زور لگاؤ
گو کام ہے دشوار پر مردوں کو ہے آساں
کرنا ہے گر اس کام کو پورا، کیے جاؤ

حواشی

1 ''غالباً یہ ترکیب بند مولانا حالی نے علی گڑھ ہی میں پیش کیا تھا، جب کہ وہ علی گڑھ دوبارہ (1880 میں) تشریف لے گئے تھے۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا،ص 70)

2 ''بہت ممکن ہے کہ اس ڈوبتی کشتی کی تشبیہ سے سرسید نے وہ تصویر نواب مختار الملک مرحوم کے لیے بنوائی ہو جس کا ذکر 'حیات جاوید' میں آیا ہے۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا،ص 73)

3 حدیث نبوی۔ ترجمہ: (اے خدا) میری قوم (کے لوگوں) کو ہدایت کر کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے۔ (1 ص)

4 مطابق مجموعۂ نظم حالی، طبع اول (ص 44) اصل لفظ سوانگ (بہ ضم واوَ) ہے۔ یہاں عام تلفظ کے مطابق لکھا گیا ہے۔

5 مطابق مجموعۂ نظم حالی، طبع اول (ص 44) دیگر نسخوں میں 'تَظَلُّم' چھپا ہے۔ (مرتب)

6 یہ ترکیب بند محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے چوتھے سالانہ اجلاس (منعقدہ دسمبر 1889) میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا۔

7 ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: لَا تَسُبُّوا الدَّھرَ فَاِنَّ الدَّھرَ ھُوَ اللّٰہُ (یعنی زمانے کو برا نہ کہو کیونکہ وہ بھی شیون الٰہی میں سے ایک شان ہے)

8 فیلڈ (Field): میدان، مراد کھیل کا میدان

9 یونین (Union): اتحاد

10 اس بند میں علی گڑھ کالج کے چند اساتذہ کا ذکر آیا ہے۔ مسٹر تھیوڈور بیک کالج کے پرنسپل اور ہورسٹ ایم۔اے۔ اور کالجیٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بقیہ اساتذہ میں سے آرنلڈ استاد فلسفہ، ماریسن اور والس استاد انگریزی، بابو چکرورتی استاد ریاضیات، شبلی استاد فارسی اور مولانا عباس ابن جعفر استاد دینیات تھے۔

11 یہ ترکیب بند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے سالانہ اجلاس (منعقدہ 27 تا 30 دسمبر 1891) میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا۔ نظم کا عنوان بعد میں تجویز کیا گیا، دیوان میں درج نہیں ہے۔

''اس نظم میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیا کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلف ہلپ سے دولت، عزت، نیک نامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کر کے اپنے ہم سروں میں امتیاز حاصل کیا ہو۔ ادنیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں

بڑھ سکتے۔ اعلیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت وعزت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اس حالت پر قائم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنے کا کچھ انسداد نہیں کرتے۔'' (حالی)

12 Circle: دائرہ

13 ترجمہ انگریزی ضرب المثل: Rome was not built in a day

14 یہ نظم، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں سالانہ اجلاس میں بمقام دہلی پڑھی گئی۔ دیوان میں نظم کا عنوان درج نہیں۔ موضوع کی مناسبت سے یہ عنوان مرتب نے تجویز کیا ہے۔ (اص)

15 سدہ آگ کو کہتے ہیں۔ جشنِ سدہ وہ جشن ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے اول جمشید نے پتھر میں سے آگ نکلنے کی خوشی میں بڑی دھوم سے ایران میں کیا تھا۔''

(حاشیہ، دیوان حالی، طبع اول)

16 ڈاکٹر شجاعت علی نے اس نظم کا سنہ تصنیف 1901 بیان کیا ہے۔ ('حالی بحیثیت شاعر'، ص 60) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے بھی 1901 کی تصانیف کے ضمن میں اس نظم کا ذکر کیا ہے۔ (حالی کا ذہنی ارتقاء، ص 194) لیکن یہ نظم دیوان حالی، طبع اول (مطبوعہ 1893، صفحہ 209) میں موجود ہے۔ فاضل محققین کو اس لیے تسامح ہوا کہ 'گدایان قوم' کے عنوان سے 165 اشعار کی ایک مثنوی حالی نے 1901 میں لکھی تھی۔ چنانچہ یہ دونوں نظمیں ایک ہی جماعت 'گدایان قوم' سے منسوب کی گئیں۔ حالانکہ دوسری نظم کا کوئی تعلق پنجاب کی اس 'اسلامی انجمن' سے نہیں ہے جس کے لیے 'صدائے گدایان قوم' لکھی گئی۔ مولانا حالی اس نظم کے حاشیے میں لکھتے ہیں: ''پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے چند باہمت لوگوں نے جنھوں نے اپنی جماعت کا نام 'گدایان قوم' رکھا ہے، ریاست بہاول پور کے لوگوں سے چندہ وصول کرنے کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کا قصد رئیس کے حضور میں یہ اشعار پڑھنے کا تھا لیکن غالباً جانا نہیں ہوا۔'' (اص)

17 دیوان کے ہر نسخے میں یہ مصرع اسی طرح ہے لیکن لفظ 'مژدہ' محل نظر ہے۔

18 ''چونکہ رئیس بہاول پور بنی عباس میں سے ہیں اور عباسیوں کی خلافت میں علم کو بہت ترقی ہوئی تھی، اس لیے یہ مضمون اس طرح ادا کیا گیا۔'' (حالی)

19 Good Subject: اچھی رعایا

20 یہ نظم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں اجلاس (منعقدہ رام پور، دسمبر 1900) کے لیے لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے اس کا سنہ تصنیف 1901 بیان کیا ہے (حالی بحیثیت شاعر۔ صفحہ 90)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے بھی یہی سنہ درج فرمایا ہے۔(حالی کا ذہنی ارتقا،ص 197) لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کا مذکورۂ بالا اجلاس 27 تا 30 دسمبر 1900 کو رام پور میں منعقد ہوا تھا۔(ملاحظہ ہو روداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بابت چودھواں اجلاس 1900۔مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ)۔یہ نظم سب سے پہلے رسالہ معارف، پانی پت، بابت ماہ دسمبر 1900 (جلد:3،شمارہ: 6) میں شائع ہوئی تھی۔مولوی سلیم پانی پتی (مدیر معارف) اس نظم کے تعارفی نوٹ میں لکھتے ہیں:''یہ وہ بے نظیر اور فصیح و بلیغ نظم ہے جو ہماری قوم کے ملک الشعرا مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے رام پور کی کانفرنس کے لیے تیار کی تھی مگر کسی وجہ سے ناتمام رہ گئی تھی۔کانفرنس کے آخری دن یعنی 30 دسمبر 1900 کو عالم باغ میں ایوننگ پارٹی ہز ہائینس نواب صاحب والیٔ ریاست رام پور کی طرف سے ممبران کانفرنس کو دی گئی تھی، اس میں حاضرین جلسہ کے بے حد اصرار کرنے سے مولانا نے یہ نظم ناتمام پڑھ دی تھی......۔'' (رسالہ معارف، بابت ماہ دسمبر 1900،ص 161)

21 ڈاکٹر شجاعت علی، حالی کی نظم 'صدائے گدایانِ قوم' اور 'گدایانِ قوم' کے بارے میں لکھتے ہیں:''یہ دونوں نظمیں مولانا نے پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی جماعت گدایانِ قوم کے لیے لکھی تھیں۔'' (حالی بحیثیت شاعر،ص 90) لیکن یہ نظم پنجاب کی اسلامی انجمن (حمایت اسلام) کی جماعت 'گدایانِ قوم' سے متعلق نہیں بلکہ 1901 میں مدرسۂ طبیہ دہلی کا ایک وفد علی گڑھ آیا تھا، اسی سلسلے میں ایک جلسے کے لیے یہ نظم لکھی گئی تھی۔چنانچہ نظم کے آخری حصے میں طب یونانی کے فروغ کی ترغیب دی گئی ہے۔(اص)

22 Conservative: قدامت پسند

23 Liberal: آزاد خیال

24 حاذق الملک سے مراد حکیم عبدالمجید خاں صاحب، بانی مدرسۂ طبیہ دہلی

25 مولانا حالی نے یہ نظم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سولہویں سالانہ جلسے کے چھٹے اجلاس میں جو 2 جنوری 1903 کو منعقد ہوا تھا، پڑھی تھی۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں:''شروع دسمبر میں کانفرنس کے لیے مولانا نے نظم لکھنی شروع کی تھی لیکن انہی دنوں ان کی صحت نے جواب دیا اور مختلف شکایتیں پیدا ہوگئیں...... تاہم کسی صورت سے وہ نظم پوری کی ...... جو کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی گئی۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا،ص 200) شیخ محمد اسماعیل لکھتے ہیں:''اس نظم کے سنتے ہی ساری محفل مجلس عزا بن گئی......نظم کے مسودے کو نیلام کیا گیا جو 201 روپے پر چھٹا۔'' (کلیات نظم حالی، جلد دوم،ص 97)

26 Level: سطح

27 یہ نظم مولانا حالی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے سترھویں جلسے (منعقدہ بمبئی) کے چوتھے اجلاس میں جو مسٹر بدرالدین طیب جی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، 31 دسمبر 1903 کو پڑھ کر سنائی تھی۔ مولوی بشیر الدین، بانی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے اسے 'ترقی و تنزل' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ 'جواہرات حالی' میں 'فلسفہ ترقی' کا عنوان درج ہے۔ (اص)

28 مراد جاپان جس نے 95-1894 کی جنگ میں چین کو پے در پے شکستیں دیں۔

29 حدیث نبوی: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ.

30 اس آیت کی طرف اشارہ ہے: "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ" (سورۃ العنکبوت: 2:29)

31 مترجمہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "اَللّٰھُمَّ اِھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْن."

32 حدیث: حب العرب من الایمان

33 حدیث: سید القوم خادمھم.

34 یہ نظم اپریل 1904 میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ مولانا کے ایک خط (مورخہ 9 اپریل 1904) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انجمن کے جلسے میں شرکت کے لیے اپریل کے پہلے ہفتے میں لاہور آئے تھے اور آٹھ دن کے قیام کے بعد لاہور سے واپسی ہوئی۔

(بحوالہ مکتوبات حالی، جلد دوم، صفحہ 356)

انجمن کے اسی جلسے میں علامہ اقبال نے بھی ایک نظم سنائی تھی۔ مولانا حالی کو اقبال کا ایک شعر بہت پسند آیا جس کی داد یوں دی کہ انجمن کو دس روپے عطا فرمائے۔ آخر میں مولانا حالی نظم سنانے کے لیے کھڑے ہوئے مگر ان کی نحیف آواز ہزاروں کے مجمع میں بہتوں کو سنائی نہ دی۔ حاضرین کی بے قراری دیکھ کر شیخ عبدالقادر صاحب نے اعلان کیا: ''مولانا حالی کی زبان سے تبرکاً جو کچھ سنا جائے سن لیجیے، بعد میں یہی نظم اقبال پڑھ کر سنائیں گے۔'' جب اقبال سٹیج پر آئے تو مولانا حالی کی نظم سنانے سے پہلے یہ رباعی فی البدیہہ پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

(بحوالہ باقیات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، صفحہ 132)

35 شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اس بند کے مندرجہ ذیل پانچ شعر مولانا حالی کے قلمی مسودات سے نقل کیے ہیں۔ یہ اشعار اب تک کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئے۔

پر تجھے ہے اے مبارک انجمن یہ بھی خبر
قوم تیرے دم سے رکھتی ہے اُمیدیں کس قدر
دھر لیا ہے اپنے سر گویا کہ اک عالم کا بوجھ
قوم کی خدمت پہ جب سے تو نے باندھی ہے کمر
حس و حرکت قوم میں باقی نہیں رہتی جہاں
مورتیں مٹی کی آتی ہیں نظر دیکھو جدھر
ہے مثل مشہور ''جو بولے گا گھی کو جائے گا''
تو بنی ہے خود گنہگار اپنے منہ سے بول کر
تک رہے ہیں تیری جانب قوم کے لاکھوں یتیم
چند معصوموں کو گہوارے میں تیرے دیکھ کر

سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار، بند کے دسویں شعر سے مربوط ہیں۔ آخری شعر اور بند کے گیارہویں شعر کا مصرع اولیٰ بھی مشترک ہے۔ غالباً بغرض اختصار یہ اشعار حذف کر دیے گئے۔ (اص)

36 'ایک مونڈیاں یا کہ بسم اللہ کی تقریب میں'؛ جواہرات حالی ص 69

37 یہ نظم 1905 میں انجمن مؤید الاسلام دہلی کے جلسے میں پڑھی گئی۔ (بحوالہ 'حالی بحیثیت شاعر' ص 91)

باب چہارم

بچوں کی نظمیں

بچوں کی نظموں پر ایک نظر

علم و ہنر، اخلاق و کردار، تعلیم و تربیت کی نشو ونما بچپن سے کی جاتی ہے اسی لیے مہذب خاندانوں، تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کے لیے اتالیق رکھے جاتے، جو ہر قدم پر موقع و محل کے حساب سے بچوں کی تہذیب کی پرورش کرتے تھے۔ شعر و ادب بھی ایک ایسی آموزش گاہ ہے جس میں شاعر اور ادیب و استاد معنوی تصوّر کیے جاتے جو تحریروں اور تقریروں کے ذریعے بچوں کا ادب تشکیل دے کر ان کی تفریح کے سامان کے ساتھ تعمیری فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

ادب برائے ہدف شاعری برائے زندگی جسے مقصدی ادب و شاعری بھی کہتے ہیں اس کا ایک اہم جز و انسان سازی بھی ہے جو مہد سے لحد تک جاری رہتی ہے۔ چنانچہ اس تربیت میں بچوں اور نسل جوان کے ادب کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو شعر و ادب میں دوسری زبانوں کے مقابل بچوں کے ادب پر کم کام ہوا ہے جس پر ہم آگے روشنی ڈالیں گے لیکن پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون کون سے لوازمات اور نکات وخصوصیات ہیں جو بچوں کے ادب کے لیے ضروری ہیں۔ بچوں کے ادب کی زبان سیدھی سادی، سلیس و شگفتہ اور پیچیدہ تشبیہات و استعارات سے پاک ہونی چاہیے۔ ایسی ضیق و مشکل بھی نہ ہوں جس سے سمجھنے میں دقت پیش آئے۔ ان کے علاوہ اگر ادب میں بچکانہ پن یا بچپن نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں بچوں کا ادب نہیں کہلا سکتا۔ یعنی شعر و ادب میں موضوع کا انتخاب بچوں کے سن و سال سے ہم آہنگ ہو اور پھر طرز بیان کچھ ایسا

ہو جو بچوں کی نفسیات اور جذبات سے میل کھاتا ہو جس کی وجہ سے بچوں کا کامیاب ادیب و شاعر خود اس تخلیق کے وقت بچہ بن جاتا ہے۔ ایسے اشعار کو کم درجے کے بے روح اور سبک سستے شعر نہیں کہنا چاہیے یہ وہ اشعار ہیں جو بچپن سے بڑھاپے تک ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اشعار اگرچہ بہت آسان اور عام فہم بھی بچوں اور نسل جوان کی عمروں کے مطابق نہ ہو لیکن بچوں کو یاد ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے بچپن کی یادداشت بن جاتے ہیں جس کی وجہ ان شعروں کا بچوں کی فکر اور جذبات سے یکساں ہونا ہوتا ہے۔ جیسے علامہ اقبال کا یہ شعر ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری　　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اس شعر کے مقابلے میں جہاں بچکانہ پن ہر لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ شعر اسماعیل میرٹھی کا ہے ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی　　　جس نے ہماری گائے بنائی

جہاں تک اردو شعر و ادب میں بچوں کے ادب کا تعلق ہے اس کی کمی کی وجوہات میں اردو کی کم عمری بچپن کی کوتاہ مدت اور اردو کے بچپن میں اس کا زیادہ تر بڑوں کے ساتھ ملاپ شامل ہے۔ بچوں کی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کے ادب کی پذیرائی بھی ویسے نہیں ہوئی جس طرح ہونی تھی چنانچہ بچوں کے ادب کے ادیب و شاعر بھی کچھ دن کے بعد ہمیشہ کے لیے بڑوں کے ادب کے ہو کر ہو گئے۔ بعض عمدہ شاعروں اور ادیبوں نے یہ روش ہمیشہ جاری رکھی جن میں نظیرا کبر آبادی، میر امن، اسماعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، اقبال، حفیظ جالندھری، راشد الخیری، امتیاز علی تاج اور کئی چھوٹے بڑے جدید شاعروں اور ادیبوں کے نام اور کام شامل ہیں۔

نظیرا کبر آبادی کی شاعری کے وہ حصے جس میں تماشا، کھیل، طنز و مزاح سادگی کے ساتھ ملتا ہے بچوں کی توجہ کا باعث رہا۔ بچوں کی خاص نظمیں ''ہنس'، ریچھ کا بچہ ان کے تماشے کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔ میر امن کے پاس کہانی کا جو تجسّس اور شیریں بیانی تھی وہ بچوں اور نسل جدید کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ محمد حسین آزاد حقیقت میں استاد تھے ان کی نظموں اور نثر کی کتابوں میں وہ سب چیزیں تھیں جنھیں شاگردوں کے لیے لکھا تھا۔ آزاد کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں 'قصص ہند' اور 'نصیحت کا کرن پھول' اس دور میں پسند کی گئی تھیں۔ اسماعیل میرٹھی سب سے مشہور بچوں کے شاعر گزرے ہیں۔ ان کی نظموں کو جو بچپن سے لبریز ہیں اور سادگی میں تازہ مضامین کی پیشکش ہے

ایک کامیاب شاعری میں ڈھال دیتی ہے۔علامہ اقبال نے فارسی میں بچوں اورنسل جواں جاوید سے خطاب وغیرہ لکھا اوراردو میں بھی ان کا کلام بچوں کے لیے کم مگر پُر تاثیر ہے اسی وجہ سے ان کے اشعار بچوں کو یاد ہیں ایک مصرعہ پڑھیے دوسرا وہ اٹھا لیتے ہیں۔حالی نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ گزارا۔وہ بچوں اورنسل جواں کی نفسیات، جذبات اورضروریات سے واقف تھے۔وہ تہذیب وتمدن کی امانت نئی نسل کو سپرد کرنے سے پہلے انھیں اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ قومی قدروں کو اضافوں کے ساتھ اپنی آئندہ نسلوں کو پیش کرسکیں۔حالی نے اگرچہ نثر میں کوئی علاحدہ کتاب نہیں لکھی مگر مجالس النسا میں بچوں کے لیے کارآمد باتیں کیں جن سے عورتیں اوران کی آغوش میں پلے بچے فائدہ اٹھارہے تھے۔حالی کی شاعری خصوصی طور پران کی نظمیں اورمسدس سے بچے جوان بڈھے سب اپنی اپنی فکر اورعلمی استطاعت کے مطابق استفادہ کررہے تھے۔اسی لیے ان کی نظموں اورمسدس کے بند کو درسی کتابوں میں جگہ دی گئی تھی۔اگرچہ ان شعروں کا مقصد اخلاق سازی اورقوم سازی تھا اوراس میں بچپن کا چلبلاپن اورمعصومیت نہیں تھی اس لیے ہم ان اشعار کونسل جدید کی تعمیر وتربیت کے شعر تو کہہ سکتے ہیں لیکن انھیں مکمل طور پر بچوں کے ادب میں جگہ نہیں دے سکتے۔ بچوں کے ادب کے متعلق ناقدوں نے انہی اشعار کو مورد بحث وتنقید کیا کیونکہ وہ حالی کی ان بچوں کی نظموں سے واقف نہیں تھے جنھیں حالی نے محکمہ تعلیم کے تقاضے اورفرمائشات پرلکھی تھیں۔یہ وہ دور تھا جب ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل نولٹن کی زیرنگرانی بچوں کی نظموں کا مجموعہ'اطوار بازیچہ' شائع ہو چکا تھا اور بچوں کے متعلق نظمیں 'بچوں کا اخبار' میں بھی شائع ہوئی تھیں۔حالی نے بچوں کے لیے چھوٹی بڑی چودہ نظمیں لکھی ہیں۔یہ نظمیں حالی کی زندگی کے آخری دور کی نشانیاں ہیں۔حالی نے ان نظموں کے لیے مربع، مخمس، مسدس اورمثنوی کی ہیئت استعمال کی۔

جدول

	عنوان	ہیئت	تعداد شعر
1	خدا کی شان	مثنوی	17 شعر
2	بڑوں کا حکم مانو	مربع	18 شعر
3	مرغی اوراس کے بچے	مثنوی	14 شعر

4	بلی اور چوہا	قطعہ	6 شعر
5	شیر کا شکار	مسدس	15 شعر
6	پیشے	مثنوی	84 شعر
7	گھڑیاں اور گھنٹے	مسدس	24 شعر
8	دھان بونا	مثنوی	9 شعر
9	روٹی کیوں کر میسر آتی ہے	......	78 شعر
10	موچی	مخمس	12 شعر
11	چٹھی رساں	قطعہ	22 شعر
12	سپاہی	مثنوی	8 شعر
13	ایک چھوٹی بچی کے خصائل	......	39 شعر
14	نیک بنو نیکی پھیلاؤ	مسدس	21 شعر

ان نظموں کا ماخذ جواہرات حالی ہے صرف آخری نظم مجموعہ نظم بچوں کا اخبار لاہور سے لی گئی ہے۔ حالی کی نظموں کی یہ تعداد صحیح نہیں بلکہ اگر تلاش اور تحقیق کی جائے تو مزید نظموں کے ملنے کا امکان ہے۔ سب سے بڑی نظم مثنوی 'پیشے' کے عنوان سے لکھی اور سب سے چھوٹی نظم قطعہ 'بلی اور چوہا' چھ شعر کا لکھا۔ حالی کی ان نظموں میں بیانیہ انداز ہلکے پھلکے مگر دلچسپ موضوعات، تفریحی اور معلوماتی اشعار جو آسانی سے بچوں کو یاد ہو جائیں نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں حالی نے بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے پڑھنے والے کو بچہ بن کر پڑھنا پڑے گا ورنہ اس کے لطف و مزے سے فائدہ اٹھا نہیں سکے گا۔ حالی نے کسی حد تک بچوں کی نظموں میں اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی تقلید کی ہے۔ اگر چہ وہ اس سطح تک پہنچ نہ سکے۔ اسماعیل میرٹھی نے 1893 میں اپنی بچوں کی نظموں سے زینت دے کر ابتدائی کلاسوں کے لیے ایک درسی کتابوں کا سلسلہ جاری کیا تھا جو محکمہ تعلیم کی ترغیبات کا نتیجہ بھی تھا۔ ان درسی کتابوں میں شامل بچوں کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کئی لوگ اس دور میں اس میں دلچسپی لینے لگے۔

یہاں ہم پہلے حالی کی ان مخصوص نظموں پر بات چیت کریں گے جو خاص بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اوپر دیے گئے چودہ نظموں کے تقریباً پونے چار سو شعروں میں ایک شعر بھی مشکل

سے ایسا نہیں نکلے گا جو کم عمر بچہ کی سمجھ سے باہر ہوگا۔ خدا کی شان کے عنوان سے اس چھوٹی سی 17 اشعار کی مثنوی میں خدا کی معرفت، خدا کی محبت، خدا کی نعمتیں، خدا کی رحمتیں ان مثالوں اور حالات سے بیان کی گئی ہیں جس سے بچہ واقف ہے۔ اسے تک بندی نہیں بلکہ بچوں کی شاعری سمجھنا چاہیے اور اس کی لذت سے آشنا ہونے کے لیے ناقد کو بچہ بننا ضروری ہے۔

تو ہی ہے سب کا پالنے والا کام سب کا نکالنے والا

مغربی دنیا میں چھوٹے بچوں کے مکتب اور مدرسوں کو کنڈر گارڈن کہتے ہیں وہاں سب سے پہلے بچے کو اس کے اعضا اور ان کے کاموں سے روشناس کیا جاتا ہے۔ حالی نے اس کام کے ساتھ بچے کے ذہن میں ہر نعمت کے والی اور ہر مشکل کے حل کرنے والے کے ساتھ ایک ابدی رشتہ بھی پیدا کیا ہے۔

آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لیے کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے
بات کے سننے کو دیے دو کان بات کہنے کو تو نے بخشی زبان

بھوک، پیاس، گرمی، سردی، جاڑا، برسات سب کا یہاں ذکر کر کے اس کا ربط خدا سے کر دیا کہ جب لوگ ان سے تنگ آ جاتے ہیں تو صرف خدا ہی ان سے نجات دلاتا ہے۔

کیں سدا تو نے مشکلیں آساں تیری مشکل کشائی کے قرباں

ایک ہلکی پھلکی لیکن موسیقی سے بھرپور نظم جو مربع کی شکل میں ہے اور کورس کے طور پر مل کر پڑھی جا سکتی ہے اخلاق کا سبق ہے۔

چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو سر پر بڑوں کا سایہ، سایہ خدا کا جانو
وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں اس بات سے بچو تم جس بات پر وہ ٹوکیں
تم کو نہیں خبر کچھ اپنے برے بھلے کی جتنی ہے عمر چھوٹی اتنی ہے عقل چھوٹی
سیکھو گے علم و حکمت ان کی ہدایتوں سے پاؤ گے مال و دولت ان کی نصیحتوں سے

پوری نظم نصیحت سے سجی ہے لیکن نصیحت آمیز کچھ مبالغہ مصرعوں کے باوجود دل کو چھونے والی ہے۔ ابتدائی مکتب کے بچوں کے لیے اچھا ترانہ ہے۔

مرغی اور اس کے بچے کی مثنوی میں لاشعوری طور پر بچے اور ماں کے رشتے کو مضبوط کیا گیا ہے کہ بچے ماں کے ساتھ رہیں ماں کا کہنا سنیں اور یہ ممتا کی محبت ہی ہے جو حیوانوں اور انسانوں

میں زندگی کا رنگ بھرتی ہے اور اس ممتا سے کئی گنا زیادہ خدا کی محبت ہے جو بندوں کی حفاظت اور ہدایت کرتا ہے۔ اس نظم میں بچے جو سنتے ہیں جو دیکھتے ہیں اس کو نظم کیا گیا ہے۔

یہ جو ہے گھر میں تمھارے مرغا   چیختا زور سے ہے ککڑوں کوں
دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی   فوج بچوں کی لیے نکلے گی
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ   چونچ سے دے گی وہ منہ میں ان کے
مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی   کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا   ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

حالی کی ان نظموں میں ہندوستانی اور ہندی کے الفاظ حسب ضرورت مصرعوں میں خوب صورت طریقے سے جڑ دیے گئے ہیں۔ ان نظموں میں شاید ہی کوئی ترکیب اضافت تلمیح یا ادق خارجی لفظ ہو۔ محاورے وہ بھی روزمرہ میں جو بچوں کی علمی اور فکری معیار سے نسبت رکھتے ہوں نظم میں خوبصورتی اور تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ حالی کی شاعری میں ترقی پسندی کا عنصر یہاں کھل کر سامنے آتا ہے جہاں ہر کام کی قدر اور اس کی عزت کی گئی ہے۔ کوئی بھی معمولی یا جاگیردارانہ لہجہ میں ادنیٰ پیشہ حقیقت میں ادنیٰ نہیں ہوتا اور اس پیشہ کو عمدگی سے کرنے والا کسی دوسرے اعلیٰ پیشے سے کم نہیں ہوتا۔ حالی قوم کی تربیت کر رہے تھے جہاں روٴسا، حکمران، اونچے خاندان کے افراد شاہی کے بجائے گدائی کر رہے تھے۔ روٹی کپڑا اور مکان کے محتاج ہو گئے تھے لیکن ان پیشوں کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتے تھے جن میں محنت، مشقت، عرق ریزی کی ضرورت ہوتی تھی۔ قوم جل چکی تھی لیکن رسی کا بل ابھی باقی تھا جس کا اثر ان خاندان کے بچوں پر منفی پڑ رہا تھا ایسے حساس موقع پر حالی نے کئی بچوں کی نظمیں لکھ کر انھیں ترغیب دی کہ ہر پیشہ معتبر اور مقتدر ہے۔ ایک کارگر جو جوتے بنانے میں ماہر ہے اس کی مہارت اور کاریگری کسی طرح سے یونان کے فلاسفر افلاطون کے فلسفۂ کلام سے کم نہیں۔

حالی کی نظمیں پیشے، چٹھی رساں، موچی، سپاہی وغیرہ وہ نظمیں ہیں جن میں اوپر بیان کیے گئے مطالب کے ساتھ ساتھ ان پیشوں کی معلومات اور اصطلاحوں سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔

حالی نے پیشہ کے عنوان سے مثنوی کی شکل میں چوراسی 84 اشعار پر مشتمل بچوں کی طویل ترین نظم لکھی ہے۔ یہ نظم ماں اور بیٹوں کے درمیان بات چیت ہے۔ یہاں حالی نے سات بیٹوں کی گفتگو کو نظم کیا ہے جو اپنی ماں سے مخاطب ہو کر باری باری سے کہتے ہیں۔

میں بڑا ہوں گا جب تو اماں جان   اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان

میں جواں ہوں گا جب تو اماں جان   فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

ع آپ کے باغ کا بنوں مالی

ع کہ بڑا ہو کر میں بنوں دھوبی

ع کنسٹبل بنوں گا اول بار

ع ہو سکا تو بنوں گا چٹھی رساں

ع اک بڑھئی مستری بنوں گا میں

ہمارے معاشرے میں کسان، دھوبی، سپاہی، ڈاکیا، کانسٹبل، بڑھئی اور مالی بننا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف اعلیٰ ملازمتوں، انجینئروں، ڈاکٹروں، پروفیسروں اور تاجروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا جس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا کہ لوگ بیکاری اور گدائی کے شکار ہو کر ذلیل وخوار ہوئے۔ حالی بچوں کے ذہنوں اوران کی نفسیات سے واقف تھے وہ یہ بیج بچپن کے زرخیز ذہن میں بو رہے تھے تا کہ جب وہ بڑے ہوں تو یہ صحیح فکر کا تناور درخت بن جائے۔ وہ ہر پیشہ کے کام وکاج کے ساتھ اس میں ترقی اور مہارت کی امنگ بھی بچہ کی زبان سے دوہرا رہے تھے۔

ہل چلاؤں گا بیج بوؤں گا   وقت پر جب کہ غلہ کاٹوں گا

بھائی بہنوں کا حصہ باؤں گا   جو کماؤں گا گھر میں لاؤں گا

(کسان)

سیکھ لوں میں کہیں قواعد جنگ   مشق بندوق کے لگانے کی

جنگ کی ہے مہم سے کیا ڈرنا   آدمی کو ہے ایک دن مرنا

کیا عجب ہے رسالہ دار بنوں   اونچی ہو جائے گی تمھاری ناک

سب کہیں گے رسالہ دار کا ماں

(سپاہی)

کیاریاں ہر طرح کی کھودوں گا　　نت نئے پھول میں اگاؤں گا
موتیا اور چنبیلی اور جوہی　　دیکھنا کیسے گل کھلاؤں گا
(مالی)

اونچے کر کر کے دست و بازو میں　　کپڑے دھویا کروں چھوا چھو میں
اجلے براق صاف اور ستھرے　　برف شرمائے دیکھ کر جن کو
کھاؤں گا اور کھلاؤں گا اماں　　تم کو میں حق حلال کا لقما
(دھوبی)

بدمعاشوں کو تنگ کر دوں گا　　جیل خانوں کو ان سے بھر دوں گا
جو کروں گا تو میں دل و جاں سے　　راست بازی سے اور ایماں سے
(کانسٹبل)

لے کے سب چٹھیوں کا میں طومار　　بانٹ آیا کروں گا نام بنام
خط کسی کا نہ میں کروں گا تلف　　نہ بنوں گا ملامتوں کا ہدف
(ڈاکیا)

نہ بڑھئی وہ ہے جن کا نام بڑھئی　　جو کہ پھرتے ہیں کہتے کام بڑھئی
اس ہنر میں بنوں گا میں استاد　　اور کروں گا نئے نئے ایجاد
کارخانہ خود اک بنا لوں گا
ہو گی جب ہر طرف مری شہرت　　دیکھنا گاہکوں کی پھر کثرت
مستری ایک ہو اگر ہشیار　　ہر جگہ اس کے مشتری ہیں ہزار
(بڑھئی)

حالی یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی کام گرا ہوا بے کار یا ذلیل نہیں ہوتا۔ اگر ایک ظاہری طور پر معمولی کام ہو لیکن کاریگر اسے کمال سے انجام دے تو اس کاریگر کی حیثیت کسی عظیم شخصیت سے کم نہیں۔ حالی معاشرے کی خامیوں کو خوبیوں سے بدل رہے تھے جس کا پھل ہم نے برصغیر میں دیکھا۔ اس موقع پر ہم ایک واقعہ جسے مولوی عبدالحق نے اپنے خطبوں میں لکھا ہے پیش کر کے حالی کے انقلاب ذہن کی نشان دہی کرتے ہیں۔

حالی کی ایک چھوٹی بارہ شعر کی نظم موچی ہے۔ جہاں ایک بچہ جو کہتا ہے ''میں موچی کہلاتا ہوں''۔

ڈاکٹر اقبال ایک زمانے میں انارکلی میں رہتے تھے، اس بازار میں رہنے کے مکان اوپر تھے اور نیچے دکانیں تھیں جہاں ڈاکٹر اقبال رہتے تھے، اس کے عین نیچے ایک درزی کی دکان تھی، جس نے نہایت جلی حروف میں خوشخط شیشے کے ایک چوکھٹے میں غالب کا یہ مصرع لکھ رکھا تھا ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا'' اس درزی کی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے، وہ قوت کے تقاضا کو کیا خوب سمجھا اور اس نے اس مصرع سے کیا خوب کام لیا، اس نے ہماری بھی ایک مشکل حل کر دی، یعنی انسان اب درزی کی دکانوں، ہیر کٹنگ سیلون اور بیوٹی کلچر ایوانوں میں بنتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ موچی کیسے چمڑے سے جوتا بناتا ہے اس میں موچی کے اوزار رانپی اور برشا اور اس کام میں بھی محنت عمدگی کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

چمڑا مول منگاتا ہوں دھو کے اسے سکھلاتا ہوں
کل کر نرم بناتا ہوں کرتا ہوں خوب ان کو صفا
پھر لے نپا اور تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
پھر جوتی قالب پہ چڑھا ٹھوک ٹھکا اور کوٹ کٹا
رانپی سے برشا کے تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
سال کے اندر میرا بوٹ میں ضامن جو جائے ٹوٹ

اسی طرح سپاہی اور چٹھی رساں یعنی پوسٹ مین کے بارے میں قدرے تفصیل سے ان کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالی کی ایک عمدہ بچوں کی نظم ہے 'روٹی کیوں کر میسر آتی ہے' یہ نظم مثنوی کی شکل میں تقریباً 80 اشعار سے بنی ہے۔ یہاں حالی نے پہلے تو بچوں کو یہ بتایا ہے کہ کسان گیہوں اگاتا ہے اور اسے بازار میں فروخت کرتا ہے جسے خرید کر گھر میں ماں چکی سے پیس کر آٹا بناتی ہے اور چھان کر اس کو گوندھ کر روٹی پکاتی ہے۔ لیکن ان سادے کام کاج بیان کرتے ہوئے حالی بچوں کے لیے نصیحت کے علاوہ مزاح کے پہلو بھی نکالتے ہیں۔

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسر
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی

وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے　　کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے
جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے

اسی چکی کا پیا تھا وہ آٹا　　چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا
لگی جب گوندھنے آٹا جھپا جھپ　　اور اس میں مارنے مکّی شپا شپ
وہ یوں آٹے کو ہے دیتی ٹھپکتی　　کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی

حالی نے روٹی جو گھر پر توے پر پکائی جاتی ہے اور باہر تندور پر بنائی جاتی ہے دونوں کو خوبصورت طریقے سے بیانیہ شعروں میں نظم کیا ہے۔ کچھ الفاظ جیسے روٹی کو جس کپڑے کے گدے پر لگا کر تنور میں لگاتے ہیں بچوں کو سکھاتے ہیں۔

گھڑی ہاتھوں پہ پھیلائی بڑھائی　　رفیدے پر دھری اور چٹ لگائی

اس نظم کا خاص حسن اس میں ماں کی محنت اور اس کی بچوں کی خاطر ہر قسم کی زحمت کو برداشت کرنا ہے جس سے بچوں کے دل و دماغ میں ماں کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو۔

بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے　　نہ کھائے آپ اور سب کو کھلائے
یہی رہتا ہے دن رات اس کو رونا　　پکانا ریندھنا سینا پرونا
اسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب　　نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہے مطلب
وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت　　نہیں ملتی اسے مرنے تک فرصت
نہیں کر سکتے حق ان کا ادا تم　　کرو ان پر سے گر جاں بھی فدا تم
سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت　　کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت

ایک نو شعر کی مثنوی 'دھان بونا' میں دھان کس طرح بویا جاتا ہے جس میں کئی ہندی الفاظ سیوا، سہاگا، گیانی اور محاورہ دھان پان استعمال کیا گیا ہے۔

بس دھان کو نازک ایسا ہی جان　　ہو جیسے کہ دھان پان انسان

حالی کی بچوں کی نظموں میں سب سے نسبتاً مشکل نظم گھڑیاں اور گھنٹے کے عنوان سے مسدس کی شکل میں چوبیس اشعار کی نظم ہے جس کا محور وقت ہے یعنی گھڑیاں جو وقت بتانے کا آلہ ہیں وہ دن رات کام کرتی رہتی ہیں انھیں دن رات گرما سرما اوپر نیچے امیر غریب بلندی پستی شاہ و گدا

سب کے پاس ایک ہی حالت میں مسلسل چلتی رہتی ہے تھکن اورآ رام ان کے لیے موت ہے۔ چنانچہ انسان کو بھی رکنا نہیں چاہیے بلکہ زندگی کا سفر ہر طرح اور ہر طریقے سے جاری وساری رہے۔ سچ کہا ہے حرکت میں برکت ہے۔ کچھ شعر نمونے کے پیش کر رہے ہیں ؂

دوپہر ہو یا رات ہو یا صبح ہو یا شام ۔۔۔ جب دیکھیے چلنے سے سدا اپنے انھیں کام
مینار کے اوپر ہوں کہ تہہ خانے کے اندر ۔۔۔ رکھے انھیں پاس اپنے سکندر کہ قلندر
ان کو نہیں یاں اونچ کا یا نیچ کا کچھ غم ۔۔۔ اپنی اسی ٹک ٹک سے سروکار ہے ہر دم
دیتے ہیں سنو غور سے ہر دم یہ دہائی ۔۔۔ لو وقت چلا ہاتھ سے کچھ کر لو کمائی

حالی نے مسدس کی شکل میں ٹیپ کے شعر کو ساتوں بندوں میں یکساں رکھ کر ترجیع بند لکھا ؂

قوم کو اچھے کام دکھاؤ ۔۔۔ نیک بنو نیکی پھیلاؤ

سچ بولو، صاف اور ستھرائی رکھو، ہمسائے سے اچھے برتاؤ کرو، محنت کرو علم حاصل کرنے کے لیے کمانے کے لیے اور رحم دل رہو بری عادتوں میں مت پڑو ؂

سچ بولو سچے کہلاؤ ۔۔۔ سچ کی سب کو ریس دلاؤ
ہو گی تم میں گر ستھرائی ۔۔۔ سب سیکھیں گے تم سے صفائی
جو پڑھنے میں کرتے ہیں محنت ۔۔۔ سیکھتی ہے شوق ان سے جماعت
نیک ہے نیکی سب کو بتاتا ۔۔۔ بد اوروں کو بد ہے بناتا

جواہرات حالی میں ایک مثنوی انتالیس شعر کی ایک چھوٹی بچی کے خصائل کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ نظم حالی نے 1909 میں ممتاز فاطمہ عرف سیدہ خاتون کے لیے لکھی جب وہ ڈھائی سال کی تھی۔ سیدہ خواجہ غلام ثقلین کی بیٹی اور غلام سیدین کی چھوٹی بہن تھی۔ حالی اسے بہت چاہتے تھے۔ حالی نے اس نظم میں نہ صرف سیدہ کی رفتار گفتار صورت شکل عادت و مزاج کو اس نظم میں پیش کیا ہے بلکہ اس کی نفسیات اور بچوں کے نکات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس نظم کو ہر دو ڈھائی سالہ بچے کی نفسیات، عادات اور خصوصیات سے جوڑا جا سکتا ہے ؂

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے ۔۔۔ صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان ۔۔۔ پر سب اچھے برے کی ہے پہچان

ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام — سب کو کرتی ہے ہاتھ اٹھا کے سلام
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول — بولتی ہے سدا ادھورے بول
نئے آتے ہیں گھر میں جب مہمان — دیکھ دیکھ ان کو ہوتی ہے خنداں
دیکھتی ہے مڑ مڑ سب کو — پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو
بس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا — اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
عمر اس کی خدا دراز کرے — علم سے اس کو سرفراز کرے

حالی لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھے وہ دعا کے ساتھ اس کا بندوبست بھی کرتے تھے چنانچہ اپنے خاندان اور محلے کی لڑکیوں کے لیے لڑکیوں کا مدرسہ کھولا تھا۔ حالی نے اسی طرح ایک دولت مند باپ اور اس کے تین بیٹوں کی کہانی نظم کی۔ جس میں بتایا کہ خیانت نہ کرنا کسی معصوم زندگی کو بچانا نیک اور عمدہ کام ہیں لیکن سب سے اہم اور مبارک کام دشمن سے انتقام کے بدلے رحم کرنا ہے۔ جیسا کہ اس کے چھوٹے بیٹے نے دشمن کو بچا کر اپنی صورت بھی نہ بتائی یہ سب سے بڑا احسان تھا۔

مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار — اک اشارہ میں تھا وہ لقمۂ غار
منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا — اس کو شرمندۂ احساں نہ کیا

حالی خود محب وطن تھے اور اس جذبہ کو عام کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کی خوب صورت نظم حبّ وطن ان کے ایمان کا جزو معلوم ہوتی ہے۔ حالی نے اس محبت کو صرف زبانی نہیں رکھا بلکہ اہل وطن کے ساتھ محبت اخوت ہمکاری، ہمدردی، خوش اخلاقی، ایثار وقربانی کا جذبہ بھی ضروری بتایا۔ حالی وطن کو خوش حال توانا اور پریم کا ساگر دیکھنا چاہتے تھے۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو — قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

حالی ایسے وطن کی ایک مشتِ خاک کو بہشت سے بدلنے کو تیار نہ تھے۔

تری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی چونکہ خود مذہبی ذہن کے مالک تھے اسی لیے وہ نئی نسل میں خدا کی شان اس کی نعمتوں کا ذکر اس کی عبادت کا مزا اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق بندے پر زور دیتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایمان کا بیج بچپن ہی سے بویا جائے اس لیے نرم اور سلیس زبان میں معرفت کے درس دیتے تھے۔

تو ہی ہے سب کا پلانے والا کام سب کے نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

وہ خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے اور اسی ایمان کو کامیابی کی کنجی سمجھتے تھے۔

خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
پڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو

حالی کے تمام تر کلام کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی شاعری کا ایک اہم مقصد بچوں اور نئی نسل کے نوجوانوں میں تعلیم و تربیت کا شوق محنت اور کوشش کی عادت، شرافت اور انسانیت کی نمو، اخلاق و کردار سازی کے ساتھ ساتھ وقت کی قدر، ہمت و استقلال کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے بزرگوں پر اخلاقی فرض ہے کہ وہ بچوں کی راہنمائی کریں اور اکثر لوگ غفلت برتتے تھے چنانچہ خود انھوں نے سیدھی سادی زبان میں میٹھے میٹھے انداز میں ان قدروں کو اپنی نظموں میں ایسا پیش کیا جو فوری دل نشین ہو گئے۔ قطعات ہو کہ رباعیات، غزلیات ہو کہ مثنویات، مسدس ہو کہ ترکیب بند ہر صنف شاعری میں موقع کی نزاکت اور متن کی رعایت سے مذہبی، قومی، علمی، وطنی، اخلاقی، تعلیمی اور رفاہی نکات لکھ دیتے جو ان کے کلام میں مختلف طولانی نظموں اور چند قطعات کے علاوہ غزلوں کے اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں۔ خدا پر ایمان اور پیغمبر اسلام سے محبت جیسے خود رکھتے اسی طرح نسل جوان کو بھی نصیحت کرتے۔

حالی قصے کہانی کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں میں نیکی، ہمدردی اور مدد کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ کہیں یہ بتاتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا چراغ جو راستے پر بڑھیا نے رکھا ہے وہ محلوں کے ان فانوسوں اور برقی جھاڑوں سے بہتر ہے کیونکہ یہ مٹی کا چراغ کئی لوگوں کا مونس اور مددگار ہے دراصل یہی وہ چراغ ہے جن کی معنوی روشنی افلاک تک پھیلی ہوئی ہے۔

چھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا — ایک بڑھیا نے سرِہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں — راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے — روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے — ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں — روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

حالی نے اپنے کلام میں جا بجا عشق رسولؐ کو ظاہر کیا ہے۔ وہ سیرت رسولؐ کو شریعت کا لازم جانتے تھے۔ وہ حضورؐ کی تعلیمات، اخلاقیات، حقوق انسان کی حفاظت، حریت اور حضورؐ کی اور ان کی اولاد کی محبت کو جزو دین مانتے تھے اور یہ محبت کا بیج وہ بچپن سے ہی دل میں بونا چاہتے تھے تا کہ وہ آگے چل کر عشق محمدیؐ کا توانا درخت بن جائے۔

ایمان جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے — وہ تیری محبت تری عزت کی ولا ہے

حالی نے ضمیمۂ مسدس کے ساتھ ایک نعتیہ نظم عرض حال بجناب سرور کائناتؐ لکھی۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت — اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

ایک دوسری نعتیہ نظم دیکھیے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ — یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطاکار سے درگزر کرنے والا — بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

سید تقی عابدی

1 خدا کی شان

(ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

اے زمین آسمان کے مالک ساری دنیا جہان کے مالک
تیرے قبضے میں سب خدائی ہے تیرے ہی واسطے بڑائی ہے
تو ہی ہے سب کا پالنے والا کام سب کا نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے
آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لیے کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے
بات کے سننے کو دیے دو کان بات کہنے کو تو نے بخشی زبان
دن بنایا کمائی کرنے کو رات دی تو نے نیند بھرنے کو
آئی موسم سے تنگ جب خلقت تو نے موسم کی دی بدل صورت
گرمیاں ہو گئیں اجیرن جب تو نے برسات بھیج دی یا رب
سب کے گرمی سے تھے خطا اوسان مینہ برسنے سے آئی جان میں جان
گئے جب مینہ سے لوگ سب گھبرا حکم سے تیرے چل پڑی پچھوا
یا تو تھیں ساری چیزیں سیل رہیں یا رہا سیل کا نہ نام کہیں
جاڑا آ پہنچا اور گئی برسات دم کے دم میں پلٹ گئے دن رات
پھر لگی پڑنے جب بہت سردی مشکل آسان تو نے پھر کر دی
جاڑا آخر ہوا اور آئی بہار جنگل اور ٹیلے ہو گئے گلزار
تو یوں ہی رت پہ رت بدلتا رہا یوں ہی دنیا کا کام چلتا رہا
کیں سدا تو نے مشکلیں آساں تیری مشکل کشائی کے قرباں

2 بڑوں کا حکم مانو

(ہیئت: مربع، ماخذ: جواہرات حالی)

اے بھولے بھالے بچو، نادانو، ناتوانو
سر پر بڑوں کا سایہ، سایہ خدا کا جانو
حکم ان کا ماننے میں برکت ہے میری جانو!
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ اور استاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمھارے نعمت
کڑوی نصیحتوں میں ان کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ کا عزیزو! مانا نہ جس نے کہنا
دشوار ہے جہاں میں عزت سے اس کا رہنا
ڈر ہے پڑے نہ صدمہ ذلت کا اس کو سہنا
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

دنیا میں کی جنھوں نے ماں باپ کی اطاعت
دنیا میں پائی عزت، عقبیٰ میں پائی راحت
ماں باپ کی اطاعت ہے دو جہاں کی دولت
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

سیکھو گے علم و حکمت، ان کی ہدایتوں سے
پاؤ گے مال و دولت اس کی نصیحتوں سے
پھولو گے اور پھلو گے، ان کی ملامتوں سے
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

تم کو نہیں خبر کچھ اپنے برے بھلے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی، اتنی ہے عقل چھوٹی
ہے بہتری اسی میں جو ہے بڑوں کی مرضی
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو
وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں
اس بات سے بچو تم جس بات پر وہ ٹوکیں
جھُنک جاؤ دوڑ کر تم گر آگ میں وہ جھونکیں
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو
جو دیں تمھیں وہ کھا لو نعمت سمجھ کے اس کو
دیں زہر بھی تو پی لو امرت سمجھ کے اس کو
اور خاک دیں تو لے لو دولت سمجھ کے اس کو
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو
ہے کوئی دن میں پیارو وہ وقت آنے والا
دنیا کی مشکلوں سے تم کو پڑے گا پالا
مانے گا جو بڑوں کی جیتے گا وہ ہی پالا[1]
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

3 مرغی اور اس کے بچے

(ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

شام ہے اور اندھیرے کا وقت ہے پرندوں کے بسیرے کا وقت
اب ہے پانی کی نہ دانے کی تلاش جس کو ہے اپنے ٹھکانے کی تلاش
رات بھر جب کہ گزر جائے گی اور اُجالے کی گھڑی آئے گی
سنیو تم اُٹھ کے اندھیرے سے ذرا یہ جو ہے گھر میں تمھارے مرغا

پھڑپھڑاتا ہے پر و بال کو کیا جھاڑ دیتا ہے وہ سستی گویا
اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں چیختا زور سے ہے ''ککڑوں کوں''
دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی فوج بچوں کی لیے نکلے گی
تاکہ وہ صبح کا کھائیں کھانا رات بھر کے ہیں بے آب و دانہ
چونچ سے دے گی وہ منہ میں ان کے جو پڑے پائے گی دانے دُنکے
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ ہے غذا ان کی یہی روزانہ
مینہ برستا ہے تو بچے سارے آ دبکتے ہیں پروں میں ماں کے
چین سے ان میں چھپے رہتے ہیں ماں کی چھاتی سے لگے رہتے ہیں
مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

4 بلی اور چوہا

(ہیئت: قطعہ، ماخذ: جواہرات حالی)

سچ پوچھیے تو چوہوں کا بھی دم ہے ناک میں دیکھا نا، بلی آ ہی گئی ان کی تاک میں
چوہے ہمیں ستاتے ہیں اور بلیاں انھیں دم اِن سے ان کا، ان سے ہمارا ہے ناک میں
دیکھا تو جا بہ جا سے وہ کترا ہوا ہے آج آیا تھا اک لفافہ بڑا کل کی ڈاک میں
ان کے سوا تھا چور کہو اس کا اور کون؟ تھا شہد کچھ لگا ہوا بوتل کی کاک میں
گر بلیاں نہ ہوں تو بلیں کھود کھود کر چوہے ملا کے چھوڑیں مکانوں کو خاک میں
بلی ادھر ہٹی اورادھر آئے سب نکل وہ ان کی تاک میں ہے تو یہ اس کی تاک میں

5 شیر کا شکار

(ہیئت: مسدس، ماخذ: جواہرات حالی)

سامنے دیکھو ہے وہ جنگل وحشی جانوروں کا دنگل

پھرتے ہیں یاں سب توڑتے کل کل
شیر، بگھیلا، چیتا، چیتل
بعضے بے آزار ہیں ان میں
اور بعضے خوں خوار ہیں ان میں
دیکھنا وہ اک کہری ناہر [2]
نکلا اپنی بنی [3] سے باہر
پکڑے گا ظالم داؤں لگا کر
کوئی نہ کوئی صید مقرر
بھوک میں ہے سب کچھ کھا لیتا
بھیڑوں پہ لیکن جان ہے دیتا
بیٹھ کے ہاتھی پر بے کھٹکے
ہم بھی اب اس کے پیچھے پیچھے
آہستہ آہستہ ہیں چلتے
ہم سے کہاں جائے گا یہ بچ کے
یہ بھی شکاری، ہم بھی شکاری
دید کے قابل ہے یہ سواری
لو دیکھو وہ دبکا دبکا
بھیڑوں کے ریوڑ میں جا پہنچا
شیر اور اس پر بھوک میں جھلا
کر ہی گیا اک بھیڑ کو لقما
ٹوک کے اور للکار کے اس کو
جائیں گے ہم بھی مار کے اس کو
دیکھو دیکھو غل نہ مچاؤ
چھتیا کر بندوق لگاؤ
خوب نشانہ بیٹھا ہے آؤ
گرتے ہی اس کو جا منگواؤ
کھال ہم اس کی لے کے چلیں گے
دوستوں کو سوغات یہ دیں گے

6 پیشے

(ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

(ماں سے بیٹوں کی گفتگو)

1

میں بڑا ہوں گا جب تو اماں جان
اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان
کام جو کرنا چاہو ہے آسان
ہیں یہ آخر کسان بھی انسان
نہیں محنت سے ہوں میں گھبراتا
خالی پھرنا نہیں مجھے بھاتا
ہل چلاؤں گا بیج بوؤں گا
شوق میں کھاؤں گا نہ سوؤں گا

وقت پر جب کہ غلہ کاٹوں گا
بھائیو بہنوں کا حصہ باٹوں گا

اناج سے گھر تمہارا بھر دوں گا
ان سے تم کو نچنت کر دوں گا

چھکڑے بھر بھر کے شہر جاؤں گا
اناج کے بدلے چاندی لاؤں گا

بھس کے انبار یاں لگا دوں گا
گائے بیلوں کو میں چھکا دوں گا

اتنی لایا کروں گا ترکاری
کہ نہ آئے گی پکنے کی باری

الغرض خوب سا کماؤں گا
جو کماؤں گا گھر میں لاؤں گا

کام کوئی نہ پھر رہے گا بند
میں بنا دوں گا تم کو دولت مند

2

میں جواں ہوں گا جب تو اماں جان
اپنے جی میں یہ میں نے لی ہے ٹھان

تم نے مجھ کو اگر اجازت دی
فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

ہے بہت ہی یہ میرے جی میں امنگ
سیکھ لوں میں کہیں قواعدِ جنگ

میں نے سیکھی ہے مدرسوں میں ڈرل
ایسی ہو گی کہاں کی وہ مشکل

گو نہیں ہوں سپاہی زادہ میں
ہوں سپاہی سے پر زیادہ میں

جنگ کی ہے مہم سے کیا ڈرنا
آدمی کو ہے ایک دن مرنا

مشق بندوق کی لگانے کی
رسم ہے آج کل زمانے کی

روزمرہ کا ہے یہ خاصا کھیل
ہوئی تو کیا کبھی کبھی کی جھمیل

کام اپنا کیا کروں گا خوب
فرض اپنا ادا کروں گا خوب

حکم کی وہ کروں گا میں تعمیل
کہ نہ ہو گی ذرا بھی اس میں ڈھیل

کیا عجب ہے رسالدار بنوں
اور سواروں میں شہ سوار بنوں

فوج میں ہو کچھ آبرو میری
ہے یہ مدت سے آرزو میری

ملک میں جبکہ ہو گی میری دھاک
اونچی ہو جائے گی تمھاری ناک

پھر تو تم کو بھی اے مری اماں
سب کہیں گے رسالدار کی ماں

3

میری جاں اور میری اماں جی
میں بڑا ہوں تو چاہتا ہے جی
گھر میں بیٹھا رہوں نہ یوں خالی
آپ کے باغ کا بنوں مالی
خود ہی اس کام سے مجھے ہے لگاؤ
کوئی مجھ کو بتاؤ یا نہ بتاؤ
کیاریاں ہر طرح کی کھودوں گا
خوب ان کی زمیں کو گودوں گا
ایسا رکھوں گا رستہ صاف ان کا
کہیں ڈھونڈا نہ پائے گا تنکا
نت نئے پھول میں اگاؤں گا
دیکھنا کیسے گل کھلاؤں گا
باغ میں اپنے نہر لوں گا میں
سر درختی میں پانی دوں گا میں
جو لگاؤں گا پود جائے گی لگ
او پودے لگاؤں گا سو الگ
موتیا اور چنبیلی اور جوہی
روز کے روز ڈھیروں اترے گی
ہے بہت شوق تم کو پھولوں سے
روز لاؤں گا جھولیاں بھر کے
کیوں نہ آئے گی آئے دن ڈالی
جب خدا اپنے گھر کا دے مالی
کس طرح ہو گی پھر نہ خوش حالی
آپ کا باغ، آپ کا مالی

4

میری تو یہ خوشی ہے اماں جی
کہ بڑا ہو کے میں بنوں دھوبی
صبح اٹھتے ہی ہاتھ اور منہ دھو
فارغ اپنی ضرورتوں سے ہو
روز جایا کروں میں دریا پر
لادی کپڑوں کی بیل پر لے کر
چھوڑ دوں بیل کو وہاں چرنے
اور کام اپنا پھر لگوں کرنے
اونچے کر کر کے دست و بازو میں
کپڑے دھویا کروں چھوا چھو میں
لاؤں دھو دھو کے ایسے میں کپڑے
اُجلے، برّاق، صاف اور ستھرے
برف شرمائے دیکھ کر جن کو
آنکھ میں میل ہو اور ان میں نہ ہو
محنت اس طرح کر کے میں دن بھر
گھاٹ سے آؤں شام کو گھر پر
ٹھیک کر کے کلپ سے کندی سے
مالکوں کو دے آؤں جلدی سے

پھر یوں ہی میلے کپڑے لا لا کر
از سر نو چڑھاؤں بھٹی پر
گھاٹ کی آج، گھر کی کل باری
رہے یہ سلسلہ یوں ہی جاری
الغرض خوب کپڑے دھوؤں گا
نہ چراؤں گا او نہ کھوؤں گا
نہ کبھی کام سے تھکوں گا میں
کام یہ خوب کر سکوں گا میں
کھاؤں گا اور کھلاؤں گا اماں
تم کو میں حق حلال کا لقما

5

جب کہ ہوں گا بڑا تو اے حضرت
لوں گا کوئی پولیس کی میں خدمت
کانسٹبل بنوں گا اول بار
اور پھر رفتہ رفتہ تھانے دار
پھر ہوا سامنے نصیب اگر
کوتوالی کا آئے گا نمبر
گشت کرتا پھروں گا راتوں کو
دیکھتا چوٹّوں کی گھاتوں کو
چور، اُچکے، اُٹھائی گیرے جو
پاؤں گا، باندھ لاؤں گا سب کو
میرے دل پر رہے گا چور کا داغ
جب تک اس کا لگا نہ لوں گا سراغ
بدمعاشوں کو تنگ کر دوں گا
جیل خانوں کو ان سے بھر دوں گا
جو کروں گا تو میں دل و جاں سے
راست بازی سے اور ایماں سے
نہیں کرنے کا تیرا میرا خوف
دل میں رکھوں گا بس خدا کا خوف
ہو گر اس نوکری میں خوف خدا
تو نہیں کام کوئی اس سے بھلا

6

میں بڑا ہوں گا جب کہ بی اماں
ہو سکا تو بنوں گا چٹھی رساں
ڈاک خانے سے ڈاک لاؤں گا
پھُرتی سے جاؤں گا اور آؤں گا
لے کے سب چٹھیوں کا میں طومار
اور لگا کر انھیں محلے دار
بانٹ آیا کروں گا نام بنام
صبح کی صبح اور شام کی شام
کارڈ ہوں یا لفافے یا پیکٹ
پارسل اور سارے پیمفلٹ [4]
لاؤں گا اپنی ذمہ داری سے
اور دوں گا بھی ہوشیاری سے

حقِّ خدمت ادا کروں گا میں　　غفلتوں سے بچا کروں گا میں
کام اپنا کروں گا چستی سے　　نہ کہ مچلائی اور سستی سے
خط کسی کا نہ میں کروں گا تلف　　نہ بنوں گا ملامتوں کا ہدف
کھاؤں گا اور کھلاؤں گا ایسی　　تم کو اماں حلال کی روزی

7

جب کہ اماں جوان ہوں گا میں　　اک بڑھئی مستری بنوں گا میں
نہ بڑھئی وہ، ہے جن کا نام بڑھئی　　جو کہ پھرتے ہیں کہتے 'کام بڑھئی'
بلکہ ایسا بنوں گا کاری گر　　خود غرض مند آئیں جس کے گھر
آرزو یہ میری بر آئے کاش　　دیکھنا پھر میری تراش خراش
میں نہانی[5] سے اور بسولے سے　　ایسے کتروں گا پول اور پتے
کہ کروں گا مصوروں کو مات　　رہوں مات ان کو کر کے تو ہے بات
اس ہنر میں بنوں گا میں استاد　　اور کروں گا نئے نئے ایجاد
لکڑی برتا کروں گا میں نگّر　　آئے، لاگت زیادہ آئے اگر
چیز گھٹیل کبھی نہ بیچوں گا　　نفع سے ایسے ہاتھ کھینچوں گا
میرا سامان ہو گا سب اچھا　　عمدہ سے عمدہ تحفہ سے تحفہ
کارخانہ خود اک بنا لوں گا　　بیسیوں کاریگر بٹھا لوں گا
ہو گی جب ہر طرف مری شہرت　　دیکھنا گاہکوں کی پھر کثرت
مستری ایک ہو اگر ہشیار　　ہر جگہ اس کے مشتری ہیں ہزار

7 گھڑیاں اور گھنٹے

(ہیئت: مسدس، ماخذ: جواہرات حالی)

ہوں جس قدر آفاق میں گھڑیاں ہوں کہ گھنٹے　　ہے سب کا عمل ایک، بڑے یا کہ ہوں چھوٹے
چھوٹے بھی کسی طرح بڑوں سے نہیں ہیٹے　　دراصل یہ سب ایک ہی تھیلی کے ہیں بٹے

گو ایک سے ان کے نہیں ہوتے قد و قامت
طے کرتے ہیں پر سب کے سب اک ساتھ مسافت
دوپہر ہو یا رات ہو یا صبح ہو یا شام   جب دیکھیے چلنے سے سدا اپنے انھیں کام
لیتے کسی ساعت کسی لحظہ نہیں آرام   ہو جاتے اسی میں ہیں بسر عمر کے ایام
نقل و حرکت سے انھیں فرصت نہیں دم بھر
گویا انھیں جانا ہے کہیں دور مہم پر
ہر چند کہ رفتار میں اپنی نہیں مختار   پر ٹھیرنے کو اپنے سمجھتے ہیں یہ بے کار
رہتے ہیں سفر ہی میں، ہو دن یا کہ شبِ تار   ہٹتے نہیں پیچھے قدم ان کے دم رفتار
جب دیکھیے پاتے ہیں بہ سرگرم روانی
عمر گزراں کی کہو ایک ان کو نشانی
دم رکھتے ہیں گو جان نہیں رکھتے بدن میں   گویا ہیں، زباں گرچہ نہیں ان کے دہن میں
عادت میں نرالے ہیں انوکھے ہیں چلن میں   دیکھا یہ انہی کو کہ مسافر ہیں وطن میں
ہے جیسے کہ گردش میں زمانہ سحر و شام
ان کا وہ سفر ہے نہیں جس کا کہیں انجام
خشکی ہو گزرگاہ میں ان کی کہ سمندر   کھاڑی ہو کہ ہو جھیل، جزیرہ ہو کہ بندر
مینار کے اوپر ہوں کہ تہہ خانے کے اندر   رکھے انھیں پاس اپنے سکندر کہ قلندر
ان کو نہیں یہاں اونچ کا یا نیچ کا کچھ غم
اپنی اسی 'ٹک ٹک' سے سروکار ہے ہر دم
کھٹکا انھیں آندھی کا نہ بارش کا خطر کچھ   نقصاں نہیں جاڑے سے نہ گرمی سے ضرر کچھ
طوفان کا کچھ خوف نہ بھونچال کا ڈر کچھ   ہوں لاکھ تغیر، نہیں پر ان کو خبر کچھ
کچھ موسم گل کی نہ خزاں کی انھیں پروا
ہیں دونوں برابر انھیں پچھوا ہو کہ پُروا

سمرن کے کھٹاکے سے کم ان کا نہیں کھٹکا　خاصا ہے یہ اک یادِ خدا کے لیے لٹکا
کوڑا ہے یہ اس کے لیے جو راہ سے بھٹکا　کانٹوں میں دیا دامن دل جس نے کہ اٹکا
دیتے ہیں، سنو غور سے، ہر دم یہ دہائی
لو وقت چلا ہاتھ سے، کچھ کر لو کمائی
کیا ان کی بساط اور کہو کیا ان کی ہے اوقات　جانے دو نہیں ان میں اگر کوئی کرامات
انصاف کرو تو ہے یہی کتنی بڑی بات　جس کام کے ہیں اس میں لگے رہتے ہیں دن رات
ہیں چلنے میں تھکتے نہ ٹھٹکتے نہ مچلتے
جس راہ پہ دو ڈال اسی راہ میں چلتے

8 دھان بونا

(ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

ہوتے ہیں بتاؤ دھان کیوں کر؟　ہم سے سنو آؤ دھیان دے کر
ہے یہ بھی سمجھ لو کام انہی کا　جو کرتے ہیں یاں زمیں کی سیوا
پہلے وہ زمیں پہ ہل چلا کر　اور مٹی تلے کی کر کے اوپر
دیتے ہیں سہاگا پھیر اس پر　کرتے ہیں زمیں کو یہ برابر
پھر دیتے ہیں چھوڑ اس میں پانی　جو دھان کی کاشت کے ہیں گیانی
پانی ہیں جب اس پہ پھیر دیتے　ہیں بیج وہاں بکھیر دیتے
ہے سہل اگرچہ دھان بونا　آسان نہیں پر اس کا ہونا
یہ دھان ہوئے کہ پان اے یار　دونوں کا ہے رکھ رکھاؤ دشوار
بس دھان کو نازک ایسا ہی جان　ہو جیسے کہ دھان پان انسان

9 روٹی کیوں کر میسر آتی ہے

(ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

یہ کھاتے ہو جو تم ہر روز روٹی　بتاؤ کیوں کہ ہے تیار ہوتی

اگر آٹے کی پکتی ہے تو آٹا
بتاؤ ہے کہاں سے روز آتا؟

اگر آٹا یہ گیہوں کا ہے پِستا
تو پھر یہ پیسنا ہے کام کس کا

گیہوں کس طرح ہوتے ہیں میسر؟
اور آتے ہیں کہاں سے اور کیوں کر؟

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر
کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسر

یہی پہنچاتے ہیں بندوں کو روزی
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی[6]

انھی کا کام ہے ہر فصل کی کاشت
انھی کا کام ہے محنت کی برداشت

یہی بو کر بہم پہنچاتے ہیں اناج
ہے اس میں ساری خلقت ان کی محتاج

کسان اکثر ادھر کے اور ادھر کے
گیہوں لے آتے ہیں چھکڑوں میں بھر کے

جو بازاروں میں بنیے ہیں دکان دار
وہ ان چھکڑوں کے ہوتے ہیں خریدار

گیہوں کا بھاؤ اک کر کے مقرر
دکانوں میں وہ اپنی لیتے ہیں بھر

پٹا رہتا ہے سب غلے سے بازار
جدھر دیکھو ادھر غلے کا انبار

گیہوں ہم لوگ لیتے ہیں انھی سے
روپے کے، دو روپے کے، دس روپے کے

تمھارا باپ ہے جو کچھ کماتا
اناج اس کا ہے وہ بھی مول لاتا

تمھاری ماں کو دے دیتا ہے لا کر
وہ ان کو چن پھٹک کر اور بنا کر

خود اپنے ہاتھ سے ہے پیس لیتی
لگا رکھی ہے اس نے گھر میں چکی

اسی چکی کا پیسا تھا وہ آٹا
چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا

وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے
کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے

جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے
عجب بندی خدا کی محنتی ہے

وہ ہے اس ہاتھ سے چکی چلاتی
اور اس سے غلہ پیہم ڈالے جاتی

جب اس کا ہاتھ تھک جاتا ہے دایاں
بدل لیتی ہے تب وہ ہاتھ بایاں

کبھی گھبرا کے دل ہی دل میں اپنے
خدا کا نام وہ لگتی ہے جپنے

کبھی دل کو خدا سے لو لگا کر
تسلی دیتی ہے وہ گیت گا کر

جب آٹا پیس چکتی ہے تو گویا
سمجھتی ہے بڑا گڑھ میں نے جیتا

پھر آٹا چھان کر بھوسی جدا کر اسے بھرتی ہے مٹکے میں اٹھا کر
لگی پھر گوندھنے آٹا جھپا جھپ اور اس میں مارنے مُکّی شپاشپ
وہ یوں آٹے کو ہے دیتی ٹھپکتی کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی
جب آٹا گوندھ چکتی ہے تو لے کر توا، دیتی ہے رکھ چولھے کے اوپر
بناتی ہے گندھے آٹے کے پیڑے کہ ہو جس طرح سے جلدی نبیڑے
وہ جھپ جھپ پھر پکا لیتی ہے روٹی چپاتی خواہ ہلکی خواہ موٹی
ذرا دیکھو تو کوئی اس کی پھرتی توے پر دم میں ڈالی اور الٹی
پکا کر، ریندھ کر، کھا کر، کھلا کر ہوئے جھوٹے جو باسن، دھو دھلا کر
لیا کچھ اور گھر کا کام دھندا یہی ہے اس کا صبح و شام دھندا
کبھی ایندھن نہیں ہوتا میسر تو لے کر وہ طباق آٹے کا سر پر
پہنچتی ہے بچاری سیدھی تندور[7] نہیں جو اس کے گھر سے کچھ بہت دور
وہ بھٹیارا جو ہے تندور والا سب آٹا اس سے پکواتے ہیں لالا
لگا رہتا ہے صبح و شام تانتا اک آتا ہے دکاں پر ایک جاتا
وہ باندھے بیٹھا رہتا ہے لنگوٹی لگاتا ہے بہت پھرتی سے روٹی
گھڑی، ہاتھوں پہ پھیلائی، بڑھائی رفیدے[8] پر دھری اور چٹ لگائی
دکھاتا ہے وہ یوں ہاتھوں کے انداز کہ جیسے کوئی پھرتیلا پٹے باز
وہ ہے یوں پیٹتا پیڑوں کو پیہم کہ گویا ٹھونکتا ہے پہلواں خم
اترتی روٹیاں ہیں باری باری وہ گرما گرم سوندھی اور کراری
اتر سب روٹیاں جب آئیں پک کر تو دسترخوان سے لاتی ہے ڈھک کر
ادھر تم ساری بہنیں اور بھائی ہو اس دھن میں کہ آئی ماں اب آئی
تکا کرتے ہو بھوکے راہ ماں کی سمجھتے کچھ نہیں پر چاہ ماں کی
وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت نہیں ملتی اسے سونے کی فرصت
یہی رہتا ہے دن رات اس کو رونا پکانا، ریندھنا، سینا، پرونا
رُندھی رہتی ہے تم بچوں میں دن رات کرے بھی تو کسی سے کیا کرے بات

نہ ہوش اچھے کا اس کو اور برے کا
نہ ہڈرا پہننے اور اوڑھنے کا

کہیں پڑ رہنا، فارغ جب کہ ہونا
کوئی سونے میں داخل ہے یہ سونا؟

ڈھلا دن اور چڑھا سر کھانے کا فکر
تمھارے باپ کے گھر آنے کا فکر

سویرے کا وہ نکلا نکلا گھر سے
پھرے گا شام کو جب کام پر سے

تو اس کو دیکھتے ہی آپ سے آپ
بڑے اور چھوٹے ہو جائیں گے چپ چاپ

قدم رکھے گا جوں ہی گھر کے اندر
سنبھل بیٹھو گے تم سب اس سے ڈر کر

اور اماں چھوڑ کر پھر سوئی تاگا
لگے گی لینے اس کی آگا تاگا

وہ ستانے نہیں پاتا کہ لا کے
بچھا دیتی ہے دسترخوان آگے

گھڑی تم کو کھڑی جھلتی ہے پنکھا
گھڑی پانی پلاتی ہے وہ لا لا

دیے جاتی ہے تم سب کو وہ سالن
رہے اپنے لیے گو کچھ نہ لاون[9]

جو بچ رہتی ہے پیچھے ہڈی بوٹی
لگا کر اس سے کھا لیتی ہے روٹی

اسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب
نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہے مطلب

اگر کھانے میں آئی تم کو لذت
تو سمجھو لگ گئی نیگ اس کی محنت

نہ پکّا گر مزے کا تو نگوڑی
ہوئی جاتی ہے دل میں تھوڑی تھوڑی

بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے؟
نہ کھائے آپ اور تم کو کھلائے

تمھیں کیا فکر ان جھگڑوں کا بھائی
کہ ملتی ہے تمھیں پکی پکائی

پکانے سے نہ پکوانے سے مطلب
اگر ہے تم کو تو کھانے سے مطلب

ذرا سی دیر کھانے میں اگر ہو
تو تم رو رو کے گھر سر پر اٹھا لو

نہ الفت باپ کی تم جانتے ہو
نہ ماں کی مامتا پہچانتے ہو

نہ ان کی محنتوں کی ہے خبر کچھ
نہ ان کی جاں فشانی پر نظر کچھ

نہیں کر سکتے حق ان کا ادا تم
کرو ان پر سے گر جاں بھی فدا تم

دل و جاں سے کرو تم ان کی عظمت
بجا لاؤ ادب سے ان کی خدمت

سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت
کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت

تمھیں محنت سے پالا اور پوسا ستایا تم نے پر اس نے نہ کوسا
سبق ماں باپ سے یہ سیکھ رکھو بڑے ہو کر یہی کرنا ہے تم کو
مزا جب ہے کہ ہاتھ ان کا بٹاؤ بڑے ہو کر تم ان کے کام آؤ
کبھی ہونا نہ تم سست اور کاہل لگانا اپنے اپنے کام میں دل
نہ ڈھیلی چھوڑنا تم اپنی ڈوری سمجھنا جی چرانے کو بھی چوری

10 موچی

(ہیئت: مخمس، ماخذ: جواہرات حالی)

چمڑا مول منگاتا ہوں دھو کے اسے سکھاتا ہوں
مل کے نرم بناتا ہوں یوں چمڑے کو کماتا ہوں
میں موچی کہلاتا ہوں

پُنّے وَنّے کاٹ کٹا کرتا ہوں خوب ان کو صفا
پھر لے پنا اور تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
یوں کام اپنا بناتا ہوں

پھر جوتی قالب پہ چڑھا ٹھوک ٹھکا اور کوٹ کٹا
رانپی 0 1ـ سے بُرشا کے تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
پھر کام اور لگاتا ہوں

چاہیے گر اندھا گھوڑا میری دکاں کا لو جوڑا
پھر درکار نہیں کوڑا جتنا چلاؤ ہے تھوڑا
مضبوط ایسا بناتا ہوں

اوروں کی سی یاں نہیں لوٹ جانیو میری بات نہ جھوٹ
سال کے اندر میرا بوٹ میں ضامن جو جائے ٹوٹ
اس کی شرط لگاتا ہوں

بابو ہو یا ہو لالہ گورا ہو یا ہو کالا
بوڑھا ہو یا ہو بالا ادنیٰ ہو یا ہو اعلیٰ
سب کا حکم بجاتا ہوں

11 چٹھی رساں

(ہیئت: قطعہ، ماخذ: جواہرات حالی)

لو وہ دیکھو آ رہا ہے ڈاکیا منتظر تھا جس کا ہر چھوٹا بڑا
ہے اسی جانب کو سیدھا اس کا رخ خط تمھارا ہو گا یا شاید مرا
پوچھتا ہے اس سے ہر اک اپنا خط نام بتلاتا ہے اپنا اور پتا
دیکھتا ہے وہ لفافہ غور سے دیتا ہے پڑھ پڑھ کے، ہے لکھا پڑھا
یہ تو بتلاؤ خطوں کا اتنا ڈھیر اس کو کیوں کر اور کہاں سے مل گیا؟
دیکھتے ہو روز کیفیت یہ تم پر نہیں رکھتے خبر اس کی ذرا
رات کو سوتے تھے جب ہم، ایک شخص جا رہا تھا اس طرف سے دوڑتا
تھے کمر سے اس کی کچھ گھنگھرو بندھے تا کہ سب جانیں کہ ہے یہ ڈاکیا
ہر قدم پر دوڑتا تھا جب کہ وہ گھنگھروؤں کی اس کے آتی تھی صدا
کہتے ہیں ہرکارہ جس کو تھا وہی تم نے بھی یہ نام شاید ہو سنا
وہ چلا تھا لے کے ڈاک اس شہر کی آ کے دم یاں ڈاک خانے میں لیا
تھیلیاں تھیں ایک تھیلے میں کئی جن سے تھا وہ ڈاک کا تھیلا بھرا
تھیلیوں میں تھے بھرے پیکٹ تمام تھا کوئی دھولا تو کوئی زرد تھا
تھا غرض جو بوجھ اس کے پاس سب ڈاک منشی کے حوالے کر دیا
شام تک اب اس کو ہوش آئے تو آئے وہ تو ایسا ہو کے بے دم جا پڑا
اور ادھر وہ تھیلیاں جھٹ پٹ سنبھال ڈاک منشی نے سنو اب کیا کیا

کھول کر سب کر لیے پیکٹ الگ
اور خط بھی رکھ لیے کر کے جدا
بانٹنے کو ڈاک پھر دے دی تمام
ڈاک کے چٹھی رسانوں کو بلا
ڈاک میں میرا بھی اک آیا ہے خط
اوہو! یہ تو خط ہے میرے دوست کا
پڑھ کے خط تو ہو گی جو ہو گی خوشی
پہلے آنکھوں سے تو لوں اس کو لگا
دوست کے پاس آئے نامہ دوست کا
اس خوشی سے ہے زیادہ اور کیا
اب پڑھوں گا جا کے اطمینان سے
گھر میں اپنے بیٹھ کر سب سے جدا

12 سپاہی

(ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

سنا بھی یہ آواز کیا آ رہی ہے؟
بگل کی برابر صدا آ رہی ہے
چلو اٹھو بندوق کندھے پہ رکھو
کہ وقت آ گیا دور جانا ہے تم کو
ہلے ہاتھ ہرگز تمھارا، نہ شانہ
جہاں چاہو واں جا کے بیٹھے نشانہ
نظر چاہیے تیز ایسی تمھاری
ہو گویا کہ اس وقت تم اک شکاری
قدم ہو جنچا ایسا جیسے ہرن کا
سمجھ لو کہ ہے بس یہی وقت رن کا
کبھی فتح مندی کا دعویٰ نہ کیجیے
کہ چلتے نہیں اس میں دعوے کسی کے
جو ذکر ایسی باتوں کا کرتے ہیں اکثر
ظفر مند انھیں ہوتے دیکھا ہے کم تر
بڑی بات یہ ہے تم اس کو سمجھ لو
کہ فرض اپنا جو ہے بجا لاؤ اس کو

13 ایک چھوٹی بچی کے خصائل[11]

(ہیئت: مثنوی، ماخذ: جواہرات حالی)

سیّدہ کیسی پیاری بچی ہے
صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ذرا دیکھو تو اس کی صورت کو
سچی چینی کی جیسی مورت ہو
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان
پر سب اچھے برے کی ہے پہچان

ماں نے جو کچھ اسے سکھایا ہے   جو ادب قاعدہ بتایا ہے
وہ سبق سارے اس کو ہیں ازبر   نقش ایک ایک بات ہے دل پر
ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام   سب کو کرتی ہے ہاتھ اُٹھا کے سلام
پھر ادب سے وہیں سلام کے ساتھ   پوچھتی ہے مزاج جوڑ کے ہاتھ
جھوٹ موٹ اس کو گر ڈراتے ہیں   بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
پکے پن سے یقیں نہیں کرتی   دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی
وہ کسی بات پر مچلتی نہیں   اپنی عادت کبھی بدلتی نہیں
ایک بیماری سے تو ہے لاچار   ورنہ روتی نہیں کبھی زنہار
اسی کم عمر بے سمجھ ہو کر   دودھ بھی مانگتی نہیں رو کر
بے پیے دودھ جب نہیں سرتی   ہے وہ ماں کی خوشامدیں کرتی
کبھی کہتی ہے پیار سے ’اماں!‘   اور کبھی ڈالتی ہے گل بیّاں
کوٹ کوٹ اس میں ہے بھری غیرت   اس کو کوئی گھرک دے کیا طاقت
ماں نے جھوٹوں کبھی جو گھور دیا   اس نے سچ مُچ وہیں بسور دیا
ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی   اس کے تیور ہے دیکھتی رہتی
جب ذرا دیکھتی ہے چپ ماں کو   بار بار اس کو کہتی ہے ’بولو!‘
ماں یہ سن کر اگر ذرا ہنس دی   پھر کوئی دیکھے اس کی آ کے خوشی
ہنستی ہے اور کھِل کھلاتی ہے   بچی پھولی نہیں سماتی ہے
چاہنے والے اس کے ہیں جو جو   خوب پہچانتی ہے ایک اک کو
پھوپھیوں سے تو ہے لگاؤ بہت   گھر کا خالاؤں کے ہے چاؤ بہت
ہے چچاؤں کے نام کی عاشق   ان کے کلمے کلام کی عاشق
غور سے ان کا پڑھنا سنتی ہے   اور سن سن کے سر کو دھنتی ہے
ختم ہو چکتے ہیں جب ان کے بول   کہتی ہے بار بار ’ابا اول‘

آرزو تو بہت ہے بولنے کی
پر نہیں اٹھتی ہے زبان ابھی
یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زباں
جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوں غاں
پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار
ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول
بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب
زرگری اپنی بولتی ہے جب
نئے آتے ہیں گھر میں جب مہماں
دیکھ دیکھ ان کو ہوتی ہے خنداں
پا کے بیٹھا ادھر ادھر سب کو
دیکھتی ہے مڑ مڑ سب کو
اوپری شکل سے ہے گھبراتی
ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی
ہیں جو ماں جائے بھائی اور بہن
یوں تو ہے سب کی اس کے دل میں لگن
پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو
کیوں کہ اوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا
اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹتی ہے دوڑ کے ماں سے
بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے
عمر اس کی خدا دراز کرے
علم سے اس کو سرفراز کرے
چڑھیں ماں باپ کی سلامتی میں
سارے پروان بھائی اور بہنیں

14 نیک بنو، نیکی پھیلاؤ[12]

(ہیئت: مسدس، ماخذ: بچوں کا اخبار)

سچ بولو سچے کہلاؤ
سچ کی سب کو ریس دلاؤ
جب اوروں کو راہ بتاؤ
خود رستے پر تم آ جاؤ
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

ہو گی تم میں گر ستھرائی　　سب سیکھیں گے تم سے صفائی
ہمسائے کی دیکھ بھلائی　　چھوڑتے ہیں ہمسائے برائی
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ
ہے جس گھر میں ایک بھی اچھا　　واں نہ رہے گا نام برے کا
تم بھی چلن دکھلاؤ کچھ ایسا　　جس سے ہو سارے جگ میں اجالا
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ
گاؤں میں آیا ایک جواری　　اس نے بگاڑی بستی ساری
کام میں عزت ہو یا خواری　　لوگ کریں گے رِیس تمھاری
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ
جو پڑھنے میں کرتے ہیں محنت　　سیکھتی ہے شوق ان سے جماعت
ہوتی ہے جن کو کھیل کی عادت　　دیتے ہیں سب کو کھیل کی رغبت
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ
محنت کر کے جو ہیں کماتے　　سب کو محنت وہ ہیں سکھاتے
جو نہیں ہاتھ اور پاؤں ہلاتے　　سب کو اپاہج وہ ہیں بناتے
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ
رحم ہے سب کو رحم سکھاتا　　ظلم ہے سب کو ظلم سجھاتا
نیک ہے نیکی سب کو بتاتا　　بد اوروں کو بد ہے بناتا
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

حواشی

1 جواہرات حالی (صفحہ 3) 'جیتے گا وہی پالا' درج ہے۔ 'وہی پالا' مفاعیلن کا ہم وزن ہے۔ یہ نظم، بحر مضارع مثمن اخرب میں ہے جس کا آخری رکن ''فاعلاتن' ہے۔

2 کہری ناہر: نہایت زبردست شیر (ناہر ہندی میں شیر کو کہتے ہیں)۔ (بحوالہ Platts)

3 'بنی': بن کی تصغیر کے طور پر یہ لفظ چھوٹے جنگل یا کچھار کے معنی میں، کہیں کہیں مستعمل ہے۔

4 پیمفلٹ: رسالہ، کتابچہ (Pamphlet)

5 نہانی: کاٹنے اور چھیلنے کا ایک اوزار

6 مودی: غلے کا سوداگر، بنیا، بقال

7 تنور کو عام بول چال کے مطابق 'تندور' باندھا گیا ہے۔

8 رفیدہ: گول گدی جس پر روٹی رکھ کر تنور میں لگاتے ہیں۔

9 لاون: کوئی چیز جو ذائقے کے لیے سالن کے طور پر استعمال ہو۔

10 ایک اوزار جس سے موچی چمڑے کو تراشتے اور صاف کرتے ہیں۔

11 ''ممتاز فاطمہ عرف 'سیدہ خاتون' جو آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی بچی ہے، اس سے مولانا کو بہت محبت تھی۔ مولانا نے اس پر 1909 میں جب کہ سیدہ کی عمر ڈھائی سال کی تھی، یہ نظم لکھی تھی۔''

(جواہرات حالی، ص19)

12 یہ نظم اب تک کلام حالی کے کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی۔ 'بچوں کا اخبار' لاہور، شمارہ ماہ جولائی 1905 میں یہ نظم 'ریس' کے عنوان سے چھپی تھی، اس پرچے سے یہاں نقل کی گئی ہے۔ (ص1)

باب پنجم

تراجم

زمزمۂ قیصری کا مختصر تعارف

مسدس مدوجزر اسلام کی تصنیف سے ایک سال قبل حالی نے 1878 میں زمزمہ قیصری کے زیرعنوان 35 بند کا ترکیب بند لکھا جس کے ہر بند میں سات شعر ہیں۔اس دوسو پینتالیس اشعار کی طولانی نظم کا ترجمہ حالی نے انگریزی نظم سے کیا جس کے بارے میں ہم یہاں خود حالی کی توضیحاتی تحریر پیش کرتے ہیں۔حالی لکھتے ہیں:

یہ نظم ایک انگریزی پویم کے تین حصوں میں سے اول حصے کا منظوم ترجمہ ہے۔شاید مسٹر ایسٹوک اس کے مصنف ہیں جنھوں نے کرنل ڈیوس کے توسط سے، جب کہ وہ دہلی میں کمشنر تھے،اس تمام پویم کو دلی کے چند لائق آدمیوں سے فارسی میں نظم کرا کر ولایت میں بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے۔فارسی نظم لکھے جانے سے پہلے صاحب کمشنر نے یہ پویم اردو میں ترجمہ کرا کر نظم کرنے کے لیے میرے پاس بھیجی تھی۔میں ان کے حکم سے صرف پہلے حصے کو اردو میں کرنے پایا تھا کہ مصنف نے فارسی میں نظم کرانا چاہا۔میں نے بہ سبب علالت کے فارسی نظم سرانجام کرنے سے اپنی معذوری بیان کی اور یہ کام اوروں کے سپرد ہو گیا۔اس نظم کے تین حصے ہیں۔پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذکر ہے۔دوسرے اور تیسرے حصے میں تمام رئیسوں کا، جو دربار قیصری میں شریک ہوئے تھے،عموماً اور حضور نظام کا خصوصاً تذکرہ ہے۔مصنف نے پہلے حصے میں بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ناظرین اس کو دیکھ کر مجھ سے خوش یا ناراض نہ ہوں۔میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں نے ان خیالات کو ایک

ایسی زبان میں نظم کر دیا ہے جس کو میرے ہم وطن سمجھ سکتے ہیں۔اس نظم میں جہاں کہیں ضرورت نے مجبور کیا ہے، اپنی طرف سے بھی کوئی بات اضافہ کر دی ہے اور اکثر تمیز کے لیے اس کو بریکٹ میں محدود کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ ممکن ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی کہیں کہیں کچھ اختلاف پایا جائے۔لیکن جو لوگ انگریزی پوئیٹکل خیالات کو اردو نظم میں بیان کرنے کی دقتوں سے بخوبی واقف ہیں ان سے اُمید ہے کہ ایسی خفیف فروگزاشتوں سے چشم پوشی فرمائیں گے۔

حالی نے اپنی زندگی میں اس نظم کو اہمیت نہیں دی اور نہ حالی کے ہم عصروں یا بعد میں آنے والے حالی شناسوں نے اس نظم کا تجزیہ کر کے اس کا حق ادا کیا۔ یہ سچ ہے کہ اس ترکیب بند کا مطلب اور متن انگریزی شاعر ایسٹوک کا ہے لیکن اس نظم پر لکھا گیا بسیط حاشیہ اور شاہکار ترجمہ تو حالی کا ہے جو صاف سلیس اور رواں دواں ہے جو عام طور پر ترجمہ کرتے ہوئے باقی نہیں رہتا۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں کوشش کے باوجود انگریزی پویم یا اس کا فارسی مطبوعہ ترجمہ دستیاب نہ ہو سکا لیکن حالی کے تشریحی حاشیے سے یہ پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ایمانداری سے ترجمہ کر کے جن مطالب سے وہ متفق نہ تھے حاشیے میں اظہار کیا ہے۔

ہم یہاں اجمالی طور پر اس ترکیب بند پر اس لیے بھی گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ یہ طویل ترجمہ محنت اور مشکل پسندی سے ہوا ہے۔ یہ ترکیب بند فن اور شعریت کے لحاظ سے حالی کی کئی نظموں مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں، قطعوں اور غزلوں سے بلند ہے۔

حالی نے اگر نظم میں کہیں مطلب اپنی طرف سے شعر کی تکمیل یا بند کی تشکیل کے لیے رکھا تو اس کو ظاہر کرنے کے لیے بریکٹ کے اندر لکھا۔

نظم کے آغاز میں کشور ہندوستان کو حصار عافیت کہنا اور اسے سارا جہان کہہ کر اس کے نقشے کو یوں بیان کرنا کہ مضمون بھی ادا ہو جائے اور شعری نقش نگار بھی دل لبھائے آسان کام نہیں۔

اے حصار عافیت اے کشور ہندوستاں — زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے تری دیوار کو — موج زن ہے ایک جانب تیرے، بحر بے کراں

بلندی اور پستی، شور اور خموشی کا سماں دیکھیے۔صنعت تضاد متن اور الفاظ سے یہ شعر بنے ہیں۔

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا — ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں
بحر میں ہوتا ہے اک شور قیامت آشکار — جب کہ اس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں

شاعر نے ہندوستان پر اسکندر اعظم اور یونان کے بادشاہ مینڈر کے حملوں اور فتوحات کا ذکر کر کے ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملے کو بیان کیا جس کا ترجمہ حالی یوں کرتے ہیں۔

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند جانب ہندوستاں محمود نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابر رحمت تھا مگر ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند
روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری صلح سے بجھتا نہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند
خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پر رحم غارت و تاراج تھا اک بازی سلطاں پسند
جب وہ آیا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک جب گیا یاں سے تو مثل دشتِ ویراں تھا یہ ملک

حالی ان اشعار پر احتجاج اور اعتراض نثر کی صورت میں حاشیے میں کرتے ہیں۔

انگریزی مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور افروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے تھے۔ جس طرح اس بند میں محمود کی بے رحمی اور ظلم کا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ایک انگریز نے اس کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے۔ (نظم)

اے ملک زرنگار قدم ہے وہ کون سا حملے سے جس کے ہے ترے ارکاں میں زلزلہ
وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں
ٹھاکر اور ان کے مندر، راجا اور ان کے تخت حملے سے اس کے آ کے پڑا سب پہ وقت سخت
پتلا غضب کا کون سا وہ ہولناک ہے؟ اے ملک زرنگار وہ غزنی کی خاک ہے
آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں پھرتے ہیں بکھرے تاج بہت اس کی راہ میں
کتے جو اس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار ان کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار
بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر
کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

اگرچہ ان دونوں شاعروں نے محمود کے تشدد کو بہت مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ان کے بعض بادشاہوں کی ظالمانہ کارروائیاں، گو وہ کیسی ہی تاریکی اور وحشت کے زمانے میں کی گئی ہوں، ہمیشہ باعث شرم وندامت رہیں گی۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں

کہ آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبے سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ یورپ کی شائستہ قومیں، جو آج اپنے سوا تمام دنیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہیں، محمود کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد کئی صدیوں ایشیا سے بہ مراتب زیادہ وحشت وخوں ریزی و بے رحمی میں مبتلا تھیں اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بنی نوع انسان کی دو خصلتیں نہ کبھی بدلی ہیں، نہ آئندہ بدلنے کی امید ہے: ایک طمع اور خود غرضی، دوسرے زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا اور پیسنا۔ جس طرح مگرمچھ مچھلیوں اور مینڈکوں کو یا شیر اور چیتا ہرن اور نیل گائے کو نوش جان کرتا ہے، اسی طرح جو انسان قوی اور زبردست ہیں، وہ ضعیف اور کم زور انسانوں کے شکار کرنے سے کبھی درگزر نہیں کرتے۔ سولہویں صدی کو جس میں اہل یورپ، امریکہ میں جا کر آباد ہوئے، کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا۔

اس صدی میں یورپ کی بعض قوموں کے ہاتھ سے امریکہ کے اصلی باشندوں پر کون سا ظلم اور کون سی بے رحمی ہے جو روا نہیں رکھی گئی۔ میکسیکو اور پیرو جو کہ امریکا کے دو شائستہ ملک تھے، وہاں کے مفتوحین پر جو وحشیانہ ظلم ہسپانیہ والوں نے کیے، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ کورٹیز جو کہ ہسپانیہ کا رہنے والا اور میکسیکو کا فاتح تھا، اس نے اور اس کے بعد نئے وارد ہونے والے جرنیلوں نے یہ ٹھان لی کہ میکسیکو کو مکمل طور پر ویران کر دیجیے اور وہاں ہسپانیہ کی ایک کالونی آباد کیجیے۔ چنانچہ جہاں تک ان سے ہو سکا، وہاں کے قدیم باشندوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ کورٹیز نے میکسیکو کے شاہنشاہ مونٹی زوما کو گرفتار کر کے الٹا لٹکا دیا اور اس کی رعایا کو اس کی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کرایا۔

یہ ہسپانیہ کے وہی مقدس اور بے عیب عیسائی تھے جنھوں نے ''کافروں''، یعنی مسلمانوں کو غنڈے اور ایک ناپاک اور گنہ گار قوم ہونے کا الزام لگا کر نکالا تھا اور جن کا قول تھا کہ ظالم اور بددین مسلمان اس لائق نہیں ہیں کہ فرشتہ صفت عیسائیوں کے ہم سایہ اور ہم وطن ہو کر رہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ایک ملین بنی آدم ان مقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی عقوبت اور سختی کے ساتھ مارے اور جلائے گئے۔ یہی حال کچھ دنوں بعد پیرو کا ہوا۔

ہماری نظر میں انگریز شاعر نے سکے کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ ہر دہی بیچنے والی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دہی کو میٹھا کہے چنانچہ اگر انگریز شاعر انگلستان کی مدح سرائی اور مسیحیت کی

تبلیغ کر رہا ہے تو آتش زیرپا ہونے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں کہ بعض اسلامی حکمرانوں نے اسلام کے اصولوں اور حضور اکرمؐ کے فرمودات پر عمل نہیں کیا۔

شاعر پوچھتا ہے۔

آخر اے دانا حکیمو کچھ سبب اس کا بتاؤ　　ہے بنی آدم کو کیوں قتل بنی آدم کا چاؤ
کیا یہ زیبا ہے کہ دین حق کو اے ابنائے جنس　　زور سے منواؤ تم اور ندیاں خون کی بہاؤ
یا یہ بہتر ہے کہ سچی دوستی اور پیار سے　　دل کرو اہل جہاں کے پہلے تسخیر اور پھر
حکم پھیلاؤ خدا کے اور یقین ان پر دلاؤ

اس کے ترجمہ میں اکبر اعظم کی تعریف ہوتی ہے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب انگریز شاعر نے جو بتایا وہ حالی کی زبان سے آشکار ہے۔ اس ترجمہ کا حسن یہ بھی ہے کہ نظم ترجمانی نہیں تصنیف کی طرح دلکش ہے۔ اشعار کا تسلسل مضمون کو اتنا صاف بیان کر رہا ہے کہ کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہِ نام دار　　صلح کل جس کی زمانے میں رہے گی یادگار
بسکہ آزادی بنی نوع بشر کو تو نے دی　　رائے پر ہر شخص کی ٹھہرا عقیدے کا مدار
پر تری اولاد نے کی پیروی تیری نہ حیف　　ہو گیا ان کا تعصب خود گلے کا ان کے ہار
ثمرہ آخر مل گیا ان کے تعصب کا انھیں　　کر گیا رحلت جہاں سے جلد ان کا اقتدار

یہاں اورنگ زیب عالم گیر کی طرف اشارہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دوران ہندوستان میں مرہٹے، سادات اور افغان وغیرہ کے اقتدار اور خانہ جنگی کے مسائل رہے۔ اس کے بعد انگریز شاعر نے اپنی نظم میں انگریز قوم کی ہندوستان میں آمد کو اس ملک کی نجات بتایا۔

ڈوبنے کے جب نظر آنے لگے آثار سے
آ کے انگلستان نے طوفاں کو للکارا کے بس
ہند کو اپنوں نے دی آ کر نجات اغیار سے

یہاں اپنوں سے مراد انگریز اور اغیار سے مراد مسلمان ہیں۔

اس نظم میں مہابھارت کے اساطیری واقعات کو نظمایا گیا ہے جہاں سمندر کے بلونا سے امرت برآمد کیا گیا۔

اہل انگلستان کا آنا سمندر پار سے ہے سمندر کا بلونا فی المثل اے محترم
زندگی جو اس سے اہل ہند کو حاصل ہوئی ہے وہ امرت جو کہ پہنچا ہے سمندر سے بہم

راجا اشوک کی لاٹوں پر کندہ قوانین کا ذکر کر کے پھر انگلستانی اور ملکہ انگلستان کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

راج پر راجا اشوکا کے ہیں وہ لاٹیں گواہ ہے ہویدا ان سے اس کے وسعت تمکین وجاہ
ہم نے یہ مانا کہ پتھر پر ہیں جو کندہ حروف وہ رہیں گے منقش اس پر ہزاروں سال و ماہ
نام ہے وکٹوریا کا ان سے بڑھ کر پائیدار نقش ہر اک صفحۂ دل پر ہے جس کا استوار

اس ترکیب بند میں زیادہ تر بند انگلستان کی تاریخ، فتوحات، دولت وعظمت کے بارے میں ہیں۔ ملکہ اور شاہزادوں کا ذکر احترام اور احتشام سے کیا گیا ہے جو یقیناً اس نظم کی زیب داستان معلوم ہوتا ہے۔ انگریز شاعر کو ہندوستان کی خاک سے محبت ہے اور اس کے مناظر قدرتی اور ذرائع معدنی سے الفت ہے لیکن ہندوستانی عوام کے مسائل سے دلچسپی نہیں وہ قحط سالی کو قدرت کا آبادی کم کرنے کا نظام سمجھتا ہے۔

کچھ نہیں تو قحط کا دور سلامت چاہیے بڑھنے پائے گا نہ آدم زاد کا حد سے شمار

اس نظم کو ہم کشمیر کی خوبصورت منظر کشی پر تمام کرتے ہیں۔ حالی نے تین بندوں میں خوب صورت منظر نگاری کر کے کشمیر پر لکھے گئے عمدہ ترین اشعار میں شامل کر دیا ہے۔ کشمیر پر چند مصرعے اور شعر سنیے اور حالی کے فن کی داد دیجیے۔

ہے کوئی وادی جہاں میں ہمسر کشمیر آج شہر ہے جو مرکز کشمیر مانند طلسم
طرفہ کیفیت سے ہے لہروں میں ڈل کی جلوہ گر دیکھتے ہیں آب صافی میں جب اس کا انعکاس
دوسرا وینس کا نقشہ صاف آتا ہے نظر باغ شالیمار جو رونق فزا ہے اس کے پاس
ہے وہ اک نیرنگ قدرت کا تماشا سربسر چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی
جا بہ جا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار
جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں

1 ترکیب بند موسوم بہ زمزمۂ قیصری

(سنہ تصنیف: 1878، ہیئت: ترکیب بند، ماخذ: مجموعہ نظم حالی)

1

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستاں — زیب دیتا ہے، اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے ترے دیوارِ کوہ — موج زن ہے ایک جانب تیرے بحرِ بے کراں
چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا — ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں
بحر میں ہوتا ہے اک شورِ قیامت آشکار — جب کہ اس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں
خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ ہے اندر کا فکر — (دستِ گل چیں نارسا و نخلِ دولت گل فشاں)
تو نے فارغ کر دیا ہے فتحِ ملک غیر سے — پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیرا نشاں
چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوش گوار — (ہو نہ اب کہہ دو خزاں سے رخنہ اندازِ بہار)

2

اے مقدس آریہ ورتھ! آئی کیا تجھ پر بلا؟ — جس نے بزمِ یک دلی کو تیری برہم کر دیا
کوچ کر جاتا نہ تجھ سے گر وفاق اور اتحاد — کون تھا جو تیری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا
تو کہاں اور اہلِ مغرب کے بھلا حملے کہاں — ہاں مگر نااتفاقی کی ملی تجھ کو سزا
گر تری اولاد میں ہوتا سلوک اور آشتی — لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگامِ وغا
گھاٹیوں میں آ کے جب ہوتی فراہم تیری فوج — ہوش کھو دیتی سُمِ اسپانِ ہندی کی صدا
بھاگنا بھی دشمنوں کو واں سے ہو جاتا محال — دیکھتے جب ہر طرف سے آمدِ سیلِ بلا
یا اطاعت کرتے اور لڑنے سے باز آتے وہیں — یا (اگر کرتے بہت ہمت تو) مر جاتے وہیں

3

ہند کا حق تھا کہ ہوتی مہر و الفت کی زمیں
قوم کے ہم درد ہوتے اس مکاں کے سب مکیں

حیف جس مٹی سے اگنا چاہیے تھا نخلِ مہر
جم گیا آب و ہوائے دہر سے واں تخمِ کیں

سربسر تختے گلِ خودرو کے جس جنگل میں تھے
(غور سے دیکھا تو) پنہاں تھے درندے بھی وہیں

(امن قائم تھا طلوعِ صبح کے آغاز میں
(جتنا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا عزلت گزیں)[1]

دیوتا جو آریا کے زعم میں فانی نہ تھے
فانیوں کی طرح یاں آکر رہے وہ بالیقیں

جنگ وخوں ریزی کے خود آکر ہوئے وہ رہ نما
ورنہ فتنے کا قدم تک یاں نہ آیا تھا کہیں

یک بہ یک آیا خلل امن واماں میں ہر طرف
اک تزلزل پڑ گیا ہندوستان میں ہر طرف

4

مرحبا اے خطۂ ہندوستان (صد مرحبا!)
اس خرابی پر بھی روکے تو نے حملے بارہا

جانتا ہے اک جہاں اسکندرِ اعظم کا نام
چشمۂ حیواں پہ جس کو لے گیا بخت رسا

تھا جہاں خوف اور سناٹا بشر کا سدِ راہ
اور نیچر کے طلسموں میں خلل آیا نہ تھا

گھرے اور تاریک غاروں میں تھا آبِ زندگی
سایہ ہیبت تھا جن پر سربسر چھایا ہوا

گو ہوئی اس کی رسائی چشمۂ حیواں تلک
پر نہ ہرگز تیرے سارے مرحلے طے کر سکا

جی میں جو حسرت تھی وہ آخر نہ نکلی زینہار
(دل میں جو ارمان تھا وہ دل کا دل ہی میں رہا)

دقتوں نے فتح کی بے طرح گھبرایا اسے
کام ہی مشکل تھا یا مشکل نظر آیا اسے

5

جس جگہ ملتا ہے ستلج سے سبک رفتار بیاس
رہ گئیں فوجیں ٹھٹک کر اس کی واں ساحل کے پاس

بات سنتا تھا نہ کوئی کارواں سالار کی
کارواں اور کارواں سالار کی ٹوٹی تھی آس

تھا کھڑا حیراں سکندر اور یہ کہتا تھا کہ بس
فتحِ ہند اک خواب تھا اور اس کی تھی تعبیر یاس

بعدِ مدت پھر وہیں آئی اُمنڈ کر اک گھٹا[2]
بیاس کے میداں میں جس سے چھا گیا خوف وہراس

جائے حیرت ہے کہ وہ کشور کشائے نام ور[3]
پھر گیا لے کر جہاں سے اپنی فوجِ بے قیاس

کر سکے کچھ واں نہ اس حملے کے آگے اہلِ ہند
چھوڑ کر ندی بھری کشتوں سے بھاگے اہلِ ہند

6

پہلے اس فتحِ نمایاں سے بھی اکثر جنگ جو   کر گئے یاں آن کر تیغ آزمائی میں غلو
ندیاں جو راہ میں حائل تھیں ان سے بارہا   حملہ آور اُترے اور پڑتے رہے رن سو بہ سو
وہ نشاں جن کی چمک تھی بے بقا مثلِ شہاب[4]   گہہ نظر آئے اٹک پر اور ستلج پر کبھو
رفتہ رفتہ سرزمینِ گنگ تک پہنچا ہراس   آ کے ٹھہرا پہلے مینڈر[5] کنارِ آب جو
دھار میں گنگا کی وہ ہتھیار چمکے سربسر   ہند تک یونان سے جو پیتے آئے تھے لہو
ناگہاں جھیلم پہ چمکی آن کر ستھیا[6] کی آگ   اور پھر کرتی رہی آہستہ آہستہ نمو
پہنچی جب گنگا کے لگ بھگ بیاس اور ستلج کو پھاند   ہو گئے یونان کے ہتھیار آگے ان کے ماند

7

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند   جانبِ ہندوستان محمود[7] نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابرِ رحمت تھا مگر   ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند
وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی واں آفت بپا   اور چلتا تھا جلو میں اس کے آسیب و گزند
غش پہ غش آتے تھے ہر ذی روح کو پیہم وہاں   سانس لیتا تھا جہاں وہ اژدہائے زور مند
روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری   صلح سے بجھتا نہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند
خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پہ رحم   غارت و تاراج تھا اک بازیِ سلطاں پسند
جب وہ آیا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک   جب گیا یاں سے تو مثل دشت ویراں تھا یہ ملک

8

آخر اے دانا حکیمو! کچھ سبب اس کا بتاؤ   ہے بنی آدم کو کیوں قتل بنی آدم کا چاؤ؟
جب کہ حق اور راستی ہے خاص رحمانی صفت   پھر تعجب ہے کہ جباری کا ہو اس میں لگاؤ
جب کہ ہے سرچشمۂ مہر و محبت ذاتِ حق   پھر نہ مانی جائے کیوں اس کی شریعت بے دباؤ
کیا یہ زیبا ہے کہ دینِ حق کو، اے ابنائے جنس!   زور سے منواؤ تم اور ندیاں خوں کی بہاؤ
یا یہ بہتر ہے کہ سچی دوستی اور پیار سے   اور ان باتوں سے جن میں جلوہ الفت کا دکھاؤ
دل کرو اہلِ جہاں کے پہلے تسخیر اور پھر   حکم پھیلاؤ خدا کے اور یقیں ان پر دلاؤ
راہ حق کا خار وخس سے پاک ہونا چاہیے   گلشنِ دیں بے خس و خاشاک ہونا چاہیے

9

خار ہی خار آتے ہیں مدت سے لیکن یاں نظر — خون ہے استاد اور شاگرد 8 دونوں کا ہدر
راستی اور امن کی دیتے ہیں جو تعلیم یاں — راحت اور آرام کو کھوتے ہیں اپنے سر بسر
اور لینی چاہتے ہیں اس طرح تعلیم جو — وہ زمانے کے ستم لیتے ہیں اپنی جان پر
بات حیرت خیز ہے پر شک نہیں اس میں ذرا — نخلِ شادی آنسوؤں کی نم سے لاتا ہے ثمر
دم بہ دم سیراب اگر خونِ شہیداں سے نہ ہو — رہ نہیں سکتا ہرا دنیا کی راحت کا شجر
بے شہادت مل نہیں سکتی حیاتِ سرمدی — موت ہے در زندگی کا اور الم بابِ ظفر
غیر کے زخموں پہ ہرگز رحم ہم کھاتے نہیں — آپ جب تک زخمِ کاری کا مزا پاتے نہیں

10

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہِ نام دار — صلح کل جس کی زمانے میں رہے گی یادگار
بسکہ آزادی بنی نوعِ بشر کو تو نے دی — رائے پر ہر شخص کی ٹھہرا عقیدے کا مدار
فہم سے بندوں کے بالاتر تھے جو اسرارِ دیں — بحث کرنے کا ملا بندوں کو ان میں اختیار
حوصلہ نکلا ترا شاہانِ پیشیں سے وسیع — تجھ سے القابِ شہنشاہی نے پایا اعتبار
پر تری اولاد نے کی پیروی تیری نہ حیف — ہو گیا ان کا تعصب خود گلے کا ان کے ہار
ثمرہ آخر مل گیا ان کے تعصب کا انھیں — کر گیا رحلت جہاں سے جلد ان کا اقتدار
خاروخس کے ڈھیر ہیں کھنڈروں میں ان کے آج واں — دولتِ روئے زمیں کل جلوہ آرا تھی جہاں

11

خیر ان کے ذکر سے اب کیجیے قطعِ نظر — خوبیاں تھیں عہد میں ان کے نہ لیکن اس قدر
امن و راحت، اتفاق اور برکتیں انصاف کی — ملک افزائش سے ہو جن کی بدولت بہرہ ور
اور رعیت کی اطاعت جو نہ مجبوری سے ہو — بلکہ جس سے رغبت اور اخلاص ہو خود جلوہ گر
نعمتیں ہندوستاں کو یہ ہوئیں اس دم نصیب — چھا رہی تھی جب کہ مایوسی دلوں پر سر بسر
امن و راحت کا تصور تک نہ آیا تھا کبھی — جائے حق ناحق کا سکہ چل رہا تھا بے خطر
دیکھ کر آخر بدی کا دور دورہ، نیکیاں — ہو چکی تھیں یاں سے رخصت آہ ٹھنڈی کھینچ کر
اس اندھیرے میں اجالا ناگہاں پیدا ہوا — (چشمۂ حیواں کا ظلمت میں نشاں پیدا ہوا)

12

کیا مرہٹے، کیا مغل، سادات کیا، افغان کیا   عہد میں سب کے رہی یاں بارشِ ابرِ بلا
علم،فن، جرأت،نکوئی،مٹ گئیں سب خوبیاں   دم بہ دم طوفاں بدی اور عیب کا بڑھتا رہا
یاس سے حالت عجب اک ہند پر طاری ہوئی   بحرِ بے پایاں میں گویا سخت طوفاں تھا بپا
ناخداؤں کے بجا تھے اور نہ ملاحوں کے ہوش   اور جہازِ عافیت تدبیر کے بس میں نہ تھا
بے طرح چھایا ہوا تھا ابرِ ظلمت چارسو   کوکبِ رہبر کا ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا پتا
کوندنا بجلی کا تھا گویا کہ جگنو کی چمک   اک جھلک آئی نظر اور پھر اندھیرا چھا گیا
جوکہ بزدل تھے وہ غش کھا کھا کے گرتے تھے وہاں   اور جی چھوڑے ہوئے تھا ہر جری اور سورماں

13

ڈوبنے کے جب نظر آنے لگے آثار سے   تب نجات آئی یہاں ساتوں سمندر پار سے
آ کے انگلستان نے طوفاں کو للکارا کہ بس   باز رہ اے فتنہ اپنی گرمیِ رفتار سے
مدتوں کی سختیوں سے ملک چھوٹا یک قلم   ہند کو اپنوں نے دی آ کر نجات اغیار[9] سے
اہلِ ہند اور اہلِ مغرب اصل میں سب ایک تھے   کچھ دنوں بچھڑے رہے پر گردشِ ادوار سے
گو رہے چندے جدا پر مل گئے انجام کو   کلفتیں بدلی گئیں فرقت کی آخر پیار سے
اہلِ مغرب کو نہ سمجھیں غیر ہرگز اہلِ ہند   (آئینہ اور سنگ دونوں نکلے ہیں کہسار سے)
اب نہ چھوڑے گا یقیں وہموں کی لڑ کاٹے بغیر   دوستی رہتی ہے کب نفرت کی جڑ کاٹے بغیر

14

دہریوں کا فرقۂ لایعقل اور کوتاہ بیں   اپنی کج رائی سے جو تقدیر کا قائل نہیں
اب ہیولٰی کو نہ سمجھے مصدرِ کل کائنات   اتفاقِ دہر پر رکھے نہ بنیادِ یقیں
ورنہ ہم پوچھیں گے اس سے کس طرح اک اتفاق   یا ہیولٰی لے گیا مغرب سے تا مشرق زمیں
کچھ جہاز اور چند سوداگر تجارت کے لیے   تا کہ ہوں پردیسیوں کی طرح واں جا کر مکیں
اور پھر اس کشورِ آباد پر قابض ہوں وہ   ایک مدت تک رہا مغلوں کے جو زیرِ نگیں
کیا یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا اے اہلِ رائے؟   یا مشیت نے تماشے اپنی قدرت کے دکھائے

15

ایسے ہذیاناتِ بے جا سے یہ بہتر ہے کہ ہم
مان لیں سر اور اسر[10] کی داستاں بے بیش و کم

گو کہ افسانہ ہے لیکن دہریوں کے قول سے
اس میں کچھ باتیں زیادہ دل نشیں پاتے ہیں ہم

اہلِ انگلستان کا آنا سمندر پار سے
ہے سمندر کا بلونا فی المثل اے محترم

زندگی جو اس سے اہلِ ہند کو حاصل ہوئی
ہے وہ امرت جو کہ پہنچا ہے سمندر سے بہم

اب رہا وہ زہر جس سے حلق شیو کا جل گیا
یہ وہی حق ہے کہ جو ہے واسطے باطل کے سم

جس سے ہو گی محو اگلے دیوتاؤں کی نمود
اور ہوں گے ہاتفانِ غیب گونگے یک قلم

جو مٹائے جائے گا باطل کی ظلمت کے نشاں
صبح صادق کی نہ ہو گی روشنی جب تک عیاں

16

ہند میں پہلے کبھی جو سلطنت یک سو نہ تھی
اس کو امرِ اتفاقی جاننا ہے ابلہی

یہ بھی کہنا غیر ممکن ہے کہ تھی اسلاف میں
تجربے کی، عقل کی، تدبیر و جرأت کی کمی

ہاں مگر تقدیر پر ہے جب کہ ہر شے کا مدار
چاہیے کہنا کہ تقدیرِ الٰہی تھی یہی

اکبر اور شاہِ جہاں کی ذات میں کیا کچھ نہ تھا
سلطنت کی جو لیاقت چاہیے وہ ان میں تھی

دھاک نادر شاہ کی بھی کم نہ تھی شیروں سے کچھ
فتح ان کی پر نہ اپنی حد سے آگے بڑھ سکی

آج یہ صوبہ پھرا، کل ملک وہ باغی ہوا
عہد میں سب کے یہی نقشہ، یہی صورت رہی

دُور تھا وہ دن کہ سر ہوں ایک در پر سب کے خم
ہند کی فوجیں ہوں ساری زیرِ سلطانی علم

17

راج پر راجا اشوکا کے ہیں وہ لاٹیں گواہ
جن پہ فرماں اس کے اب تک ثبت ہیں بے اشتباہ

ہند میں از بس کہ جو لاٹیں گڑی ہیں دور دور
ہے ہویدا ان سے اس کی وسعتِ تمکین و جاہ

پر نشانِ فتح جو اول پلاسی میں گڑا
اور پھر کابل میں پہنچی چرخ تک اس کی کلاہ

مدتیں گزریں کہ وہ اُتر سے لے کر تا دکن
کر چکا ہے حد سے ان لاٹوں کی بڑھ کر قطعِ راہ

پورب اور پچھم میں بھی ڈالا ہے اس نے دور دور
سایۂ عدل و نکوئی، پرتوِ امن و رفاہ

ہم نے یہ مانا کہ پتھر پر ہیں جو کندہ حروف
وہ رہیں گے منقش اس پر ہزاروں سال و ماہ

نام ہے وکٹوریا کا ان سے بڑھ کر پائیدار
نقش ہر اک صفحۂ دل پر ہے جس کا استوار

18

مشرقی تاج آج تک تھا پیشِ ربِ ذوالمنن
اک امانت جس سے محرم تھا نہ فرقِ مرد و زن
قبضۂ تقدیر میں اب تک رہا محفوظ وہ
مر گئے اس کی تمنا میں سلاطینِ زمن
ہاں مگر اے فخرِ شاہانِ جہاں وکٹوریا!
تھی ترے فرقِ مبارک سے لگی اس کی لگن
گر کہے کوئی کہ اوروں نے نہ کیوں پایا یہ تاج
اس سے کہہ دو لائقِ حلوا نہیں ہے ہر دہن
گو بہت دنیا میں شاہ و شاہ بانو ہیں مگر
بانوے برطانیہ کا سب سے بالا ہے چلن
ماں کسی اولاد کو ایسی نہیں ہوتی نصیب
اور نہ ماں کو ایسی بیٹی اور نہ دولہا کو دلہن
نیک نیت پاک دل ایسے بشر ہوتے نہیں
رنج سہنے کے لیے ایسے جگر ہوتے نہیں

19

وہ جزیرہ جو کہ روئے بحر پر ہے مثلِ خال
دھوپ کا اور روشنی کا جس کی سرحد میں ہے کال
جس سے آگے بڑھ کے ہیں آثارِ قدرت ناپدید
کچھ نہیں آتا نظر جز ذاتِ ربِ ذوالجلال
یعنی انگلستان، ہے جس کی حقیقت اس قدر
شاید اس کے باب میں کوئی یہ کر بیٹھے سوال
کیا ضرورت ہے کہ وہ مختار اور قابض رہے
سرزمینِ ہند پر ہے جس کی وسعت کا یہ حال
اس سے کہہ دو، خوں بہے اولاد کا اس کی جہاں
آبِ باراں کی طرح اور بحر و بر ہو جائیں لال
جس کے لینے اور بچانے کے لیے لاکھوں شجاع
جنگ میں گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہوئے ہیں پائمال
مفت اسے ہاتھوں سے کھو دینا روا ہو کس طرح؟
خوں بہا ان سورماؤں کا ادا ہو کس طرح؟

20

اور سب جانے دو کیا عظمت کی کچھ قیمت نہیں؟
یا فتوحاتِ نمایاں لائقِ وقعت نہیں؟
پے بہ پے فتح و ظفر کی قیمتی زنجیر، کیا
دوش پر اک قوم کے پیرایۂ عزت نہیں؟
واسطے اولاد کے میراث جس کو چھوڑ جائیں
اس قدر بھی دولتِ عزت میں کیا برکت نہیں؟
سمجھے اس دولت کو جو ناچیز اس کی روح کو
جسمِ خاکی سے جو سچ پوچھو تو کچھ سبقت نہیں
بحث کرنی اس سے لاحاصل ہے، سمجھا دو اسے
تجھ کو انگلستان کی شہرت سے کچھ نسبت نہیں
ناحق ایسے شخص کے کہنے کا تم مانو برا
جس کی فطرت میں کہ حیوانوں سے کم خست نہیں
تنگِ ذلت ہے نہ کچھ پروائے عزت ہے جسے
ہر مذلت اور پستی پر قناعت ہے جسے

21

جرأتیں اسپارٹا سے یہ نہ ہوتیں آشکار
گر بزرگوں کی مہمیں واں نہ ہوتیں یادگار

جب بڑوں کے اپنے ساکے یاد آتے تھے انھیں
آبرو پر جان وتن بڑھ بڑھ کے کرتے تھے نثار

سورما تھرموپلی کا نام سن پاتے ہیں جب
جوش میں آتے ہیں کیا کیا ان کے دل بےاختیار

آئے ہیں اس معرکے میں کام جو شیرِ جری
نسل میں ان کی وہی عزت رہے گی برقرار

جو کہ دہلی یا اسائی میں ہوئے ہیں فتح یاب
ہم وطن بھائی ہوں ان کے یا عزیز اور دوست دار

جی چرائیں گے نہ ہرگز جان دینے سے کہیں
فی المثل گر دس گنی طاقت سے بھی ہوں گے دوچار

تاکہ فتحِ دہلی و فتحِ اسائی کا شرف
قوم میں باقی رہے گو اپنی جانیں ہوں تلف

21

یاد ہوگا سب کو وہ حق کا عتابِ اولیں
جس نے ڈالی تھی بشر کی ذات میں بنیادِ کیں

تفرقے نے توڑ کر پھینکا تھا سب کو دور دور
تھی پڑی جس وقت بن بوئی جُتی ساری زمیں

کون ہوگا جس کے دل میں یہ تمنا ہو کہ پھر
ہو وہی پہلا عتاب انسان پر نازل کہیں

قومیں آپس میں بہت رکھتی ہیں یاں جو میل جول
ان کی عقلیں ہوتی جاتی ہیں زیادہ دور بیں

ایک حاکم کی رعیت دوست ہوتی ہے سدا
گر نہ ہو تو ایک دن ہو جائے گی وہ بالیقیں

قوت اور امن و خوشی ہیں ثمرہ ہائے اتفاق
ثمرۂ نااتفاقی جز ہزیمت کچھ نہیں

نوعِ انساں میں بدی سے جو کہ پھیلا تھا نفاق
کرتا جاتا ہے زمانہ اس میں پیدا اتفاق

23

ہے زبردستوں کا یارو بول بالا آج کل
پودنے کی اصل کیا، دیووں کا ہو جس جا خلل[11]

اک ذرا سی ٹھیس میں ہوتا ہے کام اس کا تمام
دیو کی جنبش ہے اس کے حق میں پیغامِ اجل

دے گر انگلستان کا ساری رعیت مل کے ساتھ
تنگ ہو جائے عدو پر عرصۂ جنگ و جدل

ورنہ وہ ملت کہ جو دو براعظم پر ہے آج
سایہ افگن صورتِ نخلِ تناور، فی المثل

کیا تعجب ہے کہ اس کا سایۂ دور و دراز
رفتہ رفتہ جائے باہر اپنی سرحد سے نکل

سامنے اس قوم کے انگلینڈ کی ہے وہ مثال
جیسے اک بالشتیا آ جائے پیشِ مردِ طویل

وقت پر سب مل کے گر اس کا نہ دیں گے ساتھ یاں
ایک طرف ہو جائے گا پلہ ترازو کا گراں

24

نوعِ انساں کو ملی ہے جب کہ عقلِ ناتمام
پھر حماقت ہے کہ کیجے آج، کل کا اہتمام
بات جو کل ہو چکی اس کی بھی حسرت ہے عبث
رہتے ہیں آج اس لیے ہر حال میں ہم شاد کام
جب کہ اک ہموار رستے پر چلے جاتے ہیں ہم
دائیں بائیں کے بلند و پست سے کیا ہم کو کام
کچھ دنوں سے چڑھ رہے ہیں، ہم بلندی کی طرف
کر چکے ہیں قطع تھے یاں پرخطر جتنے مقام
آن پہنچے جب بلندی پر تو لازم ہے کہ اب
خوف کا ہرگز رہے باقی نہ دل میں اپنے نام
جب بلندی پر سے دیکھیں جھک کے پستی کی طرف
شکرِ حق لائیں بجا اور بخت کو بھیجیں سلام
جو خوشی دی ہے خدا نے اس سے جی ٹھنڈا کریں
یادِ غم ہائے گزشتہ سے نہ دل میلا کریں

25

راگنی اب وقت کی ہم چھیڑتے ہیں برملا
جس سے ظاہر ہو کہ حالت ہند کی ہے آج کیا
اتفاق اور دوستی نے کر دیا ہے سب کو ایک
اور آزادی نے کر رکھا ہے ہر اک کو جدا[12]
مملکت فوجوں سے اور قلعوں سے ہے معمور سب
پایۂ نظم و نسق پہنچا ہے تا فوق السما
سر پہ دو تاجِ ہمایوں ہند کے رکھے گئے
واجبی حق الغرض مدت کے بعد اس کو ملا
برخلاف اس ملک کے جو ڈھک رہا ہے برف سے
ہر طرف ہے بن ہی بن اور قحط ہے جاں دار کا[13]
بھیڑیوں کے غول پھرتے ہیں بنوں میں چیر کے
تا کہ جو مل جائے واں آوارۂ دشتِ بلا
کر کے چھوڑیں اس کو ایسا بے کس و بے خانماں
حشر تک پیارے رہیں فرقت میں اس کی نوحہ خواں

26

بارے ایسی ہند کی حالت نہیں زار و نزار
ہے موافق اس کی وسعت کے رعیت کا شمار
فرض کیجے، کل بنی آدم کے چھ حصے اگر
ایک حصہ اس میں اہلِ ہند پائیں گے قرار
ہے یقیں مقدار اس کی اس سے بھی بڑھ جائے کچھ
کیوں کہ فتنے کو نہیں مدت سے ملتا اس میں بار
زندگی کی ریت اب شیشے میں ٹھہرے گی سوا
پیش تر جس کے نکلنے کا بندھا رہتا تھا تار
اس قدر بندوں کی روزی کا ہمیں کیوں فکر ہو
ہے خدا کے حکم پر سب کی معیشت کا مدار
کچھ نہیں تو قحط کا دورہ سلامت چاہیے
بڑھنے پائے گا نہ آدم زاد کا حد سے شمار[14]
یاد رکھ اے منکرِ حق ہے یقیں اصلِ نجات
وسوسوں سے اور کھل جاتی ہے راہِ مشکلات

27

ہر کرن سورج کی اور ہر بوند پانی کی ہے یاں
لاکھوں جاں داروں کے رہنے کو علیحدہ اک جہاں
وہ خدا جس نے بنایا اور پھر پالا انھیں
کیا تجھے اور نسل کو تیری نہ دے گا قوت و ناں
ہند کا دریا جو چڑھتا ہے تو چڑھنے دو اسے
تو یقیں کو اپنے رکھ مضبوط بے وہم و گماں
ہے اگر غلبے کا کثرت پر رعایا کی مدار [15]
ہند ہو سکتا ہے آدھے ایشیا پر حکمراں
ہے کوئی وادی جہاں میں ہمسرِ کشمیر آج
یا کوئی گنگا کے میداں سے زمیں زرخیز تر
شہر ہے جو مرکزِ کشمیر [16] مانندِ طلسم
طرفہ کیفیت سے ہے لہروں میں ڈل کی جلوہ گر
دیکھتے ہیں آبِ صافی میں جب اس کا انعکاس
دوسرا وینس کا نقشہ صاف آتا ہے نظر
باغِ شالیمار جو رونق فزا ہے اس کے پاس
ہے وہ اک نیرنگِ قدرت کا تماشا سر بسر
سبزہ و نسرین و گل کی سرزمیں کہیے اسے
صفحۂ گیتی پہ یا خلدِ بریں کہیے، اسے

28

فی المثل تختہ زمرد کا ہے واں اک سبزہ زار
سایہ افگن اس طرح ہیں ہو بہو اس پر چنار
جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے ہیں نظر
زیر و بالا اونچے نیچے گھر قطار اندر قطار
تھی بنانے سے غرض تیرے پرے باغِ نسیم
باغِ جنت کا نہ انساں کو رہے کچھ انتظار
چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی
جا بہ جا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار
ان کی رفعت اور بلندی کی نہیں کچھ انتہا
سینۂ گردوں سے گویا اب نکل جائیں گی پار
روزِ روشن میں جب ان کا جھیل پر پڑتا ہے عکس
نقرئی پانی کی اس کے پھر کوئی دیکھے بہار
اور پھر جھرمٹ زنانِ مہ لقا کا ہر طرف
(سامنا آفت کا فتنے کا بلا کا ہر طرف)

29

جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں
تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں
ہر چمن یاں پھول سے اور پھل سے مالا مال ہے
ہر چمن میں یاں مہیا ہیں مکاں بہرِ مکیں
ان مکانوں اور خیابانوں سے جب آگے بڑھے
پھر وہ عالم ہے جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں
جیسے ہوتا ہے ابد پر وقت جا کر منتہی
ختم ہو جاتی ہے دنیا بھی یہاں آ کر یوں ہی

یعنی اقلیمِ ابد اور یہ جہانِ خامشی طاقتِ انساں کی حد سے ہیں پرے دونوں کہیں
طرفہ سناٹا ہے اس سنسان کوہستان پر جس کی دنیا میں نہیں تمثیل کوئی دل نشیں
ہیں سراسر ناپدید آثارِ انسانی یہاں منہ لپیٹے ہیں پڑے اسرار یزدانی یہاں

30

ڈھونڈ ھیے گر ان پہاڑوں کی بلندی کی مثال ظاہرا ان کا اور انگلستان کا ہے ایک حال
جیسے وادی کی زمیں سے تا فلک پہنچے ہیں یہ وہ بھی پستی سے یونہی پہنچا ہے تا اوجِ کمال
ہے یقیں رستے ہی میں ہو جائے کام ان کا تمام ہو جنھیں اس کی بلندی تک پہنچنے کا خیال
تا پتی پر آ کے انگریزوں نے جب کھولی دکاں ایک مدت تک ترقی نے نہ بدلی اپنی چال
یعنی اس دم تک کہ سکھوں سے ہوا گہرا بگاڑ اور دریا ہو گئے پنجاب کے سب خوں سے لال
لشکرِ مقدونیہ کی قتل گاہوں پر ہوا بعدِ مدت گرم پھر ہنگامۂ جنگ و جدال
اہلِ انگلستان کو جھگڑوں سے فرصت کم ملی امن کو فتنے کے ہاتھوں سے فراغت کم ملی

31

جب بغاوت نے اٹھایا سر تو اس سے بھی سوا آگ بھڑکی مرگ کی اور خون کا دریا بہا
عورتیں اور ان کے بچے بے گنہ مارے گئے گھر جلے اور دشمنِ جاں ہو گئے خود دست و پا
بھائی بندوں کی جفائیں دیکھ کر غمگیں ہوئے اہلِ انگلستان کے ساتھی جو تھے اہلِ وفا
اور ہزاروں نے یہ باندھا مل کے منصوبہ کہ بس عزت انگلستان کی اب خاک میں دیجے ملا
صفحۂ ہستی سے نام ان کا مٹانے کے لیے ہو گیا تیار جان و دل سے ہر چھوٹا بڑا
لیکن ان کی گھات میں تھا شحنۂ قہر و غضب پھنس گئے پنجے میں اس کے یک بیک اہلِ خطا
پلہ انگلستان کا ہو کر رہا آخر گراں گرتے گرتے تھم گیا اقبال کا اس کے نشاں

32

گو ہوئی دلّی پہ حاصل برملا فتح و ظفر پرچمِ اقبال لہرانے لگا پھر بے خطر
پر نہ اس فتحِ نمایاں کا ہوا اعلان کچھ وسوسوں سے دل رہے سب اس لیے زیر و زبر

چونک چونک اٹھنے لگے راتوں کو بدخوابی سے لوگ　　کر گئی دنیا سے گویا فارغ البالی سفر
صبح کے ہوتے ہی سب کافور ہو جاتی تھیں وہ　　شکلیں ہیبت ناک جو راتوں کو آتی تھیں نظر
رائے یہ ٹھہری کہ پائے اب وہ قیصر کا لقب　　تابعِ فرماں ہیں جس فرماں روا کے بحر و بر
قوتِ بازو سے جو حاصل کیا ہے قوم نے　　وہ ہمایوں تاج رکھا جائے اس کے فرق پر
تا کہ سب جانیں کہ رخصت ہند سے فتنہ ہوا　　عہد انگلستان کا جو کچھ کہ تھا پورا ہوا

33

اس نویدِ روح پرور کی اشاعت کے لیے　　ہند میں آیا پرنس آف ویلز انگلستان سے
ایلبرٹ اڈورڈ جس کے دودۂ اقبال میں　　سو جلیل القدر سلطاں اب سے پہلے ہو چکے
جس کے دادا نے کیا زیر و زبر نظمِ فرانس　　اور بتاتا ہے لقب جس کا پتہ اس جنگ کے
دی فرانسیسوں کو جس نے زک وہ انگلستان نے　　جس سے واقف ہیں فرنگستان کے چھوٹے بڑے
حاکمِ بوہیمیا کی چھین لی تھی جس نے ڈھال　　خود ولی عہدِ زماں نے یاریِ اقبال سے
جس میں کلمے اعترافِ بندگی کے برملا　　حاکمِ بوہیمیا کے دستخط سے ثبت تھے
جمع تھے جس ذاتِ والا میں فضائل اس قدر　　وہ ہوا مامور اس کارِ عظیم الشان پر

34

وہ مبارک وقت جب لنکا سے لے کر تا عدن　　اس کے آنے کی خوشی میں محو تھے سب مرد و زن
راگ گائے جاتے تھے ہر سو مبارک باد کے　　جوشِ شادی میں در و دیوار تک تھے نغمہ زن
شہر میں جنگل میں ہر میدان اور ہر راہ میں　　جمع تھی اس کے لیے خلق انجمن در انجمن
وہ سہانے بول شہنا کے وہ باجوں کی جھڑی　　پڑ رہی ہے جن کی گویا کان میں اب تک بھرن
کھنچ چکے ہیں اس ہمایوں جشن کے نقشے بہت　　میں بھی اے وکٹوریا، اے فخرِ شاہانِ زمن
چاہتا ہوں کھینچنا اک خاکہ اس دربار کا　　جس میں کی تو نے قبائے قیصری زیبِ بدن
جس میں تیرے نام کا ڈنکا بجایا قوم نے　　جو کہا تھا منہ سے آخر کر دکھایا قوم نے

2 انگریزی اشعار کا ترجمہ

(سنہ تصنیف: 1878، ہیئت: قطعہ، ماخذ: دیوان حالی)

وہ دل ربا اُمیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا　　جب دور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا
وہ عالمِ جوانی جس پر کہ تو ہے مفتوں　　جائے گا ٹوٹ جس دم اس کا طلسم سارا
جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تو نے اس کو　　تھا جو کہ تجھ کو اپنا آرامِ دل سمجھتا
چل دیں گے جب وہ سارے ان بلبلوں کی مانند　　بعد از بہار جو رخ کرتی نہیں چمن کا
جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ　　کون آ کے دے گا تجھ کو اس کے سوا سہارا
بے مہریوں سے تو نے جس کو کیا ہے غم گیں　　تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آ کے لے گا
جس طرح وہ پرندہ جو فصل گل میں جا کر　　پھر موسمِ خزاں میں آ کر ہے ہم سے ملتا

3 ناقدری

(گرے کے اشعار کا ترجمہ[17])

(سنہ تصنیف: 1913، ہیئت: قطعہ، ماخذ: جواہرات حالی)

موتی ہزار قعرِ سمندر میں ہوں نہاں　　پر یہ بتاؤ ان کا خریدار ہے کہاں
کھلتے ہیں پھول سیکڑوں ویران دشت میں　　ہے کون رنگ و بو کا وہاں ان کے قدرداں

4 واقعۂ ہجرت[18]

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار کا منظوم ترجمہ)

(سنہ تصنیف: 1886، ہیئت: قطعہ، ماخذ: نقوش لاہور، جنوری 1963)

(عربی اشعار)

وقیت بنفسی خیر من وطئ الحصٰی　　و من طاف بالبیت العتیق و بالحجر
رسول اللّٰہ خاف ان یمکروا بہ　　فنجاہ و فی حفظ الالہ و فی ستر

اقام ثلثًا ثم ذمت قلائص قلائص تغرین الحصٰی این ما تغر
و بت اُراعیهم و ما یثبتوننی فقد وطنت نفسی علی القتل و الاسر
اردت به نصر الالٰه تبتلًا و اضمرته حتٰی اُوسد فی قبر

(ترجمہ)

رسولِ مطہرؐ کہ ہے اس سے کم تر زمیں پر خدا کی جو ہے چلنے والا
پھرے گرد کعبے کے جو یا پھریں گے وہ قدر و بزرگی میں ہے سب سے بالا
ہوا خوفِ اعدا، تو اس پر سے میں نے سپر بن کے خود شرِّ اعدا کو ٹالا
بچایا اسے مکرِ اعدا سے حق نے وہ جو سب پہ ہے لطف و احسان والا
خدا خود رہا غار میں اس کا ایمن کہ پردہ تھا اس نے سب آنکھوں پہ ڈالا
ہوئے تین دن جب تو اس حد سے باہر سواروں نے ناقوں کو اپنے نکالا
وہ ناقے جنھوں نے کہ پیروں سے اپنے گئے جس زمیں پر اسے پیس ڈالا
میں اعدا کی ایذا کا تھا منتظر واں نہ بیڑی ہی تھی شاق مجھ پر نہ بھالا
غرض اس سے تائیدِ حق تھی اور اب بھی یہی دھن ہے تا وصلِ ایزد تعالیٰ

حواشی

1 یہ شعر اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے تا کہ بند کے پورے سات شعر ہو جائیں۔(حالی)

2 اس سے مراد انگریزی فوج کا حملہ ہے جو 1846 میں پنجاب پر ہوا۔(حالی)

3 یعنی سکندر اعظم۔(حالی)

4 یعنی جن کے جھنڈوں کے پھریروں کی چمک شہاب ثاقب کی طرح بے بقا اور ناپائیدار تھی اور جو ہندوستان پر حملے کر کے محض ناکام یا چندروز شمالی ہند پر حکومت کر کے واپس چلے گئے۔(حالی)

5 مینڈر: یونان کے سوتیر خاندان کا ایک مشہور بادشاہ تھا۔ یہ خاندان سکندر اعظم کے بعد ملک باختر یعنی خراسان وغیرہ میں غالباً حضرت عیسیٰؑ سے دوسو برس پہلے مسلط ہو گیا تھا۔ مینڈر نے، جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے، ہندوستان پر 181 قبل مسیح سے 161 قبل مسیح کے درمیان حملے کیے ہیں۔ اس نے جنوب میں سندھ اور کچھ تک اور مشرق میں متھرا تک فتح کر لیا تھا۔(حالی)

6 بحر اسود اور کوہ قاف اور بحیرۂ کیسپین کے شمال میں جو وحشی قومیں آباد تھیں، قدیم زمانے میں ان کو 'ستھیا والے' کہتے تھے۔ اب وہ تمام ممالک یورپین روس اور ایشیائی روس میں شامل ہیں۔ ستھیا والوں کے حملے حضرت مسیح سے سو برس پہلے شروع ہو گئے تھے۔ ان وحشیوں کے غول کے غول ہندوستان پر چڑھ آتے تھے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح کی ولادت سے چند سال بعد کشمیر کے قریب ان کی زبردست سلطنت قائم ہو گئی تھی۔ ان کا سب سے مشہور بادشاہ کنشکا ہے جس نے شمالی ایشیا میں بدھ مذہب کی چوتھی کونسل منعقد کرائی۔ شمالی ایشیا میں جو بدھ مذہب کی شکل ہے، وہ اسی کونسل کا نتیجہ ہے۔ ستھیا کی آگ سے غالباً ان کی جہاں سوزی و تاخت و تاراج مراد ہے، جیسے کہ بایزید عثمانی کو 'ایلدرم' کہا گیا ہے اور عرب کی فتوحات کو برق سے تشبیہ دی گئی ہے۔(حالی)

7 انگریزی مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور افروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے تھے۔ جس طرح اس بند میں محمود کی بے رحمی اور ظلم کا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ایک انگریز نے اس کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے: (نظم)

اے ملک زرنگار قدم ہے وہ کون سا   حملے سے جس کے ہے ترے ارکاں میں زلزلہ
وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں   معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں

ٹھاکر اور ان کے مندر، راجا اور ان کے تخت
حملے سے اس کے آ کے پڑا سب پہ وقت سخت
پتلا غضب کا کون سا وہ ہولناک ہے؟
اے ملک زرنگار وہ غزنی کی خاک ہے
آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں
پھرتے ہیں بکھرے تاج بہت اس کی راہ میں
کتے جو اس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار
ان کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار
بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر
مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر
کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

انگریزوں کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر بہت سختی نہیں کی گئی۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو وہاں سختی کی بہت ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بے چارے اس درجے ناہموار، بے ڈول، اور ناشائستہ تھے کہ انگریز فاتحوں کی صورتیں، ٹیپ اور چمک دمک دیکھ کر شرم کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے اور کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ان کے پڑوس میں رہ سکیں۔ جس قدر انگریز مہاجروں کی تعداد آسٹریلیا میں بڑھتی گئی، وہ لوگ ملک کے اندرونی حصے میں غائب ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ معدوم ہوتے گئے۔ اب شاذ و نادر کہیں کہیں اندرونی پہاڑوں کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ ٹسمانیہ کے قدیم باشندے جو ایک خوش بشرہ مگر ان سویلائزڈ قوم تھی، یورپ والوں کی ہمسائیگی کے باعث بالکل فنا ہوگئی، یہاں تک کہ اب ایک متنفس بھی ان کی نسل کا باقی نہیں۔ پس آسٹریلیا کے قدیم باشندے جو انڈومان والوں سے بھی زیادہ بدقوارہ اور ناشائستہ تھے، انگریز جیسی اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم کے پڑوس میں کیوں کر ٹھہر سکتے تھے۔

تو بجلوہ چوں در آئی اجل از سر ترحم   ہمہ جا کند منادی پے احتراز کردن

اگر فی الواقع انگریزوں نے آسٹریلیا والوں پر سختی نہیں کی تو یہ ان کی عین دانائی تھی کہ انھوں نے مفت کی بدنامی نہیں لی اور تمام براعظم ان کے لیے خود بہ خود خس و خاشاک سے پاک ہوگیا۔

بات یہ ہے کہ دنیا کے ایک بڑے حصے نے علم و ہنر میں اس قدر ترقی کی ہے کہ وہ دوسرے حصے کے ابنائے جنس سے اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اگلے زمانے کے فاتح اور کشور کشا جن ناجائز ذریعوں سے مفتوحین کی دولت، ثروت اور سلطنت کے مالک ہوتے تھے، ان ذریعوں کے کام میں لانے کی اب مطلق ضرورت نہیں رہی۔ جس قدر مال و دولت پہلے قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا جاتا تھا، اس سے اضعاف مضاعفہ، اب صنعت و تجارت کے ذریعے سے خود بہ خود کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب دو ایسی گورنمنٹوں کے درمیان، جن میں سے ایک شائستہ اور دوسری ناشائستہ ہو، تجارتی عہدنامہ تحریر ہو جاتا ہے تو یہ یقیناً سمجھ لیا جاتا ہے کہ شائستہ گورنمنٹ بغیر اس کے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری، دوسری گورنمنٹ کے تمام مال و دولت و منافع و محاصل کی بالکل مالک ہوگئی۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی، لیکن — حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گل چیں، یا ہے قزاقی ؟

شاید ان شعروں میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جو نتیجہ اگلے زمانے کے غارت گروں کی لوٹ کھسوٹ سے مرتب ہوتا تھا، اس نتیجے کے قریب قریب یہ شائستہ لوٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔ کروڑوں اہل صنعت و حرفت جن کی دستکاری، مکینکس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی، نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ فلاحت پیشہ لوگوں پر یہ بپتا پڑتی ہے کہ زمین کی پیداوار جس قدر کثرت کے ساتھ غیر ملکوں کو جاتی ہے، اسی قدر ملک میں زیادہ کاشت کا تردد کیا جاتا ہے اور اس سبب سے روز بروز زیادہ لاگت لگانی پڑتی ہے اور محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔ یہ پولیٹکل اکونمی کا مسلم مسئلہ ہے کہ قدرتی پیداوار کی جس قدر مانگ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے بہم پہنچانے میں زیادہ لاگت اور زیادہ محنت صرف ہوتی ہے اور مصنوعی چیزوں کی جس قدر زیادہ طلب ہوتی ہے، اسی قدر ان پر کم لاگت آتی ہے اور کم محنت صرف ہوتی ہے۔ ملکی تاجروں کے لیے جو کہ شائستہ ملکوں کی مصنوعی تجارت کرتے ہیں، اول تو اوپر والے منافع کی کچھ گنجائش ہی نہیں چھوڑتے اور اگر قدرے قلیل (جیسے آٹے میں نمک) کچھ فائدہ بھی ہے تو اپنے ملک کی نہایت ضروری اور ناگزیر اشیاء کا نرخ گراں ہونے کے سبب ان کی کمائی میں سے بہت کم پس انداز ہوتا ہے اور جس قدر رہتا ہے، وہ غیر ملکوں کی آرائشی اور غیر ضروری چیزوں کے خریدنے میں، جو باوجود کمال نفاست اور لطافت کے نہایت ارزاں دستیاب ہوتی ہیں، صرف ہو جاتا ہے۔ پس ان کو بھی فارغ البالی اور آسودگی کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اگر سو دو سو میں دو چار ایسے نکل بھی آتے ہیں، جو اپنے ملک میں مرفہ الحال سمجھے جاتے ہیں، ان کا معاملہ اور لین دین ان کروڑ پتیوں سے ہوتا ہے جن کے مقابلے میں وہ اپنے تئیں محض مفلس اور قلاش تصور کرتے ہیں اور جن کی مانگ سے ہمیشہ دوالہ نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طمع اور خود غرضی اور زیردستوں کو دلنا اور پیسنا جیسا تاریکی اور وحشت کے زمانے میں تھا، اسی کے قریب قریب اب بھی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ دولت گھسیٹنے کے لیے پہلے جبر و تعدی کی ضرورت تھی، اب اس کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔ ان سویلائزڈ دنیا کی دولت سویلائزڈ دنیا کی طرف خود بہ خود کھنچی چلی جاتی ہے۔

(تمثیل): ایک اژدہا شیر کو بہت برا بھلا کہہ رہا تھا کہ تُو کیسا بے رحم ہے کہ ہمیشہ جان داروں کا خون پینے کی فکر میں رہتا ہے اور شکار کی دھن میں دور دور کے دھاوے کرتا ہے۔ تمام جنگل میں تیری دھاک ہے۔ آج اس ہرن کو پھاڑ ڈالا، کل اس پاڑے کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دیے۔ ایسی خوں خواری

پر کمر باندھنی اچھی نہیں ہے۔ شیر نے کہا کہ قبلہ! اگر میری سانس میں ایسی کشش ہوتی کہ دور دور سے جانور خود گھسٹتے ہوئے میرے منہ میں چلے آتے اور میری حرص و آز کی آگ بجھا دیتے تو میں بھی ہرگز کسی بے گناہ کے خون میں اپنے ہاتھ رنگین نہ کرتا۔ مع ذالک اگر کہیں آزادی تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے اور بغیر جبر و تعدی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم سب کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آزادی تجارت کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے۔ حالانکہ آج تک پولیٹکل اکونمی نے اس بات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ کا قاعدہ مطلقاً قرین انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلاف انصاف بھی ہوسکتا ہے۔ انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے، اس لیے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے۔ فرانس اور یونائٹڈ اسٹیٹس اس کو اپنے حق میں بالفعل مضر سمجھتے ہیں، اس لیے وہ اس کو جائز نہیں رکھتے۔ لیکن انصاف شرط ہے، جن حکمتوں اور تدبیروں سے آج کل دنیا کی دولت گھسیٹی جاتی ہے، ان پر بہ خلاف اگلے زمانے کی جابرانہ لوٹ کھسوٹ کے کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مشہور ہے کہ حکیم علوی خاں کے زمانے میں جو کہ محمد شاہ کا معالج اور ایک نہایت حاذق طبیب تھا، ایک عطار بھی اس کے نسخے دیکھتے دیکھتے علاج کرنے لگا تھا۔ لوگوں نے اس کا ذکر علوی خاں کے سامنے بھی کیا اور یہ کہا کہ جس قدر مریض آپ کے علاج سے اچھے ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، اس کے قریب قریب اس کے علاج سے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ علوی خاں نے کہا: ''بلے، لاکن من بقاعدہ می کشم و آں قرم ساق بے قاعدہ می کشد''۔ (حالی)

8 استاد اور شاگرد کی شرح نیچے کے دو شعروں میں کی گئی ہے۔ (حالی)

9 اپنوں سے مراد مغربی آریا یعنی انگریز اور اغیار سے مراد مسلمان ہیں۔ (حالی)

10 سُر دیوتا اور اسر راکشس کو کہتے ہیں۔ مہا بھارت میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک بار دیوتاؤں اور راکشسوں کی لڑائی ہوئی تھی، جس میں دیوتا فتح یاب ہوئے اور راکشس ہارے۔ راکشسوں کو یہ خیال ہوا کہ ہم باوجودے کہ دیوتاؤں سے قوی اور زبردست ہیں، پھر کیوں ان سے مغلوب ہوگئے۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ ان کے پاس علم یعنی منتروں کی طاقت ہے۔ راکشسوں نے ان کے منتر اور کتابیں چرالیں اور ایک راکشس سنکھا سر نام ان سب کو لے کر سمندر میں غائب ہوگیا۔ ایشر نے جو یہ حال دیکھا تو خود مچھلی کا روپ بھر سنکھا سر کو سمندر میں جا کر ہلاک کر دیا اور دیوتاؤں کے سارے منتر اور پستکیں صاف نکال لائے۔ ایشر جی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سمندر میں اور بھی بہت سے رتن یعنی مفید اور نایاب چیزیں ہیں، ان کو نکالنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ میں کچھوا بنتا ہوں۔ میری پیٹھ پر رئی کی جگہ ہمالیہ پربت کو رکھ دینا اور تسمے کی جگہ باسکی (سانپ کا نام ہے) کو ہمالیہ کے گرد

لپیٹ کر اس کے دونوں سرے سر اور اسرا س طرح سے پکڑیں کہ سانپ کے منہ کی طرف سے سروں کے اور دم کی طرف سے اسروں کے ہاتھ میں رہے اور اس طرح سمندر کو بلو ڈالیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ سمندر میں سے چودہ رتن یعنی لچھمی، جواہر، شراب، دھنتر بید، چاند، گئو، گھوڑا، سفید ہاتھی، تیر کمان، امرت اور بس وغیرہ برآمد ہوئے۔ امرت پر سروں اور اسروں کی باہم تکرار ہو گئی۔ انھوں نے کہا ہم لیں، انھوں نے کہا ہم لیں۔ ایشر ایک حسین عورت کا روپ بھر کر ان پر ظاہر ہوئے۔ دیوتا اور راکشس دونوں اس کی صورت پر فریفتہ ہو گئے اور آپس میں یہ بات قرار دی کہ یہ عورت جس کو جو کچھ دے وہ اس کو خوشی سے لے لے۔ چنانچہ اس عورت یعنی ایشر نے ایک لچھمی تو اپنے واسطے رکھ لی اور باقی تمام رتن دونوں فریق پر تقسیم کر دیے۔ امرت سروں کے حصے میں آیا تھا مگر تھوڑا سا تقسیم ہونا باقی تھا کہ ایک راکشس اٹھا کر پی گیا۔ دیوتاؤں میں سے ایک نے اس کا سر اڑا دیا۔ لیکن بس کو کسی نے لینا قبول نہیں کیا۔ شیو یعنی مہادیو جی نے کہا لاؤ اس کو میں کھا جاؤں۔ وہ اس کو کھا تو نہ سکے مگر اپنے کنٹھ یعنی حلق میں رکھ لیا، جس کے سبب سے ان کا گلا نیلا پڑ گیا۔ شاعر اس بند میں قصہ مذکور کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برٹش حکومت کا ہندوستان میں قائم ہونا اس قصے کا مصداق ہے۔ گویا انگریز مثل دیوتاؤں کے ہیں جو اپنے علم کی طاقت سے راکشسوں یعنی ہندوستان کے لٹیروں اور پنڈاروں اور ظالم حکمرانوں پر غالب آئے اور وہ جو انگلستان سے کئی سمندر طے کر کے ہندوستان تک پہنچے، گویا سمندر کا بلونا تھا اور ان کی سلطنت سے زندگی یعنی امن و رفاہ و آزادی اور جان و مال کی حفاظت ہندوستان کو حاصل ہوئی۔ یہ وہ امرت ہے جو سمندر سے برآمد ہوا اور جس زہر سے کہ مہادیو جی کا حلق جل گیا یا نیلا پڑ گیا تھا، اس سے خود انگریزی سلطنت کو مثال دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح حق باطل کے واسطے زہر ہے، اسی طرح یہ سلطنت قدیم سلطنتوں اور ان کی طرز حکومت کے حق میں زہر ہلاہل کا حکم رکھتی ہے۔ اس سے اگلے دیوتاؤں یعنی قدیم بادشاہوں کی حکمرانی کے طریقے اور قاعدے سب محو ہو جائیں گے اور ان کی تائید میں جو غیب سے آوازیں آتی تھیں وہ بند ہو جائیں گی اور جب تک کہ ہندوستان میں صبح صادق علم اور شائستگی کی روشنی نمودار نہ ہو گی، برابر قدیم زمانے کی تاریکیوں کو یہ سلطنت محو کرتی رہے گی۔

11 یہ روس کی طرف اشارہ ہے۔ انگلینڈ کو پودنے اور روس کو دیو سے تشبیہ دی ہے۔ (حالی)

12 یعنی سب کو رائے کی آزادی حاصل ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کے اور خود گورنمنٹ کے خلاف رائے دینے کا مجاز ہے۔ گویا آزادی کی حیثیت سے سب جدا جدا ہیں اور اتفاق کی حیثیت سے سب ایک ہیں۔ (حالی)

13 یہ روس کے ویران اور غیر آباد ملک کی طرف اشارہ ہے۔ (حالی)

14 اس خیال سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک غریب ہندوستانیوں کی جانیں خضراے دمن اور حشرات الارض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ کاش وہ ہندوستان کی آبادی گھٹنے کے لیے یہ امید ظاہر کرتا کہ جس قدر تجارت، سیاحت اور علوم وفنون کی ملک میں ترقی ہوتی جائے گی، اسی قدر یہاں کے باشندے ترک وطن اختیار کرتے جائیں گے اور اسی طرح رفتہ رفتہ ملک کے باشندوں کی تعداد ایک مناسب مقدار پر آ ٹھہرے گی۔ اس بیان میں ایک اور بھی خلل ہے۔ اوپر کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مردم شماری زیادہ ہونے سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی پیداوار ہندوستانیوں کی خوراک کے لیے کافی نہ ہو اور اس سبب سے بہت سے لوگ بھوک سے مرنے لگیں۔ اس اندیشے کو وہ اس طرح رفع کرتا ہے کہ جب قحط سالیوں میں لوگ بھوک سے مرتے رہیں گے تو مردم شماری بڑھنے نہ پائے گی اور ملک کی پیداوار ملک والوں کو کافی ہوگی۔ گویا بھوک سے مرنے کا علاج بھوک ہی سے مرنا بتاتا ہے۔ (حالی)

15 غلبے کا مدار کثرت رعایا پر نہیں ہے بلکہ رعیت کے ذہن میں یہ بات تہہ نشیں ہونی چاہیے کہ ہمارے اور گورنمنٹ کے مقاصد متحد ہیں اور ہم پر ہماری ہی بہبودی کے لیے حکومت کی جاتی ہے۔ جب تک رعیت کو اس بات کا یقین نہ ہو، کیوں کر امید کی جا سکتی ہے کہ وہ سلطنت کی جاں نثار ہوگی؟ (حالی)

16 مرکز کشمیر سے مراد سری نگر ہے۔ (حالی)

17 مولانا حالی نے گرے کی مشہور نظم (Elegy) کے ایک بند کا ترجمہ نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب آنریری سیکریٹری محمڈن کالج علی گڑھ کے برادر معظم کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ اشعار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (مورخہ 2 اپریل 1913) سے جواہرات حالی کے آخری صفحے پر نقل کیے گئے۔ گرے کی نظم کا بند درج ذیل ہے:

Full many a gum of purest ray serene
The dark unfathomed caves of ocean bear
Full many a flower is born to blush unseen
And waste its sweetness on the desert air.

18 شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار اور حالی کا ترجمہ، نقوش کے شمار نمبر 96 میں شائع کرایا۔ ان کا بیان ہے کہ حالی کا یہ ترجمہ 1917 میں انھوں نے مولانا مرحوم کی ایک بیاض سے نقل کیا تھا لیکن اصل عربی اشعار کے بغیر اسے جواہرات حالی میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بعد میں خلیفہ سید محمد حسن، وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی کتاب اعجاز التنزیل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار مل گئے۔ مولانا حالی نے یہ ترجمہ خلیفہ سید محمد حسین، میر منشی ریاست پٹیالہ کی فرمائش سے 30 نومبر 1886 کو بہ مقام لاہور کیا تھا۔ (نقوش نمبر 96، سالنامہ جنوری 1963ع ص 29-28)

''حالی کی نظمیں'' کے مرتب سید تقی عابدی نے مولانا حالی کی تخلیقات کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی حالی کی شخصیت کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی بھی کوشش کی ہے نیز ان کے ادبی سفر کے آغاز اور نشیب وفراز پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ حالی اردو کے وہ قادرالکلام شاعر ہیں جنھوں نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن شہرت ان کو نظم گوئی سے ملی۔ ان کی قومی نظموں نے دنیائے سخن میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ سادگی اور حقیقت نگاری نیز فنکارانہ مہارت کا جتنا حسین امتزاج ان کے یہاں ملتا ہے، وہ اردو شاعری میں کم ملتا ہے۔ ان کے تمام تر کلام کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ان کی شاعری کا ایک اہم مقصد بچوں اور نئی نسل کے نوجوان میں تعلیم وتربیت کا شوق، محنت اور کوشش کی عادت، اخلاق وکردارسازی کے ساتھ ساتھ وقت کی قدر اور ہمت واستقلال کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ بہرحال امید کی جانی چاہیے کہ یہ کتاب اساتذہ اور طلبا کے علم میں اضافے کا سبب بنے گی۔

اردو تحقیق وتنقید میں سید تقی عابدی کا نام بہت معروف ہے، تقی عابدی کناڈا کے شہری ہو گئے ہیں لیکن ان کے اندر کی ہندوستانیت ان کی تحریروں سے عیاں ہوتی ہے۔ اردو تہذیب وثقافت کے تحفظ اور فروغ میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ کلاسیکی ادبیات کی جانب ان کا خاص رجحان ہے۔ غالب، اقبال، فیض، انیس، حالی، دبیر اور داغ پر ان کی اہم تحقیقی کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں جن کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ تقی وہ نہ صرف تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے ہیں بلکہ دنیا بھر کی ادبی وعلمی سرگرمیوں میں محفلوں کی رونق بھی بنتے رہتے ہیں۔

ISBN: 978-93-91511-01-2
9 789391 511012
NCPUL
New Delhi
₹ 160/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

6:05 PM